لابوہیم

انور عظیم

لا بوہیم

انور عظیم

یہ کتاب دہلی اردو اکیڈمی، حکومت دہلی کے
جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی

لا بوہیم

(افسانے)

انور عظیم

زیر اہتمام

تخلیق کار پبلشرز

104/B۔یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

نام کتاب : لا بوہیم (افسانے)
مصنف وناشر : انور عظیم
پتہ : A-104، پیراڈائز سوسائٹی، اندر پرستھ ایکسٹینشن، پٹ پڑ گنج، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲
تعداد : چار سو

زیر اہتمام : انیس امروہوی
○ تخلیق کار پبلشرز
104/B- یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲
سرورق : نسیم امروہوی
کمپوزنگ : لیزر پوائنٹ، 1710۔ پٹودی ہاؤس، دریاگنج، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲
مطبع : بلس آفسیٹ پرنٹنگ ورکس، ترا ہا بہرام خاں، دریاگنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے

○ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲
○ اہلووالیہ بکڈپو، ۲۸۹۸/۴۵۔ نیو روہتک روڈ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۵
○ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
○ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

T.P.:101
ISBN-81-87231-27-0
LABOUHEME *(Short Stories)*
2000
BY ANWER AZEEM
Rs. 120.00
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
104/B-YAWAR MANZIL ,I-BLOCK,LAXMI NAGAR,DELHI-110092

اپنی ہمسفر کے نام

جو نہ جانے زمانے کے
کن ساحلوں سے آئیں
اور مجھے لے کر زندگی کے
تازہ افق کی طرف بڑھتی رہیں
ساتھ ساتھ!

○○

پتھر کا سیاہ بت

۱

وہ ایک سیاہ سائے کی طرح سامنے سے گزر گیا۔

بائیں ہاتھ پر نہر کے مزدور جمنا کی بھپری ہوئی تندرو موجوں کو قابو میں رکھنے کے لیے بندھ کے پٹ کھول رہے تھے۔ مشین کا پہیہ گھومتا تو زنجیریں اس طرح چھنکتیں جیسے سیکڑوں قیدی، سپاہیوں کے کوڑے کھا کھا کر، پیر گھسیٹتے ہوئے جلاوطنی کی سزا بھگتنے کے لیے دل برداشتہ اپنے ملک کی سرحد سے باہر جا رہے ہوں۔ دیکھتے دیکھتے بند کے ایک درجن سیاہ پٹ اوپر اٹھ گئے اور پانی جھاگ اگلتا ہوا اور زور زور سے چیختا ہوا دریا میں گرنے لگا۔ پانی نکیلی چٹانوں سے ٹکرا کر کھولتے ہوئے دودھ کی طرح نظر آ رہا تھا۔ سر پٹکتے ہوئے، پاش پاش ہوتے ہوئے پانی کی گنگناہٹ میں مشین کی زنجیروں کی جھنکار گھل کر شام کے سناٹے میں ایک طرح کا اضطراب پیدا کر رہی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سر پر سے خوفزدہ کبوتروں کے جھنڈ کے جھنڈ پر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑے چلے جا رہے ہیں...... شائیں شائیں شائیں!

وہ دوبارہ ایک پراسرار سائے کی طرح سامنے سے گزر گیا۔ لیکن تھوڑی دور جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ میں نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں نے اپنی خاکی قمیض کی اوپر والی جیب سے بجھی ہوئی آدھی سگریٹ نکالی، کسی کو ڈھونڈنے لگا جس سے ماچس مانگ کر اپنی سگریٹ جلا سکوں۔ شام کا دھند لکا گہرا ہو گیا تھا اور برگد کے پاس وہ پراسرار آدمی اسی طرح کھڑا دور دریا کے بہاؤ کے خلاف چڑھتے ہوئے موٹر بوٹ کو

دیکھ رہا تھا جس میں بیٹھے ہوئے نہر کی رکھوالی کرنے والے لوگ سگریٹ کے بکھرتے ہوئے مرغولوں کی طرح دھندلے ہوتے جا رہے تھے، مٹتے جا رہے تھے۔

نہر کے کنارے بچھی ہوئی سیندور کے رنگ کی بجری پر تفریح کرنے والے مرد، عورتیں، بچے آجا رہے تھے۔ بھیڑ گھٹتی جا رہی تھی۔ دن کا شور، ہنگامہ، چیخ پکار و قہقہے، جملہ بازیاں سب سرد ہوتی جا رہی تھیں، حالانکہ گرمی میں امس پیدا ہو گیا تھا اور بدن پسینے سے چپچپا رہا تھا۔

میں اس سیاہ بت کے پاس گیا۔ کتنا لانبا تھا وہ۔ برقعے کی طرح سیاہ لانبے بال دونوں طرف جھکے ہوئے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ باندھ لئے اور اسی طرح موٹر بوٹ کو دیکھتا رہا۔ جیسے جیسے شام کا رنگ گہرا ہوتا جا رہا تھا اس کے خدوخال میں پتھر کی سختی اور بے حسی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس وقت مجھے اس کی آنکھیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اور اب تو اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

میں نے کہنا چاہا...... لیکن آواز حلق میں چبھ کر رہ گئی۔

میں نے دوبارہ کوشش کی اور مجھے خود اپنی آواز غیر ضروری طور پر بلند معلوم ہوئی۔

''ماچس ہے آپ کے پاس؟''

پتھر کا سیاہ بت خاموش رہا۔ کیا وہ واقعی پتھر کا سیاہ بت تھا؟

''ماچس ہے آپ کے پاس؟''

بت کی گرجدار آواز پتھر کی طرح چٹیلی تھی۔ اس نے انگریزی میں کہا۔

''میں ماچس کی دوکان نہیں ہوں۔''

''یہ مجھے معلوم ہے۔''

''تو پھر اپنا راستہ لو۔'' اس نے پھر انگریزی میں کہا۔

''یہ کہنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔'' اس کے دونوں ہاتھ گر گئے۔

میں نے دل میں کہا عجب کندۂ ناتراش ہے، میں اتنی لجاجت اور خلوص سے ماچس

کی ڈبیہ مانگ رہا ہوں اور یہ خبیث ہے کہ مجھ پر انگریزی جھاڑے چلا جا رہا ہے۔ بڑا جارج پنجم کی اولاد بنا پھرتا ہے۔ ہاں!

میں پھر اسی طرح واپس اسی پتھر کے ٹکڑے پر بیٹھ گیا جو ندی کے کنارے رکھا ہوا تھا۔ پانی کی دو تین بوندیں میرے ہاتھ اور ناک پر گریں۔ تفریح کرنے والوں کا ہجوم بھاگنے لگا۔ بادل گرج رہے تھے۔ جب بجلی چمکتی تھی تو رات کے اندھیرے میں ندی کے گرتے ہوئے پانی میں شعلوں کی تلواریں تڑپ تڑپ اٹھتی تھیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ آدمی اسی طرح کھڑا تھا۔ درختوں کے پتوں پر تیز ہوتی ہوئی بوندیں بج رہی تھیں۔ بارش شروع ہو گئی۔ دور سے نہر کے مزدوروں کے ایک دردناک گیت کی الاپ سنائی دی۔ میں بھیگنے لگا تھا۔ لیکن اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ میں نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ بجلی چمکی تو مجھے پتھر کا بت اسی طرح ہاتھ باندھے کھڑا نظر آیا اور اس کے سر پر درخت کے پانی میں نہائے پتے چھوٹے چھوٹے سنہرے آئینوں کی طرح چمک اٹھے۔

میری انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ بھیگ کر آٹا بن چکی تھی۔ میں وہاں سے اٹھا اور بجری پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ خود اپنی چپل کی آواز مجھے اس وقت بڑی عجیب اور تکلیف دہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس وقت مجھے سناٹے میں ایک خاص کشش محسوس ہو رہی تھی۔ نہر میں کبھی کبھی مچھلیوں کے اچھلنے کی آواز پیدا ہو جاتی۔ آہستہ آہستہ بارش موسلادھار ہونے لگی تھی۔ میرے کپڑے جسم سے چپک گئے تھے اور اب اس کی بجائے کنپٹیوں کے ارد گرد خنکی سی محسوس ہو رہی تھی۔

مجھے اس شخص پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے میری آدھی سگریٹ مفت میں ماری گئی تھی۔ جب میں نہر کا پل پار کر کے ویران راستوں سے گزرنے لگا تو حلوائی کے گول مٹول کالے کتے نے اپنے دونوں کان پھڑ پھڑا کر اور اپنا منہ چیر کر مجھے دیکھا اور پھر درخت کے تنے کے پاس بیٹھ گیا۔ چند قدم آگے بڑھا تھا کہ کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اس کی آواز میں وحشیانہ چیخ تھی جو کسی شکار پر حملہ کرنے سے پہلے سنائی دیتی

ہے۔ میں ڈر گیا۔ اور ببول کے جنگل کے پاس پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ کوئی بھاگتا چلا آرہا تھا۔ وہ آدمی آکر میرے پاس گر گیا۔ اور زور زور سے سانس لینے لگا۔ کتا بھی وہاں آکر رک گیا اور زمین کو سونگھنے لگا۔ میں نے کتے کو بھگایا اور اس گرے ہوئے آدمی کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ پورے زوروں سے برستے ہوئے پانی میں جب وہ آدمی دوبارہ کھڑا ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ پتھر کا بت پھر میرے سامنے اپنی پوری لحیم شحیم جسامت کے ساتھ کھڑا تھا۔

''تم کہاں جاؤ گے؟'' میں نے حیرانی اور خوف کے ساتھ پوچھا۔

''میں نہیں جانتا'' پھر وہی اینٹھی ہوئی انگریزی زبان سنائی دی جس میں ''ٹ'' کا تلفظ اس طرح ہوا تھا جیسے بہت سے پتھر مٹکے میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں۔

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں نہیں جانتا!''

میں تھوڑی دیر تک کھڑا کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا۔ میں الجھتا ہوا واپس مڑا اور ببول کے جھنڈ کے بیچ سے گزرتی ہوئی پگڈنڈی پر پیر جما کر چلنے لگا۔ ہر قدم پھسل کر گرنے کا ڈر تھا۔ پکی سڑک پر پہنچ کر کچھ اطمینان ہوا۔ پانی کا سلسلہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ آشرم کے پاس ڈھلان پر اتر کر جب میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو رکا یک.جی چاہا کہ ذرا پلٹ کر دیکھ لوں۔ کہیں وہ شخص میرا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ وہ میرے ذہن میں چپکا ہوا تھا اور اس کی قربت کے احساس سے ہی دل کانپ اٹھتا تھا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ اور میں لپکتا ہوا اپنے کمرے کے پاس پہنچ گیا۔ دروازہ کھول کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بھیگے ہوئے کپڑے اتارے اور پلنگ کے پاس گرے ہوئے ایک پاجامے کو پہن کر اپنی تین ٹانگوں والی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس چارپائی کو چوتھی ٹانگ کی کمی آشرم کے پنڈت.جی کی اینٹیں چرا کر پوری کی گئی تھی۔ اور اس طرح میری قبر کا توازن کافی آرام دہ ہو گیا تھا۔ اس وقت بیتے ہوئے اتوار کی پوری تھکن امڈ آئی تھی۔ آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں کہیں کوئی ساتھی نہیں تھا۔ ہر

طرف ایک گھٹتی ہوئی تنہائی تھی۔ ایک بے پناہ سناٹا۔ اس وقت میں اپنے سینے کے بالوں سے کھیلتا ہوا ایک کیف انگیز گدگدی سی محسوس کر رہا تھا۔

دور آشرم کے پاس والے ڈھلان پر آشرم کے کتے بھونکنے کی آواز گونج اٹھی۔ اور کسی کے تیز تیز دوڑنے کی چاپ سنائی دی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے پاس اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو کر اندھیرے میں گھورنے لگا۔ بجلی کی چمک میں ایک آدمی بھاگتا ہوا نظر آیا۔ کتے کی بھونک پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ آدمی کنوئیں کے پاس آکر رک گیا۔ جہاں رات کی رانی کی کیاریاں تھیں۔ دور آشرم کی کھڑکیوں میں جلتی ہوئی بجلی کی روشنی بجھ گئی۔ اور ہر طرف گہرا بھیگا ہوا اندھیرا چھا گیا۔ اب پانی رک گیا تھا۔ لیکن چھپروں اور چھتوں سے پانی کے قطرے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔

میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی بھوت میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پھر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ بھوت میرے کمرے میں آگیا ہے۔ اور آہستہ آہستہ میری گردن کو اپنی کھردری سیاہ کٹیلی انگلیوں سے سہلا رہا ہے۔ اور ساتھ ہی اپنی گرفت بھی تنگ اور سخت کرتا جارہا ہے۔ میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں باہر نکل آیا۔ اندھیرا، سناٹا، خاموشی ...... برسے ہوئے پانی کی آنسوؤں کی طرح سبک سرسراہٹ۔ میں اندھیرے میں اس طرف بڑھنے لگا۔ جہاں پر پچھلی بار ایک آدمی کو بھاگ کر پناہ لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں اس وقت صرف پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ سینے پر نم ہوا کی خنکی کے باوجود ایک آگ سی لہراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور حلق میں خشکی بڑھتی جارہی تھی۔ جب میں گولر کے پیڑ کے پاس پہنچا تو بادل کی گرج کے ساتھ بجلی زور سے چمکی اور ایک سیاہ انسانی ہیولا اپنے سر کو دونوں ہاتھ سے تھامے ہوئے سر جھکائے گیلی زمین پر بیٹھا نظر آیا۔

میں نے کھانستے ہوئے اور حلق صاف کرتے ہوئے ذرا دور ہی سے کہا۔ ”تم کون ہو؟“

”آدمی۔“ وہی انگریزی زبان، اس کا وہی لٹھ مار لہجہ۔ وہی بے نیازی اور وہی آدم

ازار خشونت...... میں ڈر گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اندھیرے میں آسمانی خلا سے کوئی مجھے ڈانٹ رہا ہے۔ اور آنے والے خطرے سے ڈرا اور دھمکا رہا ہے۔

"تم گھر کیوں نہیں جاتے؟"

"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔"

"تو تم رہتے کہاں ہو؟"

"سفر میں"

"سفر میں؟"

"ہاں میں ہمیشہ چلتا رہتا ہوں۔ بھاگتا رہتا ہوں۔"

"کس چیز سے بھاگتے رہتے ہو تم؟"

"ہر چیز سے، اپنے آپ سے، زندگی سے، ......اور زندگی میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔"

میں چپ ہو گیا۔ وہ بھی چپ ہو گیا۔ دور سے ایک بار کتے کی رونے کی دردناک آواز آئی اور فضا خباثت سے بھر گئی۔ کیسا آدمی تھا یہ؟ جاتا بھی نہیں تھا اور سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا تھا۔ کوئی آوارہ تھا، کوئی وحشی تھا۔ اور کون جانے یہ اٹھائی گیرہ محض دکھانے کو بن رہا ہو اور اِصل میں چور ہو۔ چور کیا بلکہ ڈاکو ہو۔ ان دنوں چور ڈاکوؤں کا کیا قحط تھا۔ چور اور ڈاکو چاول اور گیہوں تو تھے نہیں جو بلیک مارکیٹ کے لیے چھپا کر رکھ لیے جاتے۔ میں نے اپنے آپ کو دلدل میں پھنستا ہوا محسوس کیا۔ میں جتنا وہاں سے بھاگ آنے کی کوشش کرتا اتنا ہی پیر تناور درخت کی طرح جڑ پکڑتے جاتے۔

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔" میں نے جی کڑا کر کے کہا۔

"کہاں چلا جاؤں۔"

میں پھر لاجواب ہو گیا۔ اور اس نے اب کے ایک ٹھنڈی سانس زور سے لی۔ اس کی سانسوں کے زیر و بم سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ کھڑا ہو گیا ہے۔ وہ مجھ سے بہت قریب آگیا تھا۔ اس کے نتھنوں کے زور زور سے سانس لینے کی آواز اب میرے سر

سے زیادہ بلندی سے آرہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن ایک رقیق خوفناک اندھیرے کے سوااور کچھ نظر نہ آیا۔ میں وہاں سے بھاگا۔ اور کمرے میں آکر اپنی چارپائی پر گر گیا۔ اینٹیں کھسک گئیں اور میری چارپائی پانی سے بھری ہوئی شکستہ کشتی کی طرح پائنتی کی بائیں طرف جھک گئی۔ ابھی میری سانسیں قابو میں نہیں آئی تھیں کہ مجھے اپنے کمرے کی دہلیز پر آہٹ سنائی دی۔ میں دم بخود رہ گیا۔ میں نے آنکھیں کس کر بند کرلیں اور خنجر کا انتظار کرنے لگا جو دوسرے لمحہ میرے سینے میں پیوست ہونے والا تھا۔ دس منٹ سے زیادہ ہی بیت گئے ہوں گے (اس وقت تو دس منٹ دس گھنٹے کے برابر محسوس ہوئے تھے) لیکن نہ کوئی خنجر سینے میں پیوست ہوا اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دی۔

میں دیر تک جاگتا رہا...... تھوڑی دیر کے بعد ہوا بند ہو گئی اور گرمی کا امس بڑھنے لگا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ دور سے کسی کے خراٹے لینے کی آواز آرہی ہے لیکن چند لمحوں کے بعد میری غلط فہمی دور ہو گئی۔ خراٹے کی آواز میرے کمرے ہی سے آرہی تھی۔ بالکل میری چارپائی کے پاس ہی زمین سے۔ میں پھر سہم گیا۔ لیکن چپ چاپ پڑے رہنے میں جان کا خطرہ تھا۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ خراٹا بند ہو گیا۔ اور کروٹ بدلتے ہوئے پتھر کی طرح سخت جسم سے وہی خوفناک آواز آئی۔

''مجھے چھیڑو مت۔ مجھے سونے دو۔ میں کئی رات سے نہیں سویا ہوں۔''

اس کی آواز میں پہلی بار مجھے ایک بھیانک مظلومیت، گھٹن، اور پسپائی کا احساس ہوا۔ جیسے دور کسی پہاڑی کے دامن سے فلیتے کے دھماکوں میں چٹانوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی آواز آرہی ہو۔ مجھے اس کی اس مظلومیت اور لجاجت سے بڑی تسکین ہوئی۔ ایک مرتا ہوا آدمی دوسرے مرتے ہوئے آدمی کی آواز میں اپنے دل کی آواز سنتا ہے۔ میں اپنی چارپائی میں گرتے ہی سو گیا۔

صبح اٹھا تو سورج کی زردی مائل روشنی کمرے میں بھری ہوئی تھی اور زمین پر ننگے بدن، صرف خاکی پتلون پہنے ہوئے ایک سیاہ چٹان سے تراشا ہوا، انتہائی تلخ رو لمبا تڑنگا

انسان سویا ہوا تھا۔ میں اس وقت اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا سر بھیگی ہوئی گٹھری کی طرح لپٹی ہوئی اس کی قمیص پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی خاکی پتلون اب تک بھیگی ہوئی تھی اور زمین کی دھول اس میں لپٹ گئی تھی۔ اس کی کروٹوں سے زمین پر ایک لمبا سا حلقہ بن گیا تھا۔ اور جھاڑو سے محروم زمین صاف ہو گئی تھی اور اس کی پکی سیمنٹ سے بنی ہوئی ہلکے سرمئی رنگ کی جلد نظر آنے لگی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بالکل سلیٹ کا سا تھا۔ اس کی ناک میں ذرا نا تیکھا پن تھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ اور گھنی لمبی پلکوں کے درمیان آنکھوں کے سفیدی جمی ہوئی ٹھنڈی چربی کی طرح نمایاں تھی۔ ناک اور آنکھوں کے سنگم کے دونوں طرف درانتی کی طرح مڑے ہوئے نشان تھے۔ جور خسار کی ہڈیوں تک پہنچ کر معدوم ہو گئے تھے۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اور میلے دانت اور سیاہ مسوڑھے نظر آرہے تھے۔ اس کے ہونٹ چکنے، بھرے بھرے اور لوہے کی نعل کی طرح سیاہ تھے۔

مجھے اس کے وجود سے کوفت ضرور ہو رہی تھی۔ لیکن اسے دوبارہ جگانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ بے خبر اسی طرح پڑا رہا اور اس کا سینہ سانس سے ابھرتا اور ڈوبتا رہا اور بالوں میں گرد چمکتی رہی۔

میں ہوٹل سے چائے پی کر آیا۔ جب بھی وہ سویا ہوا تھا۔ پھر دھوبی کے یہاں اپنے کپڑوں کے تقاضے کے لیے گیا۔ واپس آیا تو اس نے ابھی کروٹ بھی نہیں بدلی تھی۔ میرے دفتر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے جی کڑا کر کے اسے جگانے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔ لیکن اس نے خونخوار بھیڑیے کی طرح اپنی سفید چربی سے بھری ہوئی نشیلی سرد آنکھوں سے اس طرح گھور کر دیکھا کہ میرا سر چکرا گیا۔ اور میں اسے اسی طرح سوتا ہوا چھوڑ کر دفتر چلا گیا۔ میں گلیوں سے گزر رہا تھا۔ سامنے سے وہ سانڈ چلا آرہا تھا۔ جس کو دیکھتے ہی میری گھگھی بندھ جاتی تھی۔ لیکن اس وقت میں بے پروا اس کے پاس سے ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گیا۔ اس سے بڑا خطرہ تو میں اپنے کمرے چھوڑ آیا تھا۔ کمرہ چھوڑتے وقت میرے اندر رحم کا جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔

مگر میں سوچ رہا تھا کہیں وہ چور اچکا ہوا تو میرا سب کچھ لوٹ لے جائے گا۔ میری ایک دری۔ کپڑے کی کترنوں سے بھرا ہوا تکیہ۔ ٹوٹا ہوا ٹائپ رائٹر، ایک جوڑا کریپ سول جوتا، کشمیر کی چند تصویریں جو آج تک فریم نہ ہو سکی تھیں۔ مجھے ان تصویروں سے بڑی محبت تھی۔ میں ان میں اپنے وطن کا سارا جمال، سارا رومان، ساری مظلومیت، ساری برہنگی اور گرسنگی دیکھا کرتا تھا۔ اگر وہ یہ سب کچھ لے کر چلا گیا تو کیا ہوگا۔ اس خیال سے مجھے بڑی وحشت ہونے لگی۔ اس دن دفتر میں بندھے ٹکے تجارتی رٹے ہوئے خطوط ٹائپ کرنے میں بھی میں نے بہت سی غلطیاں کیں۔ میں پریس کے ہنگامے اور پریس کے مالک کی ڈانٹ، چیخ اور فائل کے پٹکنے کا منظر روز ہی دیکھا کرتا تھا۔ لیکن اس دن تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ہر چیخ میں اس پراسرار شخص کی چیخ شامل ہو جاتی تھی جسے بھیگی ہوئی رات کے اندھیرے میں کتے دوڑا رہے تھے۔

اور دن میں زینے سے اترتے وقت چپراسی سے چھیڑ خوانی ضرور کرتا تھا۔ "کہو پہلوان آج کتنی بھنگ گھٹی ہے۔ کیا بات ہے میرے راجہ گلے میں آج باسی پھولوں کا گجرا بھی نہیں۔" وہ ابھری ہوئی رگوں والی موٹی گردن پر ہاتھ پھیرتا اور کہتا۔ "کشمیری بابو کیوں جان جلاتے ہو نشہ ایک دن کا غلامی سو دن کی۔ اب وہ بات کہاں۔ سالی زندگی کی ایسی تیسی۔"

لیکن اس دن تو واقعی زندگی کی ایسی تیسی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے چھیڑا ہی نہیں اور جب زینے پر سے تین چار بار اتر کر اور پریس کے مالک کی ڈانٹ سن سن کر واپس ہوا اور میں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تو پہلوان نے بڑے رازدارانہ میں میرے قریب آکر میرا بازو پکڑ کر کہا "کشمیری بابو کسی لونڈیا سے آنکھ لڑ گئی ہے کیا...... بھیا میں تو اڑتی چڑیا کی اڑان دیکھ کر بتا دوں، کون سی چڑیا ہے یہ ظالم...... ایں؟ بتاؤ...... نکالوں تعویذ۔ آج گلے میں ڈالو اور کل لونڈیا گلے میں گجرا بنی پڑی ہے......"

میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں اس کے مذاق سے چڑ گیا۔ اور یہ چڑچڑاہٹ شام تک قائم رہی۔ یہاں تک کہ میں لپکتا ہوا اپنے کمرے میں جا پہنچا۔ کمرے کے کواڑ

کھلے ہوئے تھے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی ترچھی روشنی کشمیر کی اس تصویر پر پڑ رہی تھی۔ جو کونے کے پاس دو دوانچ کی نیم پیوست کیلوں سے آویزاں کی گئی تھی۔

پتھر کا بت اب میری چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو وہ چونک کر بیٹھ گیا۔ اس کی پلکیں نقاہت سے کانپ رہی تھیں۔ ہونٹ بھینچے ہوئے تھے جن کو وہ آہستہ آہستہ چوس رہا تھا۔ وہ پریشان ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے چہرے کی سیاہی میں کسی جذبے کا عکس نہیں تھا...... نہ کوئی بے قراری، نہ تنفر، نہ ندامت۔ ہم ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

''تم گئے کیوں نہیں؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گیا۔

''کیا تم اب نہیں جاؤ گے؟''

''نہیں، چلا جاؤں گا۔''

تھوڑی دیر ہم پھر اسی طرح بیٹھے رہے۔ میں دروازے سے باہر آشرم کی سپید کھدر پوش لڑکیوں کو ایک دوسرے کے کہنی مارتے اور چٹکی بھرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ اس وحشی سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

''تم اب کہاں جاؤ گے؟''

''تم مجھ سے فضول سوال کیوں کرتے ہو۔ میں اس کا کیا جواب دے سکتا ہوں۔''

شام ہوتی جا رہی تھی۔ کمرے میں ناچتی ہوئی سورج کی شعاعوں کا رنگ نارنجی ہو گیا تھا۔ اور ان کے اندر ایک مضمحل سی تھکن پیدا ہو گئی تھی۔

''میں ٹہلنے جا رہا ہوں۔'' میں نے اس سے قطع تعلق کرنے کے انداز میں کہا۔

''میں بھی ٹہلنے کے لیے جاؤں گا۔ لیکن ٹہلنے کے لیے جانا کیا ضروری ہے۔''

''میں روز نہر تک ٹہلتا ہوں!''

''کیوں؟ نہر میں کیا سرخاب کے پر ہیں؟''

میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس کی قمیض کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور خاکی پتلون

سوکھ چکی تھی۔ اب اس کی آنکھوں کی سفیدی انڈے کی زردی کی طرح چمکنے لگی تھی۔
میں اسے کیسے بتا سکتا تھا کہ مجھے پانی سے بہت لگاؤ ہے۔ میں کشمیر کی سانس لیتی ہوئی جھیلوں کی آغوش میں پلا ہوں۔ میں گھنٹوں اکیلا نہر کے پاس بیٹھ کر اُن جھیلوں کے بارے میں، شالی کے کھیتوں اور سربلند چناروں کے بارے میں سوچا کرتا ہوں جن پر سے جب چاندنی سرکتی تھی تو معلوم ہوتا تھا وجدانی رقص کے بعد تھکی ہوئی کسی پہاڑی دوشیزہ کے سینے پر سے آنچل سرک رہا ہے۔ اس وقت آنچل زور زور سے قہقہہ لگاتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو چھونے کے لیے لپکتے تھے۔ میں اس پتھر کے انسان کو اپنی روح کا یہ نازک راز کس طرح بتا سکتا تھا۔

''تم انگریزی میں کیوں بات کرتے ہو؟'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

''میں تمہاری زبان نہیں جانتا۔ میں مدراس کا رہنے والا ہوں۔''

''میں بھی کشمیر کا رہنے والا ہوں...... پھر؟''

''لیکن میں پہلی بار مدراس سے باہر نکلا ہوں۔''

''کیوں؟''

''اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔''

اس سے پہلے وہ جب انگریزی میں بولتا تھا تو مجھے جارج پنجم کی اولاد نظر آتا تھا، لیکن اب اس کی آواز اپنے اندر ایک خاص کشش لے کر ابھر رہی تھی۔

شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اور فضا آنسوؤں سے بھرے ہوئے پپوٹوں کی طرح بوجھل تھی۔ وہ میرے پاس نہر میں مچھلیوں کو اچھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی جذبے کا پتہ نہ تھا۔

''تم اس شہر میں کتنے دن سے ہو؟''

''کل سے''

''تم ملازمت کیوں نہیں کر لیتے؟''

''میں یہاں ہنی مون منانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔''

پھر میرے اور اس کے درمیان مہیب خاموشی جھینگروں کی طرح چیختی ہوئی رینگنے لگی۔

''تم میرے پریس میں نوکری کرو گے ؟''

''اگر مجھے نوکری ملے تو میں دوزخ کی آگ میں بیٹھ کر روٹی سینک سکتا ہوں۔'' وہ اب تک نہر کو گھور رہا تھا۔ حالانکہ اب مچھلیاں ہوا میں اڑتی ہوئی اور پانی میں غوطہ لگاتی ہوئی نظر نہیں آرہی تھیں۔ بس ایک چھپاکے کی آواز ہی آواز تھی اور ایک ساتھ پانی کی سطح پر جیسے کئی ڈھیلے برس پڑتے تھے۔

اس رات ہم نے ایک ساتھ ہوٹل میں کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں بھی خاموش رہا اور وہ بھی۔ ہر دو تین لقمے کے بعد وہ ایک دو گھونٹ پانی پی لیتا تھا۔ اس کی آنکھیں اس وقت اور باہر کو نکل آتی تھیں۔ اور لالٹین کی ٹمٹماتی ہوئی یرقانی روشنی میں حد درجہ لالچی، بھوکی اور ذلیل نظر آرہی تھیں۔ جلدی میں کبھی کبھی وہ پالک کا ساگ روٹی میں لینا بھول جاتا۔ سوکھی روٹی اس کے حلق میں پھنستی اور اس کی آنکھیں کوڑیوں کی طرح ابھر آتیں۔ کھانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنا بھوکا تھا۔ اس نے میری ادھار خریدی ہوئی سگریٹ پی، پان کھایا۔ اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''روح الامین میرے پیٹ میں ہے۔ اب میں نہر پر بیٹھ کر تمہاری شاعرانہ باتیں سن سکتا ہوں...... مجھے اس بات سے دھچکا سا لگا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ لمبا جملہ بھی بول سکتا تھا۔ اور اس کے بے جان آہنی ہونٹوں سے شاعرانہ جیسا لفظ بھی نکل سکتا تھا۔ لیکن اس نے روٹی کھانے سے پہلے یہی بات کیوں نہیں کہی تھی۔ اس سوال پر میں کافی دیر تک ببولوں کے سائے میں چلتا ہوا سوچتا رہا۔

دوسرے دن میں اسے اپنے ساتھ پریس لے گیا۔ اس کی بدحواسی، آنکھوں کی وحشت اور لباس کی بدحالی سے خطرہ تھا کہ پریس کا مالک جوگندر رائے، اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرے گا، ایک جماہی لے گا اپنے کان کی لوؤں پر اُگے روئیں پر تاؤ دے گا اور کہے گا...... ''یہ پریس ہے۔ یتیم خانہ نہیں ہے۔'' اور سارا معاملہ ٹھپ ہو جائے گا۔ جوگندر

رائے جو رائے صاحب کہلانے میں خاص فخر اور عزت محسوس کرتا تھا۔ پریس کے ملازموں کو بے ضمیر انسان سمجھتا تھا۔ وہ ان کی خودی پر ضرب لگایا کرتا۔ اگر کسی نے ضمیر کی چنگاری کا احساس دلا دیا تو پھر اس کا ٹکٹ پریس سے کٹ جاتا تھا۔ اس معاملے میں وہ بہت چاق و چوبند تھا۔ یہ اصول اس کے بزنس کا اصول تھا۔ اور یہ اصول اس کے خون میں گردش کرتا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کی پیدائش کے بعد اس کی ماں مر گئی اور اس کی پرورش بوتلوں کے دودھ پر ہوئی تھی۔ اس لیے بزنس اور بازاری گُر اس کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔

پہلوان اس کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا۔ میرے کانوں میں کھٹاک سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ میں نے اپنے پاس سے رخصت کرتے ہوئے کنکھیوں سے اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے چہرے پر مردنی بھی نہیں تھی۔ گھبراہٹ بھی نہیں، کوئی چمک نہیں، زندگی کی کوئی رمق نہیں ایک پتھر کی سل، ایک شل جسم، لانبا اکڑا ہوا، دور کہیں دیکھتا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت پھر سفیدی اپنی پوری سرد مہری کے ساتھ ابل آئی تھی۔

پہلوان اسے جوگندر رائے کے کمرے میں چھوڑ کر میرے پاس آیا۔ کہنے لگا۔ ”یہ جانور کون سے جنگل سے پکڑ لائے ہو کشمیری بابو۔“

میں وزیر اعظم کے نام ایک خط ٹائپ کر رہا تھا۔ جس میں پریس کی قومی خدمات کے اعتراف میں چند خوبصورت الفاظ کی درخواست کی گئی تھی۔ ان خوبصورت لوگوں کے خوبصورت الفاظ سے بزنس کی خوبصورتی لہک اٹھتی ہے۔

پہلوان میرے پاس بیٹھ گیا۔ ابھی اس نے بیڑی نکال کر میری طرف بڑھائی ہی تھی کہ جوگندر رائے کے کمرے کی گھنٹی بجی اور وہ بے تحاشا دوڑتا ہوا بھاگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرا مدراسی دوست اندر آیا۔ اس کے ساتھ پہلوان بھی تھا۔ پہلوان بہت گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا: ”دیکھا تم نے ...... یہ کیا مصیبت ہے۔ رائے صاحب نے کہا ہے کہ میری جگہ ٹیلی فون پر یہ کالا صاحب بیٹھے گا......“

پہلوان کی آواز سے حقارت اور نفرت ٹپک رہی تھی۔

میں نے اب نظر اٹھا کر اپنے مدراسی دوست کو دیکھا۔ وہ دیوار پر ٹنگی ہوئی پالم ہوائی اڈے کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ جن میں پنڈت جی اپنی بیٹی اندرا نہرو کے ساتھ کسی امریکی مہمان کو الوادع کہہ رہے تھے۔

''اچھا تو تمہیں ملازمت مل گئی۔''

''ہاں......''

میں نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔ پہلوان خشمگیں اور جھنجھلائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔

''اچھا پہلوان اب بتاؤ تمہارے سپرد کون سا کام ہوا ہے؟''

''یہ تمہارا چقندر رائے بڑا الو کا پٹھا ہے۔ تمہارا دوست نوکر ہو گیا۔ اس سے میں ناراض نہیں ہوں...... مگر...... مگر......''

''مگر کیا پہلوان؟''

''چقندر رائے کہتا ہے......اب تم...... یعنی میں ......ہاں میں باغبانی کی دیکھ بھال کروں......اب تم ہی بتاؤ کیا یہ کام اپنے بس کا ہے؟'' غصے سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

میرے مدراسی دوست نے مجھ سے کچھ نہیں کہا اور جوگندر رائے کے کمرے کے باہر ٹیلی فون کے پاس رکھی ہوئی وارنش سے چمکتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں جب ادھر سے گزرا تو وہ ڈائرکٹری دیکھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ اپنے پیر ہلا رہا تھا۔

اس دن میری اس کی دوستی پختہ ہو گئی۔ یہ ایک ایسی دوستی تھی۔ جس کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ لیکن یگانگت کا جذبہ اسے مجھ سے بہت قریب لے آیا تھا۔ واپسی پر دو میل کا سفر طے کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ''کیا تنخواہ طے پائی؟''

''کچھ نہیں...... کہا ہے کام دیکھ کر تنخواہ طے ہو گی۔''

''ہاں اس چقندر کا یہی قاعدہ ہے۔''

اس وقت چقندر رائے کا کدو کی طرح چمکتا ہوا گنجا سر اور چقندر کی طرح سرخ اور تمتایا ہوا چہرہ میری آنکھوں میں ناچ گیا۔ اس کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح تھی۔ جس پر لگاتار انگلی کے مساج سے سجدے کا نشان بن گیا تھا۔

یہ جوگیندر رائے جسے اس کے منہ پر لوگ رائے صاحب کہتے تھے اور پیٹھ پیچھے چقندر رائے، دراصل بڑا ہی خبیث آدمی تھا۔ اس کا کاروبار کافی پھیلا ہوا تھا۔ خود خوب عیش کرتا تھا۔ اور اپنے پریس کے ملازمین کو دھتکارتا رہتا تھا۔ سرکاری حلقوں میں اس کا رسوخ بہت تھا۔ سرکاری کتابیں اس کے یہاں چھپتی تھیں۔ ان کے علاوہ اس نے امریکی کتابوں کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ دن رات پریس میں کام ہوتا رہتا تھا۔ اور مشین کی گھڑگھڑاہٹ سے دماغ دھمکتا رہتا تھا۔ جب وہ امریکی کتابوں کا ٹھیکہ لے رہا تھا تو سردار موہن سنگھ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس نے کہا۔ ایٹمی جنگ، ڈاکوؤں اور آوارہ عورتوں کی داستانوں کا زہر پھیلانے سے قوم کو نقصان پہنچے گا۔ دونوں کی بحث ہو گئی تھی۔ بحث فائل پٹکنے اور آستین چڑھا لینے کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ دوسرے دن سردار موہن سنگھ کی ملازمت ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ایک جرمن نگراں مقرر ہوا جس نے مجھے تین چار دن کے اندر ہی دس پندرہ بار ڈانٹ پلائی اور کہا: ''ہٹلر کے زمانے میں تمہارے جیسے ناکارہ آدمی کو ہمارے یہاں گولی مار دی جاتی تھی۔'' اس کے بال گھنگھریالے اور سنہرے تھے۔ اس کا قد پست تھا۔ اور کبھی کبھی جب پریس کے ملازمین سے وہ مذاق کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا قد جتنا نظر آتا ہے اس سے بھی زیادہ پست ہے۔ سردار موہن سنگھ سے ہمیں بڑی تقویت تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد ہماری طرف سے کوئی لڑنے والا نہ رہا۔ ہماری زبانیں کٹی ہوئی تھیں۔ اور ہم بیل کی طرح جتے رہتے تھے۔

جوگیندر سنگھ کو خوش رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ دفتر کے اوقات کے بعد بھی اس کے باغ میں اس کے پیچھے ٹہلتے ہوئے، پھولوں کی تعریف کی جائے۔ اس کی بھینس کے یہاں ولادت کے موقع پر اسے مبارکباد دی جائے اور بھینس کے بچے کے سر پر

شفقت سے ہاتھ پھیر کر اس کی درازی عمر اور نظر بد سے بچنے کی دعائیں کی جائیں۔ جب ملاقات ہو سلام کیا جائے۔ اس کے سامنے کرسی پر نہ بیٹھا جائے۔ اور اگر وہ ڈرائیور کو آواز دے تو ہم میں سے ہر شخص "ڈرائیور، ڈرائیور" کا نعرہ لگانا شروع کردے۔ ہم میں سے چند ایسے تھے۔ جن سے ضمیر فروشی نہ ہوتی تھی۔ اس لیے وہ مردود تھے۔ میں بھی نیم مردود تھا۔ میں ڈانٹ سن لیتا تھا۔ لیکن چار بجتے ہی دفتر سے چل دیتا تھا۔ میں جوگیندر رائے کو رائے صاحب، رائے صاحب پکارتا ہوا شطرنج کے پیادے کی طرح نہیں چلتا تھا۔ اور نہ پھولوں کی تعریفیں ہی کرتا تھا۔ اس کے باغ میں اکثر پھول بدیسی تھے۔ اور ان میں سے پیشاب کی سی زہریلی بو نکلتی تھی۔

اس دن راستے میں چلتے ہوئے اپنے کمرے پر پہنچنے سے پہلے پہلے دھڑا دھڑ یہ ساری باتیں میں نے اسے سنا دیں۔ وہ ایک سرے سے خاموش رہا۔ البتہ ایک فرق پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اب اپنے سیاہ چمکتے ہوئے ہونٹ چبا رہا تھا۔ کبھی اوپر کا لب اور کبھی نیچے کا۔

کمرے پر پہنچ کر ہم نے ابھی کمر بھی سیدھی نہیں کی تھی کہ بادل گھر آئے اور آسمان کا رنگ بے ڈھب دکھائی دینے لگا۔

"اب ہوٹل کیسے چلیں گے۔ چائے کے بغیر آنتیں چیخ رہی ہیں۔"

"بھیگتے ہوئے چلیں گے۔"

مجھے اس سے پہلی ملاقات یاد آگئی۔ میں ہنسا۔ "ہاں یار بھیگتے ہوئے چلیں گے۔"

"اچھا یہ بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے کچھ اگڑم بگڑم قسم کا نام بتایا۔ اور وہ میری زبان پر کوشش کے باوجود نہ چڑھ سکا۔ "دوست میں تمہیں مدراسی کہوں گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے میں تمہیں کشمیری کہوں گا۔"

"ضرور ضرور...... مجھے پہلوان بھی یہی کہتا ہے۔

"دیکھو دوست اب تو تم یہیں رہو گے میرے کمرے میں۔ لیکن بتاؤ تم سوؤ گے کہاں؟ چارپائی بس یہی ایک ہے۔"

"میں زمین پر سوؤں گا مجھے گرد و غبار کی بو بہت پسند ہے۔ بڑی گہری نیند آتی ہے۔ خواب دیکھنے کا بھی شوق نہیں رہتا۔"

"تمہارا اور کوئی سامان نہیں۔"

اس کی آنکھوں میں غصے اور نفرت کی آگ دہک اٹھی۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ جیسے مجھے کچا کھا جائے گا۔ میں پھر سہم گیا۔

"دیکھو پانی برسنے لگا ہے۔ اب ہمیں چائے نہیں ملے گی۔ ہوٹل دور ہے۔ کپڑے بھیگ جائیں گے۔ اور دوسرے کپڑے بھی نہیں ہیں۔"

وہ چپ بیٹھا رہا اور اپنی آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتا رہا اور اپنے ہونٹ چوستا رہا۔

وہ شام یونہی گئی۔ ہم نہر کی طرف نہیں جا سکے۔ موم بتی کی روشنی میں اس کا چہرہ مبہم سا دکھائی دے رہا تھا۔ باہر سے پانی برسنے کا اور ہوا کا شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ میرے ٹوٹے ہوئے ٹائپ رائٹر پر اپنی کہنی رکھے ہوئے بت بنا بیٹھا تھا۔ اسے دوبارہ چھیڑنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔ ہم کپڑے بھیگنے کے ڈر سے بیٹھے رہے اور کھانا کھانے کے لیے ہوٹل بھی نہ گئے۔ یہاں تک کہ رات بہت آگے نکل گئی۔ موم بتی جل کر پگھل گئی اور جمتی ہوئی موم بتی کی سفید دلدل میں پھنسا ہوا ایک چھوٹا سا آگ کا پتنگا بار بار ہوا میں اڑنے کی کوشش کر کے سو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی میں بھی سو گیا۔ مدراسی جاگتا رہا یا سو گیا۔ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں جب صبح کے وقت میری آنکھ کھلی تو وہ بیٹھا ہوا اپنی کہنیوں میں سر چھپا کر آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔

"کیوں دفتر نہیں چلو گے؟" وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور ہونٹ سوجے ہوئے لٹک گئے تھے۔ اور دیکھنے میں بہت بد نما معلوم ہوتے تھے۔

رفتہ رفتہ ہم بہت گہرے دوست ہو گئے۔ لیکن اس دوستی کی گہرائی خاموشی سے ناپی جا سکتی تھی۔ جو میرے اور اس کے درمیان ایک برقی تار کی طرح تنی رہتی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے بہت کم بات کرتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ میں تو اسے کبھی مسکرا کر اپنی طرف مخاطب بھی کر لیتا تھا لیکن اس کی

آنکھوں کے پتھر بری طرح پسپا کر دیتے اور میں اپنی پوری کوشش کے باوجود یہ بھی نہ پوچھ پاتا تھا کہ اس کا گھر بھی ہے یا نہیں۔ گھر میں اس کے کون کون لوگ ہیں۔ ماں ہے؟ باپ ہے؟ بہنیں؟ بیوی اور بچے؟ اگر میں پوچھتا تو اس کا جواب بھی نہ ملتا۔ وہ کسی ذاتی بات کا جواب ہی نہ دیتا اور دیتا بھی تو سیدھا نہ دیتا۔ اس کا جواب ہمیشہ ایک چیلنج، ایک خفگی، ایک جھلاہٹ بن کر ابھرتا۔

دو مہینے بیت گئے۔ اس بیچ میں پریس کے لوگوں سے اس کی بے تکلفی نہ ہو سکی۔ وہ جتنا اجنبی پہلے دن تھا۔ اتنا ہی دو ماہ کے بعد بھی تھا۔ اُسے پہلے مہینے کے ختم ہونے پر اسی روپے تنخواہ میں ملے تھے۔ اس نے خاموشی سے روپے جیب میں رکھ لیے تھے۔ جب میں اپنے گھر والوں کو منی آرڈر بھیجنے کے لیے ڈاک خانے آیا تو وہ بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم بھی گھر منی آرڈر بھیجو گے؟"

اس نے صرف نفی میں سر ہلا دیا۔ اپنی جیب سے روپے نکالے، گنے اور پھر جیب میں رکھ لیے۔

ایک دن پہلوان میرے پاس آیا۔ اس کے منہ میں پان بھرا ہوا تھا۔ اور چہرے پر باغ کی گرد چھائی ہوئی تھی۔ سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ "کشمیری بابو ایک بات کہوں۔ یہ تمہارا دوست مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ کیا بتاؤں؟ سڑی ہے سڑی۔ مذاق کا جواب بھی نہیں دیتا اور مسکراتا بھی نہیں۔ تنگ دل ہے۔ بہت چھوٹا آدمی ہے۔"

میں جانتا تھا کہ پہلوان سے جو گھل مل کر بات نہیں کرتا تھا۔ اس سے وہ بہت جلتا تھا۔ اور طرح طرح کے جھوٹے سچے قصے وہ اس کو بدنام اور ذلیل کرنے کے لیے پریس میں پھیلا دیتا تھا۔ اس کے پاس اپنے حریف کے ناک میں دم کرنے کا یہ نسخہ بڑا زوردار تھا۔ بڑے بڑوں سے ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ مدراسی کے بارے میں بھی کوئی لطیفہ تو نہیں گڑھ رہا ہے۔ تو اس نے اپنے بڑے سے گھٹے ہوئے سر کو ہلایا، بیڑی دانت میں دبائی اور زور سے قہقہہ لگا کر بولا۔ "آدمی ہو تو لطیفہ بھی بنے۔ پتھر کا لطیفہ بناؤں۔ ایں۔"

مدراسی ان باتوں سے الگ تھلگ اپنے کام میں جتا رہتا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت غصہ آتا کہ وہ جوگیندر رائے کے ایک ایک اشارے پر دوڑ تا رہتا۔ کبھی ٹیلیفون پر ہے۔ کبھی ڈرائیور بلا رہا ہے۔ کبھی کار سے نئے نئے پھولوں کے پودے اتار رہا ہے۔ ڈانٹ بھی سن رہا ہے۔ لیکن ہر کام جذبات سے خالی ہو کر کیئے جا رہا ہے۔ وہ اس کی میلی قمیض، وہ اس کی خاکی پتلون، وہ اس کی ٹوٹی ہوئی چپل......ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن جوگیندر رائے کے ایک لڑکے نے پیچھے سے آکر اس کے کان کھینچ لیے۔ اس نے ایک جھانپڑ رسید کر دیا۔ لونڈا چیخنے لگا۔ جوگندر رائے اپنے کمرے سے نکل آیا اور پاگل کتے کی طرح اس پر غرانے لگا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ پریس کے سب لوگ کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ میں نے ہیجان میں اور تیزی سے کاغذات ٹائپ کرنا شروع کر دیئے۔ اس کی بھنچی ہوئی مٹھیوں سے مجھے بہت ڈر معلوم ہو رہا تھا۔ دفتر سے اٹھ کر جب ہم چلے تو پگڈنڈیوں کے پاس پہنچ کر وہ آگے آگے اور معمول کے خلاف تیز تیز چلنے لگا۔ میں اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں بند ہوتی تھیں، کھلتی تھیں اور پھر بند ہو جاتی تھیں۔ ان مٹھیوں کے کھلنے اور بند ہونے سے مجھے اس کے دماغ کے اندر جو جنگ جاری تھی۔ اس کا اندازہ ہو رہا تھا۔

اس دن کے بعد سے وہ اور خاموش ہو گیا۔ بالکل بت۔ اس دو مہینے میں چھوٹے چھوٹے اور بھی ایسے حادثات ہوئے جن کی وجہ سے اس کی تلخی اور بھی سنگین ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کی طرف میں نے دیکھنا بند کر دیا۔ ایک بار مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی پلکیں ناخن کی طرح سخت اور تیز ہو گئیں ہیں۔ اور میری آنکھوں میں چبھتی چلی جا رہی ہیں۔ اس دن سے میں خاص طور پر اس کی آنکھوں سے ڈرنے اور کترانے لگا۔

دوسرے مہینے کی تنخواہ ملنے پر وہ میرے ساتھ شہر گیا۔ میں اسے لیے لیے گھومتا رہا۔ اسے میں انا پورنا میں لے گیا۔ جہاں کاؤنٹر پر ایک رفیوجی عورت بیٹھی ہوئی تھی اور ہر ٹکٹ کے ساتھ ایک عدد غم زدہ مسکراہٹ مفت نذر کر رہی تھی۔ یہاں کا قاعدہ مدراسی کے لیے نیا تجربہ تھا۔ خود اپنے ہاتھ سے چمٹا پکڑ کر سستی مٹھائیاں اور نمکین

چیزیں اٹھانے اور اپنی پلیٹ میں رکھنے میں اسے کافی مزا آیا۔ اس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ میز پر بیٹھ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور کھانے لگا۔ میں جب گلاس میں پانی لے کر آیا تو اس کی پلیٹ خالی تھی۔ اور صابن سے دھلی ہوئی چمک رہی تھی اور وہ میری پلیٹ کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا جاتا تھا اور اپنے نچلے ہونٹ کو چوستا جاتا تھا۔ جیسے اس کا ہونٹ بھی اناپورنا کی مٹھائی تھا۔

میں نے اس کی نظروں کے مطالبے کو جل دینے کے لیے کہا۔ ”جانتے ہو اناپورنا کتنا سستا کھانا دیتا ہے۔ واقعی اس سے جنتا کا بہت بھلا ہو گا۔“

”ہاں...... اچھا بتاؤ یہاں کی آبادی کیا ہے اور یہاں کتنے ایسے ہوٹل ہیں......؟“

”آبادی...... بہت بہت لاکھوں...... ہوٹل؟ ایک بس ایک“

”چلو تو غذا کا مسئلہ حل ہو گیا۔“

اور یہی وہ وقت تھا جب اس کی آنکھیں بہت خوفناک معلوم ہوتی تھیں کہ میں نے ان کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

اس نے سینما کے سامنے کھڑے ہو کر فلمی گیت سنے، گنا چوسا، دہی بڑے کھائے۔ باٹا کے یہاں جوتے خریدے اور پیدل پرانے شہر سے نئے شہر آیا اور بازار کے اس گول دائرے میں ٹھاٹ سے ٹہلتا رہا۔ جہاں رونق کار سے اترتی تھی اور بکھر جاتی تھی۔ وہ دیکھتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ عورتوں کا قافلہ، مردوں کی دم ہلاتے ہوئے کتوں کی سی کیفیت، جو ٹائی کی گانٹھ کو چھوتے ہوئے بالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ دوکانوں کی چکاچوند سے گھبرا کر وہ اچانک مڑا اور کہنے لگا...... ”بس اب چلو۔“

ہم پیدل ہی وہاں پہنچے۔ جہاں پارکوں کے درمیان جارج پنجم کا بڑا سا مجسمہ نصب ہے۔ وہ چاندنی میں چاروں طرف گھوم گھوم کر اس مجسمے کو دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ ”یہ بت ایک زمانے سے اس گھوڑے پر سوار ہے۔ وہ اب تک اس گھوڑے سے نہیں اترا ہے۔ گھوڑا دوڑنے لگے تو بیٹھے کو مزا آجائے گا۔ کیوں؟“

مجھے ہنسی آگئی۔ لیکن اس کا منہ اسی طرح ستا ہوا اور غم زدہ تھا۔ وہ اپنے جوتے کا بکس بغل میں دبائے ہوئے تھا۔ اور جھومتا ہوا گھاس پر بکھرتے ہوئے رنگین ہجوم کے بیچ سے بالکل بے تعلق ہو کر چل رہا تھا۔ بس میں بھی گم سم بیٹھا رہا۔ لیکن جب بس سے اترا اور بس آگے نکل گئی تو اسے یاد آیا کہ اس کے جوتے کا بکس بس میں ہی رہ گیا ہے۔ بے تحاشہ بس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ حالانکہ بس بہت دور نکل گئی تھی۔ اور اب کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ میں اس کے پیچھے پکارتا ہوا لپکتا رہا وہ لیمپ پوسٹ کے پاس پہنچ کر اور اس سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا اور اس طرف اپنی نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ جہاں پہنچ کر بس مڑ گئی تھی۔

اس کے دوسرے دن اتوار تھا۔ ہم دن بھر نہر پر جمے رہے۔ اتوار کو وہاں میلہ سا لگ جاتا تھا۔ اس دن بھی رنگ ہی رنگ ہر طرف بکھر گیا تھا۔ یہ رنگ حسین بھی تھا اور مکروہ بھی۔ بعض بہت خوبصورت عورتیں بہت ہی پھیکا اور بے ڈھنگا ڈھیلا ڈھالا سا لباس پہنے ہوئی تھیں۔ منچلوں کے غول کے غول سیٹیاں بجاتے جملے چست کرتے ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ اس دن ہم دونوں نہر کے کنارے درختوں پر چڑھ کر بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔ میں کبھی کبھی ایک آدھ سوال کر دیتا اور وہ اس کے جواب میں مجھ سے سگریٹ مانگتا اور ادھر ادھر کی ہانک کر چپ ہو جاتا۔

"نومبر کی شام مجھے بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈک سے خون کی جو لڑائی ہوتی ہے......وہ......وہ" پھر اسے کچھ یاد آیا۔ اور وہ چپ ہو گیا اس کی یہ آواز مجھے اس کی اپنی آواز نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ موسم کی رنگین بات اس کے منہ سے کیسے نکل سکے گی۔ میں اس کا منہ تکنے لگا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں کچھ یاد آگیا ہے۔ تم نے بات ادھوری کیوں چھوڑ دی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بڑی حیرت سے کہنے لگا۔ "کل جو میں نے جوتے خریدے تھے۔ ان کا ڈیزائن تو اچھا نہیں تھا۔ مگر تھے بڑے مضبوط، بڑے

ٹکڑے...... کیوں...... اگر جوگیندر رائے کے سر پڑ بھی سو بار برسائے جاتے تو نہ ٹوٹتے۔" میں سمجھا وہ اس وقت پہلی بار مذاق کے موڈ میں آیا ہے۔ لیکن جب میں نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں سے دھواں سا اٹھتا ہوا معلوم ہوا۔

رات زیادہ ہو گئی اور نہر کے درختوں پر الو بولنے لگے۔ تو میں درخت سے اترا۔ وہ درخت پر ہی بیٹھا بیٹھا بولا...... "ہیلو کشمیری...... لوگ کہتے ہیں کہ الو کی آواز بڑی منحوس اور بے سری معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تو خاصی سریلی اور شیریں معلوم ہو رہی ہے اس وقت۔"

ہوا کا ایک تیز چبھتا ہوا جھونکا آیا۔ اور میں کپکپا اٹھا۔ مدراسی بھی درخت سے اترتے ہوئے ڈگمگایا اور زمین پر آ رہا۔ گرد جھاڑتے ہوئے اٹھا اور تاریک سناٹے میں اپنے اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔

"نہر پر اتنی عورتیں کیوں آتی ہیں؟" اس نے اچانک کمرے کی طرف چلتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جب ہم برقی کھمبے کے پاس سے گزر رہے تھے تو میں نے اس سے یونہی پوچھا۔

"تم نے کبھی کسی عورت کا جسم چھوا ہے، کسی عورت کو چوما ہے۔"

دو مہینے کی زندگی میں اس کا قہقہہ پہلی بار سنائی دیا۔ بھیانک اور بھرپور چنگھاڑ۔ اس کا قہقہہ ایک چٹان تھا۔ اور چٹان ایک ایسے کنوئیں میں لڑھکا دی گئی تھی جس کی گہرائی کہیں ختم نہ ہوتی تھی۔

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ اور لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "چلو چلتے کیوں نہیں؟" لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔

"میں نے اپنی زندگی میں دو عورتوں کے جسم چھوئے ہیں۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے لیمپ پوسٹ کو گرفت میں لیتے ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ میں دھیمی روشنی میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو پڑھنے کی کوشش

کر رہا تھا۔ لیکن وہاں اتار چڑھاؤ کہاں تھا۔ چہرہ کیا تھا۔ کسی مٹے ہوئے مزار کا پرانا کتبہ تھا، جس پر سے وقت نے ایک ایک لکیر کھرچ کر گرد کے ساتھ اڑادی تھی۔

"دو عورتوں کے جسم؟" میری اپنی بھو کی روح حیرت زدہ سوال کر رہی تھی۔

"ہاں" اس نے اپنی آستین سے ناک صاف کی اور پھر لیمپ پوسٹ کو پکڑتے ہوئے کہا۔ "ایک میری اپنی بیوی کا جسم اور دوسرا اس موٹی عورت کا جسم جس کا بیگ سوتے میں اڑانے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔"

"تو اس کی بیوی بھی ہے۔" یہ خیال میرے ذہن میں چیخنے لگا۔ پھر اس کے بعد میں نے اس قسم کا سوال اس سے نہیں کیا۔ مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ دوسرے ہی دن جوگیندر رائے نے اسے بلایا۔ اور کہا۔ "دیکھو ذرا اس کیاری میں پانی ڈال دو۔ یہ پودے خاص لندن سے آئے ہیں۔"

"میں نہیں دوں گا پانی۔" مدراسی نے بہت بپھرے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیا؟"

"میں اسے اپنی انسلٹ سمجھتا ہوں۔"

"میری پھول کی کیاری میں پانی دینا تمہارے لیے انسلٹ ہے؟" اتنا کہہ کر جوگندر رائے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مدراسی میرے پاس آیا اور پورے جذبات میں بھرا ہوا اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ دفتر کے اور لوگ بھی اس کی پراسرار دحشت اور آنکھوں میں ابھرتی ہوئی بھو کی شعلگی کو حیرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ وہ ٹہل رہا تھا اور جوگیندر رائے سے اپنی جھڑپ کا ماجرا سنا رہا تھا۔ وہ بہت غصہ میں تھا۔ اچانک میری میز کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ میں جان بوجھ کر ٹائپ رائٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس نے مجھے اپنی طرف مخاطب کیا...... "تمہارا باس بہت کمینہ ہے۔" دفتر میں خاموشی چھا گئی۔ "بہت کمینہ ہے۔ اسی روپے دیتا ہے۔ جانوروں کی طرح کام لیتا ہے۔ تمہارا باس بہت کمینہ ہے۔ کہتا ہے میری کیاری میں پانی دو، ہوں۔" وہ پھر ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے رکا۔ اور اپنے لمبے لمبے ہاتھوں سے میز پر انگلیوں کو بجاتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں سوچتا ہوں یہ کیا زندگی ہے۔ میری زندگی کتنی غلیظ ہے۔ ایسے وقت میں سوچتا ہوں کہ کیا زندہ رہنا چاہئے۔ مجھے کیا مر نہیں جانا چاہئے مجھے۔" اس کی آواز میں غصہ، بیزاری اور رقت سب کچھ شامل تھا۔

"مرنا بڑی بات نہیں۔ زندہ رہنا بڑی بات ہے۔" پہلوان نے بیڑی کا ایک زوردار کش لگاتے ہوئے کہا۔ اور ہلتا ڈولتا باہر نکل گیا۔

مجھ سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ دراصل اسے چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔ آندھی میں پتنگ کون اڑائے۔ وہ تھوڑی دیر تک مجھے اپنی وحشی آنکھوں سے گھورتا رہا پھر وہاں سے چلا گیا۔

شام کو دفتر سے جانے سے پہلے جوگیندر رائے نے مدراسی کو اپنے پاس بلایا۔ دو منٹ کے بعد اندر سے چیخنے اور گرجنے کی آواز آنے لگی۔ ہم سب اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔ کیا آفت آگئی تھی۔ مدراسی کی آواز اب صاف آرہی تھی۔

"تم ہر آدمی کو کتا سمجھتے ہو۔ ہر آدمی کتا نہیں ہوتا۔ ہر آدمی روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے نہ تمہیں رائے صاحب کہہ سکتا ہے اور نہ تمہارے لندن سے آئے ہوئے پودوں میں پانی ڈال سکتا ہے...... سمجھے؟"

دروازہ زور سے بند ہوا اور مدراسی جھومتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے سیاہ ہونٹوں کے دونوں طرف آخری کناروں پر جھاگ سا جم گیا تھا۔

دوسرے دن مجھے دفتر اکیلے جانا پڑا۔ اور اس دن مجھے معلوم ہوا کہ مدراسی کے ساتھ خاموش چلنے میں کتنی رفاقت کا احساس ہوتا تھا۔ دل کی کتنی گرد دھل جاتی تھی۔ راستہ سکڑ کر کتنا چھوٹا ہو جاتا تھا۔ اب پھر دھول اڑاڑ کر پھیپھڑوں میں پھنس رہی تھی۔ اور راستہ اور لمبا اور لمبا ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اب مدراسی مجھ سے کتراتا تھا۔ ایک ہفتے سے زیادہ گزر گیا۔ لیکن وہ میرے ساتھ نہر تک ٹہلنے نہیں گیا۔ ہوٹل میں وہ پچھلے مہینے کی تنخواہ کی بدولت کھانا کھاتا۔ پیدل ہی آٹھ میل شہر چلا جاتا۔ وہاں پتہ نہیں دن بھر کہاں چکر لگاتا رہتا۔ شام کے وقت میرے

ساتھ آکر نہر کے کنارے دور دور تک ٹہلتا چلا جاتا۔ اگر مجھے دیکھ لیتا تو اپنا راستہ بدل لیتا۔ میں اس سے بات کرنے کو تڑپ رہا تھا۔ لیکن وہ ایک پکے ہوئے پھوڑے کی طرح خاموش رہتا۔ میں اس کی اندرونی جلن اور ٹیس کو محسوس کر رہا تھا۔ اب اس نے شہر جانا بھی بند کر دیا۔ اس کی داڑھی بڑھ گئی، چہرہ اور سیاہ ہو گیا۔ بال گرد سے اٹ کر اپنا رنگ بدل چکے تھے۔ پلکیں تک مٹیالی نظر آتی تھیں۔ وہ چپ چاپ کمرے میں آکر دسمبر کی برفیلی راتوں میں اپنا پھٹا ہوا کمبل اوڑھ کر زمین پر سو جاتا۔ صبح سویرے میرے اٹھنے سے پہلے چلا جاتا۔ اور اس طرح میرے اور اس کے درمیان خاموشی کی دیوار اور موٹی اور موٹی ہوتی چلی گئی۔ وہ مجھ سے دور ہوتا گیا اور اجنبی سے اجنبی تر بنتا گیا۔

ایک روز بونے کمپونڈر نے بہت رازدارانہ سرگوشی کے ساتھ کہا۔ ''تمہارا دوست پانی میں ڈوب کر مرے گا۔''

''کیا بکتے ہو کمپونڈر...... جتنا تمہارا قد ہے اتنی ہی تمہاری عقل ہے۔''

''میں جو کہتا ہوں...... بائی گاڈ...... بائی فادر...... وہ دن دن بھر نہر کے کنارے ٹہلتا رہتا ہے۔ میں اپنے ہسپتال سے دیکھا کرتا۔ وہ پانی کی طرف جھکتا ہے اور پھر رک جاتا ہے۔ ایک دن تو بس میں چیخ پڑا تھا۔ لیکن وہ درخت کی شاخ میں جھول کر کنارے پر آگیا۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔ بائی گاڈ...... بائی فادر۔'' اس نے اپنی ساری عیسائیت کو بائی گاڈ اور بائی فادر کے دو لفظوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔'' میں نے کرسچین کمپونڈر کی بات پر یقین کرنے کے باوجود اپنی تسکین کے لیے تردید کی۔

''اور وہ بیمار بھی ہے۔ میں نے خود اس کو خون تھوکتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک دن میں نے دیکھا وہ کچھ تھوکتا ہے۔ اور پھر ایک تنکے سے کرید کرید کر دیکھتا ہے......''

''اچھا؟'' میں حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔

''ہاں...... جب وہ ایک گھنٹے تک اپنے تھوک کا پوسٹ مارٹم کر کے چلا گیا تو میں نے جا کر دیکھا...... نیلے پتھر پر اس کا تھوک سوکھ رہا تھا۔ اور اس کے اندر خون تھا۔ بس

جیسے مرغی کی گردن کی باریک رگیں ہوں۔"

اس دن بادل گھر آئے تھے۔ ہوا خوفناک حد تک برفیلی ہو گئی تھی۔ شام کے وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تھی۔ رات گئے تک میں مدراسی کا انتظار کرتا رہا۔ نیند آتی اور میں چونک چونک اٹھتا۔ ایک بار چونک کر اٹھا تو مدراسی زور زور سے کھانس رہا تھا۔ اور دھیمے دھیمے کرا رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی لو تیز کر دی۔ مدراسی نے جھپٹ کر اپنی خوں بار آنکھوں سے غرا کر مجھے دیکھا اور لالٹین بجھا دی۔ اس اندھیرے میں وہ زور زور سے کھانستا رہا۔ صبح تک میری آنکھیں بند ہوتی رہیں اور کھلتی رہیں۔ آخری بار جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں مدراسی نہیں تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ جوگیندر رائے نے مجھے خاص کام سے چھٹی کے دن دفتر بلوایا تھا۔ لیکن میری طبیعت بہت گری گری معلوم ہو رہی تھی۔ بادل اور گہرے ہو گئے تھے۔ اور ہوا میں جنون پیدا ہو گیا تھا۔ میرے ہونٹ ٹھنڈ سے پھٹ گئے تھے۔ اور ٹھنڈی ہوائیں ان میں نمک بھر کر ایسی جلن پیدا کر رہی تھیں کہ آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔

میں مدراسی کی تلاش میں نکلا۔ میں اسے ہسپتال لے جا کر ڈاکٹر کو دکھانا چاہتا تھا۔ وہ کہیں نہیں ملا۔ میں نہر پر گیا۔ وہاں پر شہر سے پکنک منانے والوں کا ہجوم مزے اڑا رہا تھا۔ اس ہنگامے میں مدراسی کہیں نظر نہ آیا۔ میں ندی کے کنارے کنارے اس ہجوم سے بہت آگے نکل گیا۔ آگے پانی کے ایک پتلے چمکیلے فیتے کے پاس ریت کا چوڑا چکلا گورا سینہ نظر آ رہا تھا۔ اور اس پر مدراسی آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔ ہوا آندھی کی طرح اٹھ رہی تھی۔ مدراسی اپنی نیلی قمیض اور خاکی پتلون میں ہوا کے سانس جما دینے والے تھپیڑوں سے لڑتا ہوا کبھی اپنے ہاتھ پیچھے کر کے جکڑ لیتا اور کبھی اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دور ہجوم کو دیکھنے لگتا۔ جو اپنی دھن میں مگن تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد مدراسی کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں ایک چھوٹی سی چٹان پر بیٹھا اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پلٹا اور میرے پاس سے بالکل اجنبی کی طرح گزر گیا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ دائروں میں مجھے اس وقت پتہ نہیں کتنے غموں اور حسرتوں

سے بھری ہوئی صدیوں کی جاڑے کی سیاہ راتیں اسیر نظر آئیں۔

پھر وہ نظر نہ آیا۔ میں دن بھر ہجوم میں اسے ڈھونڈ تا رہا۔ نہر پر اس کا انتظار کرتا رہا۔ شاید وہ کہیں رنگ برنگے ڈوپٹوں اور بلند قہقہوں، جھولوں، گراموفون کے گیتوں، مچھلی پھنسانے کی لگی پکڑ کر بیٹھے ہوئے صاحبوں کے درمیان مل جائے۔ لیکن وہ نہیں ملا۔

شام آئی۔ رات آئی۔ ہوا جھومتی رہی۔ درخت حزنیہ دھن الاپتے رہے۔ نہر آہستہ آہستہ سنسان ہوگئی۔ دور کشتی سے کسی کے گیت کی الٹھر الاپ سنائی دی۔ نہر کے پانی کی سانسیں سنائی دینے لگیں تو میں وہاں سے شکست خوردہ، بری طرح تھکاماندہ اپنے کمرے کی طرف لوٹ پڑا۔ پر اس وقت پانی برسنے لگا تھا اور میں سر سے پیر تک برف ہوا جارہا تھا۔

میں نے لالٹین جلائی۔ میں کمرے میں اکیلا تھا۔ کمرہ بالکل خالی خالی محسوس ہورہا تھا۔ مدراسی اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ باہر زور زور سے بارش ہورہی تھی۔ میرے کمرے کی چھت سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ایک چمگاڈر ہوا میں چکر کھارہا تھا، اور کمرے کی دیواروں سے ٹکرارہا تھا۔

جب میں اپنی چارپائی پر سونے لگا تو تکیے پر مجھے ایک کاغذ رکھا ہوا ملا۔

"میں بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھوک سے بھاگ آیا تھا۔ بھوک یہاں بھی میرے پیچھے پیچھے آئی۔ بھوک سے بھاگو بھوگ پیچھا کرے گی۔ میں پھر بھوک سے لڑنے کے لیے مدراس واپس جارہا ہوں۔"

مدراسی گیا نہیں تھا۔ میں اس کی آواز صاف سن رہا تھا۔ بھاری، ترش اور غم زدہ آواز۔

وہ اجنبی نہیں تھا۔ وہ پتھر کا خوفناک سیاہ بت نہیں تھا۔ میں دوڑ کر کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوگیا۔ اب بھی مجھے اس کا انتظار تھا۔ میں اب بھی اسے آشرم کی برقی روشنیوں کے نیچے درخت کے پاس بھیگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اب اس اندھیرے میں بھی اس کا قہقہہ سن سکتا تھا۔ میں اس قہقہے کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ قہقہہ نہیں تھا۔ نور کی

تلوار تھا۔

میں نے پھر اپنے کمرے میں جھک کر اس زمین کو دیکھا۔ جہاں مدراسی سوتا تھا۔ وہ زمین جو آج خالی تھی۔ مجھے ایک طرف تھوک کے دھبے نظر آئے۔ جن کا رنگ اب سیاہ ہو چکا تھا۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اور لالٹین کی روح لرز گئی۔ میں چونک کر دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ درخت کے پتے سنسنا رہے تھے۔ بارش کے ساتھ اولے برسنے لگے تھے۔ دور سے آواز آرہی تھی۔

"ہر انسان کتا نہیں ہے۔ میں کتا نہیں ہوں۔ میں خون تھوک سکتا ہوں۔ لیکن لندن سے آئے پھولوں کے پودوں میں پانی نہیں دے سکتا۔"

یہ آواز دور ہوتی جارہی تھی۔ پتھر کا بت دور ہوتا جارہا تھا۔لیکن اس کی آواز میرے سینے میں ایک آندھی سے لڑتے ہوئے درخت کی طرح اگ رہی تھی۔ جھوم رہی تھی۔

○○

مُرلی

۲

پوری شام ہم نے تیسری منزل کے پچھلے کمرے میں بتادی...... میں اور مُرلی۔ باقی لوگ تالاب میں نہانے چلے گئے تھے جن کو ہم اپنے کمرے کے چھجے سے دیکھ سکتے تھے۔ تالاب چونکہ اونچے اور پرانے درختوں سے گھرا ہوا تھا، اس لیے اس وقت نارنجی بجھتی ہوئی دھوپ شاخوں اور پتوں سے چھن کر پگھلتی ہوئی بھاپ کی طرح پانی کی سطح پر برس رہی تھی۔ میں سگریٹ پر سگریٹ جلائے جارہا تھا اور مُرلی میٹھی اداس نظروں سے ان دوستوں کو دیکھ رہا تھا، جو درختوں کے جھلملاتے بجھتے سایوں میں ڈبکیاں لگارہے تھے۔ جب کبھی کوئی قہقہہ پتھر کی طرح ہمارے چھجے پر آکر گرتا تو مُرلی سر سے پاؤں تک کانپ جاتا اور مجھے ڈبڈبائی آنکھوں سے یوں دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو ''یار یہ پتھر میں نے نہیں پھینکا!''

میں اس کو، اس کے چہرے اور رنگ کی چھوٹ میں ڈوبتی ہوئی آنکھوں کو غور سے دیکھتا تو وہ منہ پھیر لیتا اور کہتا ''کل میں یہاں سے چلا جاؤں۔'' ''مگر کیوں؟'' ''اب مجھ سے یہاں جیا نہیں جاتا۔'' ''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ تم بھاگ رہے ہو! کس سے؟ کس سے کیا؟ کسی اور سے نہیں۔ اپنے آپ سے! مُرلی تم مارے جاؤ گے۔

جب شام کی جھلملاہٹ میں تالاب بھی کھو گیا اور اونچے اونچے درخت پرانے کھنڈر کے میناروں کی طرح جم کر رہ گئے تو پرندوں کا آخری جھنڈ شام کی سنسناہٹ میں چھپ گیا اور ان کے پروں کی تھکن بھی جیسے پروں کے ساتھ نارنجی آگ میں ڈھلے

ہوئے اسرار میں دفن ہو گئی۔ اب میں صرف مُرلی کے چہرے کے سلہوٹ کو دوریوں کے پس منظر میں سنولاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔

کل مُرلی چلا جائے گا۔ نہ جانے اس کے چلے جانے کے بعد یہ لوگ اس کے بارے میں باتیں کریں گے یا نہیں؟ تھوڑی دیر میں زینے پر قدموں کی دھمک ابھری۔ وہ نہاکر واپس آ رہے تھے۔ وہ مُرلی کی ہی باتیں کر رہے تھے۔

نہیں، اس کو عشق ہو گیا ہے۔ مجھے جب عشق ہوا تھا تو میرا بھی یہی حال ہو گیا تھا۔ اس ایڈیٹ کو معلوم نہیں کہ عشق ناکام ہو جائے تو اس کی کسک زندگی بھر ساتھ دیتی ہے۔ میٹھی میٹھی اداسی سے ہونٹوں پر ایک گہرا زخم ہنستا رہتا ہے۔ ابے چھوڑ۔ اگر یہی سب بکنا ہے تو افسانہ کیوں نہیں لکھتا۔ لکھتا مگر میری ایک بڑی کمزوری ہے۔ لکھوں گا وہی جس کا مجھے تجربہ ہو۔ جیسے میں تم لوگوں سے باتیں کرتا ہوں۔ اگر ویسے باتیں کروں تو سب کی سمجھ میں آجائیں گی۔ تو پھر اپنی کہانی لکھو۔ ہم سمجھ جائیں گے۔ کسی الّو کی آپ بیتی ہے۔

قہقہوں کے دھماکے آکر دروازے سے ٹکرائے۔ دروازہ کھلا اور سب نے آتے ہی ایک ہی آواز میں پوچھا۔ ’’کیا مُرلی مر گیا؟ آخر تم نے روشنی کیوں نہیں جلائی؟‘‘

’’تم سب کو معلوم ہے بجلی کٹ گئی ہے۔‘‘

’’تو پھر موم بتی جلاؤ۔‘‘

’’ہاں موم بتی جلاؤ۔ مُرلی موم بتی جلاؤ۔‘‘

’’ملے تو سہی۔‘‘

’’نہ جانے مُرلی اتنا کنجوس کیوں ہے...... جب لاتا ہے ایک ہی موم بتی لاتا ہے۔ اس کو اندھیرا بہت اچھا لگتا ہے یار!‘‘

’’ہاں شہپر جو ٹھہرا۔‘‘

’’اپنی افیم لانے میں تو اتنی کنجوسی کبھی نہیں دکھاتا۔‘‘

میں نے اندھیرے میں چیخ کر کہا: ’’تم لوگ مُرلی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ تم

سب اپنی اپنی موم بتی کیوں نہیں لاتے آخر؟"

"موم بتی تو مُرلی ہی کو لانا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارا کمرہ اندھیرا ہے۔ وہ بجلی کے پیسے سے ڈرگس لے آیا۔ اور اب خودکشی کی دھمکی دے رہا ہے۔ جھوٹا۔ ایسی دھمکیوں سے اندھیرا نہیں ملتا۔ اس ایک اینچی ہملٹ کی وجہ سے نہ ہم جی سکتے ہیں، نہ مر سکتے ہیں۔"

"ہیملٹ!"

"ہیملٹ!"

اندھیرا ہو یا روشنی آواز گونجتی ہے۔

تھوڑی دیر میں پھر کمرہ خالی ہو گیا۔ کوئی اندھیرے میں رکنا نہیں چاہتا تھا۔

مُرلی چلے گئے سب۔ پھر کتنا سناٹا ہو گیا ہے۔ اب تالاب سے آگے لیمپ پوسٹ کے بلب لگتا ہے اونچے اونچے درختوں کے پتوں میں چھپے ہوئے ہیں اور روشنی، میلی میلی سی، کدورت کی طرح چھن رہی ہے۔ مُرلی سسکیاں لے رہا ہے۔ مُرلی روتے کیوں ہو بھائی۔ کل صبح تو تم جا رہے ہو۔ تمہیں اس عذاب سے، سناٹے سے، موم بتی سے، تالاب سے، قہقہوں سے اور میری دوستی سے بھی چھٹکارا مل جائے گا۔ روتے کیوں ہو بھائی! اب تو جشن منانے کا وقت آ رہا ہے بھائی۔

مُرلی کی سبکیاں، ٹھنڈی ٹھنڈی سسکیوں میں بدل گئی ہیں۔

چلو گے میرے ساتھ نیچے چل کر کھانا کھالو۔ جان بابو کے ہوٹل میں کھانا کھل گیا ہے۔ اس سے میں نے کہہ دیا ہے۔ میرا دوست مُرلی بھی میرے ساتھ کھائے گا۔ وہ مان گیا ہے۔ چلو۔ نہیں یار آج میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ مجھے بھوکا رہنے کی عادت پڑ چکی ہے۔

اتنے میں اس نے موم بتی ڈھونڈ کر جلالی ہے۔ موم بتی اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کی لو تڑپ رہی ہے۔ شاید چھت اور کونوں کے جالوں کو ایک ساتھ جالینا چاہتی ہے۔

مُرلی موم بتی کو طاق پر جما دیتا ہے، ایک طرف۔ دھندلی دھندلی روشنی

لڑکھڑا رہی ہے، اس کی ٹانگوں کی طرح۔ اس کے ہاتھوں کی رگیں اور ابھر آتی ہیں۔ اور آنکھیں پورے چہرے پر پھیلتی چلی جا رہی ہیں، اس کے پسینے کے ساتھ۔ اس کے چاک گریباں سے پسلیاں سانسوں کے پنجرے کی طرح تھرتھرا رہی ہیں۔ میں اٹھنا چاہتا ہوں مگر اٹھ نہیں سکتا۔ وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے، اپنے آپ سے ...... یہ لوگ کتنے اچھے، کتنے پاک صاف ہیں۔ ان میں کوئی بھی گنہگار نہیں۔ انہوں نے مجھے پناہ دی اور میرے گناہوں کا پردہ بن گئے۔ اور اب وقت آ گیا ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ کل صبح چلا جاؤں گا۔ اور کوئی مجھے نہیں روکے گا۔

نہیں مُرلی میں تو تم کو روکوں گا۔

مُرلی میری طرف مڑا اور دوسری دیوار پر اس کا سایہ شعلے کی طرح لہرایا...... سیاہ، جھالروں کی طرح ہلکا اور ہوا میں اڑتا ہوا، کٹے بازوں کی آستینوں کی طرح۔

موم بتی جلتی رہی اور ہم اپنی منڈلی کا انتظار کرتے رہے۔ کوئی نہیں آیا۔ مُرلی پھر تلملا کر بیٹھ گیا۔

موم بتی یکایک زور سے بھڑکی اور بجھ گئی۔

اب بھی منڈلی غائب تھی۔

میری آنکھوں میں نیند جلنے لگی اور میں نیند سے لڑنے لگا۔ مُرلی اب بھی ویسے ہی بیٹھا تھا۔ بے حس، خاموش! ہوا چھجے پر سرسرا رہی تھی۔

پھر دور سے فجر کی اذان سنائی دی۔ لحن کی سرشاری نے بہت دور سے پکارا۔ ہوا کا ایک تیز خنک جھونکا اندر تک آیا۔ پھر میں نے دیکھا مُرلی بہت آہستہ اٹھا اور اندھیرے دروازے میں اس طرح غائب ہو گیا جیسے اس کے آگے زینہ نہ ہو بس ایک اندھیرا کنواں ہو۔

پھر اس کے بعد کیا ہوا کوئی نہیں جانتا۔

منڈلی پہلی کرن کے پھوٹنے سے پہلے واپس آ گئی۔ چھٹی کا دن تھا، ویسے ابھی زیادہ تر بے روزگار تھے، سب فرش پر بچھے ہوئے پھٹے پرانے بستروں پر سو گئے۔

یکایک نیچے بڑا کہرام ہوا۔ میری آنکھوں کی ریت پھر جل اٹھی۔ میں زینے سے بھاگا۔ اسی طرف جدھر سبھی بھاگ رہے تھے۔ کنوئیں سے مُرلی کی لاش نکالی جاچکی تھی۔ دھوپ میں اس کی آنکھیں اب بھی پھیلی ہوئی تھیں۔ بے چمک، بے دھوپ، تب سسکیوں میں لپٹی ہوئی مُرلی کی آواز مجھے صاف سنائی دی: دوست، جب آدمی اپنے آپ سے بھی کٹ جائے تو سمجھ لو اس کا وقت آگیا ہے۔ دھوپ تیز ہوگئی ہے اور منڈلی تیسری منزل پر سو رہی ہے۔ ○○

دھندلے جنگل

۳

پرچھائیاں ویسے جگمگاتی نہیں ہیں۔ لیکن اگر یہ پرچھائیاں یادوں کی ہوں تو جگمگاتی ہیں۔ بعض گزرے ہوئے لمحوں کی آہٹ کی طرح۔ اگر یہ گرد ہوں خوابوں کی جو کبھی آج کا سچ نہیں بن سکے، تو جگمگانا تو کیا، ان پرچھائیوں کا رنگ دھوئیں جیسا ہوگا۔

اس قسم کے چند جملے لکھنے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ میں نے بڑا تیر مار لیا ہے اور گویا افسانہ گھنٹے دو گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔ اس احساس کے ساتھ تھکن نے آنکھوں میں پیر پھیلا دیئے، دھوپ کی طرح، اور میرے پپوٹوں پر ان دیکھے خوابوں کا بوجھل پن چھا گیا۔ جب تک یہ بوجھل پن چھایا رہا، میں زندگی کی تمام ریاکاریوں سے آزاد ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو شام کی نارنجی سلگتی ہوئی روشنی درختوں کے اوپری پھننگوں میں جھلملا رہی تھی۔ سب سے پہلے چیز جو نظر آئی وہ تھی کاپی جس پر میں نے وہ چند جملے لکھے تھے جن سے کہانی شروع ہوئی تھی۔

اتنے میں بڑے آئینے میں مجھے اپنا چہرہ نظر آیا جس پر جھریاں بکھر گئی تھیں۔ بالوں میں سفید سفید گرد پڑی ہوئی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے۔ مجھے تعجب نہیں ہوا اور نہ دھکا سا لگا۔

لیکن اتنا ضرور سوچا میں نے وہ جو زندگی بھر کہانیاں لکھ کر اور سنا کر، لفظوں کی سوداگری کرتا رہا ہوں کیا ان پر ایک آخری نظر ڈالنے کا وقت ابھی نہیں آیا؟ شاید آ گیا ہے۔

اسی لیے اس وقت مجھے ساگر بہت یاد آرہا ہے۔ جس سے بار بار میں کہتا تھا بھئی تم بھی کوئی کہانی سناؤ اور میں لکھ دوں اور تم کو امر کر دوں یا خود امر ہو جاؤں۔ وہ اپنے اوبڑ کھابڑ دانت نکال دیتا۔ یار سناؤں گا، سناؤں گا۔ اور پھر دوسری طرف منہ کر کے روہانسو سا ہو جاتا، اور چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھانے لگتا۔

تب کا قصہ ہے جب میں سوچتا ہی نہیں تھا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، اس سے دوسروں کے دل پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ہم اس ڈھابے کے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے، جہاں پہنچ کر ساگر بہت بوکھلا جاتا تھا۔ اب بھی وہ ڈھابہ اسی جگہ پر ہے، گلی کے نکڑ پر، جہاں رکشہ چلانے والے اور دوکانوں کا بوجھا ڈھونے والے اور ٹھیلوں پر لادنے والے اکٹھا ہوتے ہیں اور دوسروں کے ٹرانسسٹر سے پھوٹنے والے گیت سنتے ہیں اور کبھی کبھی ان کے سروں میں اپنا سر ملا دیتے ہیں جس کی وجہ سے میرے جیسے آدمی کے دل کے تار بھی لرز اٹھتے ہیں اور میں چپکے سے ساگر سے کہتا ہوں، بھیا یہ کوئی دانت نکالنے کی بات نہیں ہے۔ یہ سنگیت ہے سنگیت۔ وہ اس عمر میں شرما جاتا ہے۔ لگتا ہے اسے اس بات کا بڑا پچھتاوا ہے کہ اگر اس کے گلے میں سر نہیں تھا تو پھر پیدا ہونے کی ضرورت کیا تھی۔ اس سے تو یہ بھی نہیں ہو سکا کہ میری طرح کوئی کہانی ہی سنا دے۔ ساگر، ایک دن میں نے اس سے کہا، تم اگر میری طرح کہانی نہیں سنا سکتے جو میں لفظوں سے بنتا ہوں، گویا کان کھودتا ہوں، تو کم از کم اپنی زندگی کی کہانی سنا دو بھائی۔ یہی بتا دو کہ تمہارے دانت اوپر کو کیوں ہیں، اور ان کی وجہ سے تم ہنستے ہو تو منہ بسورتے کیوں دکھائی دیتے ہو؟ وہ بڑا گمبھیر ہو گیا اور چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا، کیا اتنی سی بات سے کہانی بن جائے گی؟ کہانی اور ہے کیا، میں بھی بڑا گمبھیر ہو گیا، اپنے دکھ سکھ دوسروں کو دینے کے سوا اور دوسروں کے دکھ سکھ اپنانے کے سوا؟ اس نے بڑی حیرت سے مڑ کر مجھے دیکھا، جیسے میں نے جاڑے کی رات میں اس کے سر پر ٹھنڈے پانی کی بھری بالٹی انڈیل دی ہو۔

اچانک اٹھا، اور کسی بوڑھے، تھکے ہوئے مسافر کی طرح اٹھ کر چلا گیا۔

میں بھی اس کے پیچھے پیچھے، دیواروں سے آ گئے، سڑکوں سے آگے، قبرستان کے جنگل کی طرف چلنے لگا۔ ایک بہت ہی منحنی سی قبر کے پاس، جس پر نیم کے درخت کا سایہ پڑتا تھا، کھڑا ہو گیا۔ ایسا لگا کہ وہ میرا انتظار کر رہا ہے اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں بھی اس کے پاس پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دانت نکال کر قبر کے کتبے کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر لکھا تھا: حنا معصوم: جو جوانی کی دھوپ میں جھلس کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ساگر جس طرح اردو پڑھتا تھا اور اس پر خوش ہوتا تھا، وہ آج تک راز ہے۔

اس کی گردن کی رگیں تن گئیں اور وہ دانت نکال کر ایک ہی سانس میں اپنے اندر قید ایک مدھر آواز میرے کانوں میں انڈیل کر جنگل میں آگے بڑھ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ مجھے بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ ساگر مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ یہ میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ جھاڑیوں کی سرسراہٹ کے ساتھ کبھی کبھی لگتا کہ میں جس گھاس پر چل رہا ہوں، اگر وہاں کوئی قبر ہو تو؟ اور میرے پاؤں تھمنے لگے۔ جانے کس کی قبر ہو گی۔ اتنے میں ساگر کی آواز سرسراتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں بالکل اس کے پاس کھڑا تھا۔ وہ میری طرف مڑا اور پوچھنے لگا...... لگتا ہے تم تھک گئے۔ میں نے کہا تھا کہ تم مجھ سے کہانی سنانے کی ضد نہ کرو۔ لیکن تم نے تو کوئی کہانی سنائی نہیں۔

وہ بھونچکا سا مجھے جنگل کے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اور جب میں نظر آیا تو اس نے دانت نکال دیئے اور بولا۔ میں حنا معصوم کو جانتا تھا۔ وہ نرم نرم پلکوں کے سائے میں چمکتی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ چھجے پر آکر اپنے بھیگے بال سکھاتی تھی اور خود بخود ہنسنے لگتی تھی جیسے کسی نے گدگدا دیا ہو۔ میں جہاں رہتا تھا، وہاں کی بالائی کھڑکی سے وہ صاف نظر آتی تھی۔ اس کا بدن ہر جھٹکے کے ساتھ کبھی ایک طرف شعلے کی طرح لپکتا تھا، کبھی دوسری طرف۔ پھر وہ یکایک آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ ایک دن اس کے گھر سے ایک جنازہ نکلا۔ کفن دھوپ سے بھی زیادہ سفید تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ حنا معصوم کا جنازہ تھا۔ جنازہ اٹھانے والے بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ پورا جلوس اس جنگل میں کھو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کو زہر دے دیا گیا تھا۔ اور وہ

دھوپ میں بال سکھاتے سکھاتے چپ چاپ مر گئی۔ نہ جانے کیوں مجھے اس وقت کا انتظار ہے جب وہ اس قبر سے نکلے گی اور دھوپ میں بال سکھائے گی۔ میں اس کی تلاش میں، جنگل میں بھٹکتا رہتا ہوں۔ جنگل نے مجھے ڈھانپ لیا ہے اور اب لگتا ہے اس جنگل کا کہیں انت نہیں ہے۔

تب سے مجھے ایسا لگتا ہے، ہم دونوں ایک ہی جنگل میں قید ہیں۔ جو اس کا تجربہ ہے، وہ میری کہانی ہے۔ ہم دونوں ایک ہی جنگل میں بھٹک رہے ہیں۔ لیکن اس جنگل کا کوئی انت نہیں ہے۔ نہ اس کا نہ میرا۔ ہم انت ہیں جنگل کی طرح، جہاں حنا معصوم کی قبر ہے۔ اور جہاں ساگر اس کے باہر نکلنے کے انتظار میں ہے۔ لیکن یہاں چھجہ کہاں ہے۔ اور دھوپ؟ میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں لیکن میں جانتا ہوں وہ میرے سوال کا جواب نہیں دے گا۔ بس دانت نکال دے گا اور چائے کی چسکی لے گا۔ اور میں اندر اندر کھولوں گا۔ اور ٹے کھاؤں گا۔

ساگر بہت دیر سے جنگل میں بیٹھا ہے اور میں اس کو اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چلتے چلتے جب ہم دونوں ڈھابے پر پہنچتے ہیں تو گلی کے کتے ہمارے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ ہم بیٹھتے ہیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں جمائیاں لے کر سو جاتے ہیں۔

میں آہستہ آہستہ ساگر سے کہتا ہوں، تم جو مجھے جنگل لے گئے تو کیا دکھانا چاہتے تھے تم۔ اور جنگل کیا سچ مچ جنگل تھا؟ اور حنا معصوم کون تھی؟ بتایا نا تمہیں، ایک لڑکی تھی جو میرے گھر کے پاس والے گھر میں رہتی تھی اور روز چھجے پر آکر بال سکھایا کرتی تھی۔ اور وہ دھوپ، جس میں دھندلی سے دھندلی آنکھیں بھی جگمگا اٹھتی ہیں؟

ساگر نے سر اٹھایا اور دور دیکھنے لگا، حالانکہ وہاں دور دیکھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پرانی گلی تھی۔ اور نظر کے سامنے دیواریں تھیں۔ دیکھو ایسا ہے یار کہ یہ سب کہانی ہے۔ میری زندگی میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ نہ جانے کتنی بار ایسا ہوا کہ چل رہا ہوں گلی میں اور جا نکلتا ہوں جنگل میں۔ اور حنا معصوم تو ایک بت ہے...... جانے وہ کبھی تھی

بھی یا نہیں۔ لیکن وہ ہے۔ یہ سب جو تم کہہ رہے ہو یہی کہانی بھی ہے اور سچ بھی۔ ہر سچائی میں تھوڑا سا جھوٹ ملا ہوتا ہے اور ہر جھوٹ میں تھوڑی سی سچائی۔ حنا معصوم کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ جانے وہ اب کہاں ہے۔ وہ جس جنگل میں ہے وہ ہے بھی یا نہیں۔ بس ایک کہانی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ ساگر، آؤ، اب ڈھابے سے جنگل میں چلیں، وہیں حنا معصوم کی قبر پر۔ دھند لکے میں شاید کچھ اور بھی نظر آجائے...... میرا مطلب ہے کتبے کے سوا۔ اور کچھ نہ ہو، ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہتا ہے اور مڑتا ہے اور پوچھتا ہے۔ یہ زندگی ہے یا کہانی؟ شاید، زندگی۔ شاید کہانی! شاید دونوں! اس کا چہرہ پھر ایک بار دھندلے جنگل میں کھو سا گیا ہے۔

OO

طوفان کے پر

۴

میرے دل پر اس شام، اداسی یوں چھائی جا رہی تھی جیسے کسی گہری جھیل پر شام کا دھندلکا برستا ہے۔

آسمان کا رنگ بے ڈھب تھا۔ ایک طرف دور ہگلی کی موجوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں چھوٹی چھوٹی ڈگمگاتی ہوئی اس کے پاس زرد اور سرخ مچھلیوں کی طرح تڑپ رہی تھیں، دوسری طرف اکاش کی نیلاہٹ پر کالے اجلے بادل آہستہ آہستہ چلے آ رہے تھے۔ عجیب عجیب شکل کے بادل تھے، اونٹ کی طرح گردن اونچی کیے، ہاتھی کی طرح چنگھاڑتے اور بچوں کی طرح مسکراتے بادل۔ ایک جگہ تو سورج کی کرنوں کی پچکاری ایسا زور باندھ رہی تھی کہ لگتا تھا کمان سے، سرخ اور نارنجی رنگ کے تیر نکل کر چاروں طرف آسمان میں تیر رہے ہیں۔

شہر کے بھدر لوگوں کے تھکے ہوئے جلوس ادھر سے ادھر گذر رہے تھے لیکن میں ان سب چیزوں سے بے نیاز تھا۔ سورج کی طرح میرا دل بھی ڈوبا جا رہا تھا۔ "اگر میں نے روپے کا انتظام نہیں کیا تو بھائی کا نام اسکول سے کٹ جائے گا۔" اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میری آنکھوں میں ابھریں اور بجھ گئیں۔ میرا گلا پھنستا ہوا محسوس ہوا اور آنکھیں ابھر آئیں۔ "یہ جو رات بڑھتی آ رہی ہے کیا اس کی صبح کبھی ہوگی؟" یکا یک مجھے پرتیوش یاد آیا اور مجھے لگا کہ میرے کٹتے ہوئے دل پر کسی نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھ دیا ہے۔ پرتیوش کی ٹھنڈی مسکراہٹ میری روح میں تیرتی چلی گئی۔

میں اپنی باڑی کی طرف تیز تیز بڑھنے لگا۔ ''شاید پریتوش میرا انتظار کر رہا ہو۔ آج اتوار ہے اور وہ پچھلے اتوار کو آیا بھی نہیں تھا۔ اوہ آج تو میرا یار ضرور آئے گا۔'' میرے قدم اور تیز ہوگئے۔

جب میں گھر پہنچا تو بارش شروع ہو چکی تھی اور چنے جتنی بڑی بوندیں کھڑکیوں پر برس رہی تھی۔ تجارتی دفتر میں ایسی آوازیں ٹائپ رائٹر سے ابھرا کرتی ہیں۔

بارش کی وجہ سے میں مایوس ہو گیا۔ ''اب پریتوش نہیں آئے گا۔

میں نے اپنے بھائی گوکل کو بلایا۔ وہ کہیں باہر سے کھیل کر آیا تھا۔ اس کا بنیان بھیگ کر چپک گیا تھا۔ میں نے اس کی چھوٹی چھوٹی مسکراتی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ اس کے چوڑے چوڑے چمکدار دانت نکل آئے۔ میں نے اس پر رعب جماتے ہوئے پوچھا کیوں گوکل تو اس طرح بھیگتا کیوں پھرتا ہے۔ مینڈک کہیں کا۔''

اس نے میری اس بات کے جواب میں اپنے بنیان کو نچوڑنا شروع کر دیا۔ اور پھر اپنے لمبے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''دادا...... پریتوش دا آئے تھے۔ تم کو بہت پوچھ رہے تھے۔ دیدی سے کچھ کہا اور چلے گئے۔''

دیدی نے اس کے سوا اور کچھ نہ بتایا کہ پریتوش بہت گمبھیر تھا۔ اور مجھ سے ملنے کو بہت بیقرار۔

بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ دیدی مجھے باہر جانے سے روک رہی تھی۔ کھانا تیار تھا۔ لیکن میں نے اپنی چھتری اٹھائی اور پریتوش سے ملنے کے لیے چل کھڑا ہوا۔ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ اس لیے سواری میں جانا ناممکن تھا۔ اور شرنار تھیوں کی بستیوں کی طرف شہر کے باہر ٹرام نہیں جاتی تھی۔ میں لپک کر آگے بڑھتا رہا۔

بیس...... منٹ میں راستہ طے ہو گیا۔ درختوں کے پاس پریتوش کی چھوٹی سی باڑی تھی جو اس نے اپنے بازوؤں کی محنت سے بنائی تھی اس باڑی میں ٹن کی چادروں اور نئے قسم کے کھپروں سے چھپر تیار کیا گیا تھا۔ اس میں دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں

تھیں اور ایک اس سے بھی چھوٹا چوکا۔ اندر سے لالٹین کی روشنی نظر آ رہی تھی۔

"پتہ نہیں پریتوش ہو گا بھی یا نہیں۔ مگر چلو ماسی سے کچھ تو حال معلوم ہو جائے گا۔" میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ "کیا بات ہے؟ بات کیا ہے آخر......؟"

پرانی چھتری میری حفاظت میں ناکام رہی تھی اور میں کمر تک تو اچھی طرح بھیگ گیا تھا۔

ہوا کے ایک تیز جھونکے سے دروازہ کھل گیا۔ سامنے لالٹین کی مریل سی اور سہی ہوئی روشنی میں پریتوش بیٹھا کاغذ پر جلدی جلدی کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے بال آگے کو جھکے ہوئے تھے اور وہ اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

میری آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ میں بھیگا ہوا تھا لیکن وہ اچھل کر مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ بڑے جوش میں ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس نے کاغذ کے ورق کو سرسری نظر سے دیکھا اور پھاڑ کر پھینک دیا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے گھور کر دیکھا۔ لیکن وہ دوڑ کر الگنی پر سے اپنا سفید کرتا اور دھوتی اٹھا لایا۔ "بدھو کپڑے بدل لو۔ زکام ہوا تو کھانستے پھرو گے اور ایک خوراک دوا نہ مل سکے گی۔"

میں اس انتظار میں تھا کہ وہ کوئی اہم اور اچنبھے میں ڈال دینے والی بات کہے گا۔ اور پھر میرے دل میں ایک سنسنی سی دوڑ جائے گی۔ لیکن وہ کمبخت میرے دل کی ہیجانی کیفیت سے بالکل بے نیاز، خلاف معمول، ایک نئی فلم کے متعلق بکواس کئے جا رہا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ میں اپنی غربت کی وجہ سے فلم کا کوئی خاص شوق پیدا نہیں کر سکا تھا اور مجھے شبہ ہوا کہ وہ مجھے جلا رہا ہے جب ہی تو سب کچھ جان بوجھ کر وہ ترکیبوں، سنگیتوں اور تصویروں کی باتیں کر رہا تھا۔

یہ باتیں مجھے عجیب معلوم ہوئیں جیسے میں ساحل پر کھڑا ہوں اور دور سمندر میں چمکدار روشنیوں کے چھوٹے چھوٹے جزیرے ابھرتے ہیں اور تھوڑی دیر تیر کر رنگ برنگے بلبلوں کی طرح سمندر کے طوفان میں چھپ جاتے ہیں۔

میرا جی چاہا کہ میں اسے بتادوں کہ اس وقت کیا محسوس کر رہا ہوں لیکن میں زمین پر اپنے جوتے بجا کر رہ گیا جو بھیگ جانے کی وجہ سے آہستہ سے سانس لے کر رہ گئے۔

وہ مسکرایا، اس کی آنکھیں جھکے ہوئے بالوں کی چھاؤں میں چمک اٹھیں۔ "بور ہو گئے؟ مزیدار آدمی ہو یار۔"

اس نے میرے کندھے کو جھنجھوڑ دیا۔ "اچھا بتاؤ گو کل اسکول جا رہا ہے نا؟"

میں جیسے بھرا بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے دل کا سارا غم سنا دیا۔ آخر میں میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے کبھی کبھی کہ خودکشی کر لوں۔"

"ڈرپوک!" اس نے پوری نفرت سے کہا۔

وہ خاموش رہا۔ کھانا کھاتے وقت بھی خاموش رہا۔ ماسی کی کمر جھک گئی تھی اور وہ ہمیں کھانا دیتے ہوئے کافی فکر مند معلوم ہو رہی تھی۔ لالٹین کی مریل روشنی میں، ان کے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر ایک پراسرار دل آویز مسکراہٹ کو دیکھنا مشکل تھا۔

میں پریتوش کی خاموشی سے بہت گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے بار بار اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ لیکن وہ سر جھکائے ہوئے کھانا کھا رہا تھا۔ اس کا تانبے جیسا رنگ اور گہرا ہو گیا تھا۔ اور وہ اس بات سے بھی بے نیاز تھا کہ بوڑھی ماسی کتنی ملتجی نظروں سے اسے گھور رہی ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد جب ہم دونوں باہر نکلے تو بارش رک چکی تھی اور آسمان پر بادلوں کے درمیان چاند چمک رہا تھا۔ پریتوش نے سیزر کی دو سگریٹیں خریدیں۔

"کبھی کبھی دھواں بھی اڑانا چاہئے۔ اس سے دل کا اندھیرا بھی دھواں بن کر اڑ جاتا ہے۔" مجھے ڈرپوک کہنے کے بعد پریتوش نے یہ پہلی بات مجھ سے کی تھی۔

"اچھا بتاؤ تمہاری نوکری پکی تو ہو جائے گی۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں۔" دھویں کا ایک زوردار کش لیتے ہوئے اس نے کہا۔

"ہاں۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ منیجر مجھ سے خوش نہیں ہے۔"

"منیجر کو مارو گولی۔ ڈٹ کر کام کئے جاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے تاریک اور نیم تاریک سڑکوں پر سے گزرتے رہے۔ سڑک پر لوگ تیزی سے چل رہے تھے۔ بارش کا نام و نشان نہیں تھا۔ لیکن کچھ لوگ ابھی تک چھتری لگائے ہوئے تھے۔

"کس قدر فضول خرچ ہیں یہ لوگ۔ ڈرتے ہیں کہیں چاندنی سے بھی بھیگ نہ جائیں۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر وہ مجھے کہاں کھینچے لئے جا رہا ہے۔ اتنی رات گئے۔ لیکن جب گلیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور گڈھوں کا پانی جوتوں میں گھسنے لگا تو مجھے خیال آیا کہ یہ پر پیچ گلیاں شوبھا کے گھر پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔

"دوست میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" اس نے یکا یک کہا اور اس کے بعد کے الفاظ میرے کانوں میں گولیوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ "میں گوا جا رہا ہوں۔"

"گوا؟" میں لیمپ پوسٹ کے نیچے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ میری سگریٹ بجھ چکی تھی لیکن میں اب بھی کش لگائے جا رہا تھا۔

"دیکھو میں اکیلا شوبھا کے یہاں نہیں جانا چاہتا۔ تم بھی چلو۔"

شوبھا کا نام سنتے ہی میری ٹانگیں کانپ گئیں۔ اور میرے دل کو ایک جھٹکا لگا۔ پچھلے کئی مہینے سے میں تارون بابو کے ہاں نہیں گیا تھا۔ راستے میں شوبھا کی ایک آدھ جھلک دیکھنے کے سوا میں اس سے ٹھیک طرح ملا بھی نہیں تھا۔ اس سے ملنے کے خیال سے ہی دل ڈوبنے لگا۔ پریتوش نے جھٹ میرا بازو پکڑ لیا اور ہم اندھیرے نکڑ کی طرف مڑ گئے۔

ہر طرف ایک دھیمی اور بوجھل روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس روشنی میں دھواں پگھل رہا تھا۔ اندھیرے دھند لکے سے گزرتے ہوئے ہم گیراج کے اوپر والے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ پریتوش نے دستک دی۔ جتنی دیر میں دروازہ کھلا میرے دماغ میں یہ خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔ "اچھا تو پریتوش گوا جانے سے پہلے شوبھا سے ملنے آیا ہے؟" اس کے بعد میرے دل میں جس طرح جلن اٹھی اور پیشانی پر جس طرح پسینے کی ٹھنڈک محسوس ہوئی غالباً اسی کو رقابت کی آگ کہتے ہیں۔ پریتوش نے پڑوسی کی

کھڑکی سے آتی ہوئی میلی روشنی میں مجھے دیکھ کر مسکرا کر دیکھا۔ ''کیا میرے دوست کا دل بھی اس کی مسکراہٹ کی طرح صاف شفاف ہے؟'' لیکن اس سوال کا جواب ملنے سے پہلے تارون بابو نے دروازہ کھول دیا۔ نمسکار کے بعد ہم جب اندر داخل ہوئے تو فرش پر ہارمونیم رکھا نظر آیا۔ ایک تھالی میں جوہی اور گلاب کے چند پھول رکھے تھے۔ تارون بابو کی پیشانی پر لکیریں اور زیادہ گہری ہو گئی تھیں اور وہ اس وقت صرف دھوتی پہنے کھڑے تھے اور اپنی انگلی میں چاندی کے چھلے کو گھمارہے تھے۔

انہوں نے مجھے دیکھا اور بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''تم کو پریتوش نے گرفتار کیا ہوگا۔ آجاؤ قیدی۔ تم یہاں بیٹھو۔'' میں کھسیانا سا ہو گیا اور ایک مجرم کی طرح بیٹھ گیا۔ میرے پاس ہی پریتوش بھی فرش پر ہارمونیم اور پھولوں کی تھالی کے پاس بیٹھ گیا۔ کمرہ کافی گھٹا ہوا تھا۔ لیکن ایک بڑی بھینی خوشبو کہیں سے اڈ رہی تھی۔ میں نے سوچا ''کتنا اچھا ہوا کہ شوبھا یہاں نہیں ہے۔ ابھی ابھی وہ اپنے بابا کو بھجن سنا کر گئی ہو گی۔ اس نے ان پھولوں کو چھوا ہوگا۔ اور اس کی انگلیاں ہارمونیم پر ٹھہری ہوں گی اور ہونٹوں سے پھوٹتے ہوئے نغمے کے ساتھ اس کی آنکھوں کی ہرنیاں چوکڑیاں بھر بھر کر تھک گئی ہوں گی......

''سنا ہے تمہارا دماغ کچھ چل گیا ہے پریتوش؟'' تارون بابو کی گمبھیر آواز ایک عقاب کی طرح جھپٹی اور کمرے کی دیواروں سے سر ٹکراتی رہی۔ ان کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور پریتوش حیران اور کھلے ہوئے منہ کے ساتھ تکے جارہا تھا۔ ''میرا دماغ؟''

''تمہارا نہیں تو کیا میرا؟'' پریتوش خاموش رہا۔ انہوں نے حقے کا ایک کش لیا اور پھر خود ہی بولے۔ ''عجیب زمانہ ہے، چھوکروں کو مرنے کے لیے بھی نئے نئے فیشن ایجاد کرنا پڑتے ہیں۔ جیسے کوٹ پتلون کے نئے نئے ڈیزائن ایجاد ہوتے ہیں۔''

پریتوش سر ہلاتے ہوئے پہلی بار مسکرایا۔ اس مسکرانے میں بڑی شرارت تھی۔

جب تارون بابو نے اپنے پرانے اسکول ماسٹر کے سے انداز میں آنکھیں نکالتے ہوئے ذرا جم کر ڈانٹ پلانے کا ارادہ کیا تو پریتوش سہم گیا۔ اور اس نے ان کا دھیان

بتانے کے لیے کہا۔ "ماں جی کہاں ہیں؟"

"وہ تو جاڑا بخار سے ابھی ابھی اٹھی ہیں۔ بہت کمزور ہو گئی ہیں۔"

پریتوش اٹھا اور ان کو دیکھنے کے بہانے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اب تارون بابو نے اپنی غمگین...... آنکھیں مینچتے ہوئے اپنا نزلہ میری طرف رجوع کیا۔

"تم سمجھدار ہو۔ برا بھلا سمجھتے ہو۔ اس پگلے کو سمجھاتے کیوں نہیں۔"

"آپ تو جانتے ہیں وہ کسی کی سنتا نہیں۔ جو من میں سما گئی سما گئی۔"

"سما گئی...... ہونہہ" انہوں نے ٹھنڈی چلم کو زبردستی کریدتے ہوئے اپنے نقلی دانتوں کو زبان کی مدد سے ایک دوبار ہلایا اور اپنے سفیدی مائل سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "آخر ہم بھی تو نوجوان تھے۔ مگر یوں کتے کی موت مرنے کا شوق نہیں تھا۔"

پتہ نہیں کیوں میرا دل غصے سے بھر گیا۔

"اس میں کتے کی طرح مرنے کی کیا بات ہے۔ کیا آپ کے زمانے میں لوگ انگریزوں کی گولیوں سے نہیں مرتے تھے۔"

"مرتے تھے، ضرور مرتے تھے، مرتے کیوں نہیں تھے۔" تارون بابو نے ہارمونیم کی پٹریوں پر انگلیاں دوڑاتے ہوئے کہا۔ تب اور بات تھی۔ ہم غلام تھے۔"

"لیکن اگر ہمارے کچھ بھائی غلامی کی زنجیروں میں اب بھی جکڑے ہوئے ہوں تو ان کی زنجیروں کو توڑنے میں......"

"بکواس!" انہوں نے انگلی کو ہوا میں نچاتے ہوئے بڑی بے رحمی سے کہا۔ "تم پر بھی اس کا جادو چلتا ہے۔ آج کے نوجوان اتنے بیوقوف اور پاگل کیوں ہوتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ماں باپ اسی لیے پالتے ہیں کہ......"

میرے کان جل اٹھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تارون بابو سے الجھوں جو ایک پرانے پنشن یافتہ اسکول ماسٹر تھے اور جن سے میرے تعلقات طالب علمی کے زمانے سے تھے، لیکن اس وقت ان کی ضدی قسم کی بات چیت نے میرے اندر بھی ضد کی

آگ کو بھڑ کا دیا۔ میں اڑ گیا۔

"تارون بابو آپ بے کار چلّا رہے ہیں۔ پریتوش کیا ہر نوجوان کو اپنے خون سے زیادہ اپنی دھرتی سے پیار کرنا چاہئے۔" میں نے یہ بات بالکل کتابی سبق کے انداز میں کہی۔

"بکومت...... " انہوں نے ایک بار پھر بے جان چلم کو کرید کر زندگی کی چنگاریوں کی تلاش شروع کر دی۔ "میں نے تمہیں ڈنڈے مار مار کر پڑھایا ہے، تمہیں سوجھ بوجھ دی ہے اور اب تم مجھے سکھانے چلے ہو۔ ہونہہ حد ہو گئی۔" حسب معمول جذبات میں ان کے منہ سے تھوک کی پھلجھڑیاں چھٹنے لگیں۔ میں سامنے سے ہٹ گیا۔

"تم جانتے ہو کوئی بھی اپنی بیٹی کا جیون ایسے آدمی سے نہیں باندھ سکتا جو اپنا سر ہتھیلی پر لیے پھرتا ہو۔ ایسا چراغ اندھیرے گھر میں اجالا نہیں کر سکتا جو صرف آندھی کا منہ چڑانے کو جلتا ہو!۔"

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ تارون بابو نے پریتوش کی نہیں بلکہ میری بھی بے عزتی کی ہے۔ آخر ایک سرکاری اسکول کے وفادار اور پنشن یافتہ ماسٹر جو ٹھہرے۔ بالکل بوڑھے اور قدامت پرست۔ ان کے دماغ میں عجیب عجیب قسم کے کالے بتوں کا بازار سا لگا رہتا تھا۔ لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں چپ رہا۔

"پریتوش اور شوبھا کا رشتہ بڑا نازک ہے...... میں اور آپ ......" میں نے دبی زبان سے کہا لیکن انہوں نے میری بات کاٹ دی۔

"میں پریتوش کو چاہتا ہوں۔ اچھا لڑکا ہے۔ میں بڑا جہیز بھی نہیں دے سکتا۔ اس لڑکے کو جہیز نہیں شوبھا چاہئے۔ یہ بھی جانتا ہوں۔ پھر بھی اگر وہ میری بات نہیں مانتا تو میں شوبھا کو...... میں کہتا ہوں اگر میں تم سے ہی کہوں تو کیا تم......" انہوں نے بات پوری نہیں کی۔ اور مجھے شبہ کی نظروں سے گھورنے لگے۔

ٹھیک اس وقت دوسرے کمرے کا دروازہ آپ ہی آپ ذرا سا کھل گیا اور

دروازے سے مجھے شوبھا کا گندمی پیارا چہرہ نظر آیا۔ اس کے تیکھے نقوش پر ایک حیران سی گمبھیرتا چھائی ہوئی تھی۔ اس کے گال اس کی ہتھیلیوں میں تھے اور بادام سی آنکھیں پریتوش کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے۔ جب وہ کسی گہرے خیال میں ہوتی تو اس کی آنکھوں میں یہی حیرانی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آتی تھی۔ ہونٹوں پر آگ اور دل میں دھواں!

میرا جی چاہا کہ شوبھا کو پکار کر اپنے پاس بلالوں۔ پھر میں اپنے اس خیال پر بڑا جھنجھلایا۔ اس طرح سوچنے کا کیا تک ہے۔

"دیکھئے میں تو سمجھتا ہوں کہ پریتوش کو ضرور جانا چاہئے۔" یہ بات غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گئی...... اور میں سوچ رہا تھا، یہ بڈھا ماسٹر شاید مجھے پریتوش کا رقیب سمجھتا ہے۔

انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔ "ہاں تاکہ تمہارا راستہ صاف ہو جائے!"

"جی نہیں...... آپ شاید نہیں جانتے کہ میں پریتوش کے ساتھ جارہا ہوں۔"

میں نے بے ساختہ کہا اور جب تارون بابو کا منہ اتر گیا، آنکھیں جھک گئیں اور منہ سے حقے کی نے چھوٹ کر فرش پر لیٹ گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں نے بنا سوچے سمجھے کیا کہہ دیا تھا۔

تارون بابو بڑبڑائے۔ "تم دونوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں نے تمہاری بھلائی کے لیے کہا تھا...... میں بوڑھا ہوں۔ اپنے بڑے بوڑھوں کے بارے میں سوچو۔ کوئی بھی مالی اپنے خون پسینے سے لگائے ہوئے پھولوں کو آگ میں جھونکنا نہیں چاہتا۔"

دروازہ کھلا اور پریتوش تیز قدموں سے باہر والے کمرے میں آگیا۔

تارون بابو نے بہت روکا لیکن ہم وہاں سے نکل آئے۔ آدھی رات ہونے کو آئی۔ اور کون جانے کب یہ سیاہ بادل موسلا دھار برسنے لگیں۔

"جانتے ہو شوبھا نے خوشی خوشی اجازت دے دی۔"

پریتوش بہت خوش تھا۔

"اچھا سنو آج اکٹھے تین تین ٹیوشن سے مجھے روپے مل گئے اور ایک کتاب کے گردپوش کا ڈیزائن بھی آج ہی بک گیا۔ قیمت اچھی ملی۔ ایک کام کرو، اس نے اپنے کرتے کی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر میرے ہاتھ میں پکڑادیا۔ "گوکل کا نام اسکول سے نہیں کٹنا چاہئے۔"

میں نے جب لینے سے انکار کیا تو اس نے جھٹ ڈپٹ کر کہا۔ "میں کوئی احسان نہیں کررہاہوں۔ تمہارا قرض تھا سو لوٹا رہا ہوں۔"

میں چپ ہو گیا۔ ایسے موقع پر میں پریتوش سے بحث نہیں کر سکتا۔ اور اس کا فائدہ کیا تھا۔ جیت ہمیشہ اس کی ہوتی ہے چلتے چلتے اس نے کہا "اب میں گوا سے واپس آکر ملوں گا۔ شوبھا بیاہ کے لیے تیار ہے۔"

میرا دل دھک سے ہو گیا۔ رات اندھیری تھی اور پریتوش اس میں تحلیل ہو رہا تھا۔

میں دیر تک فرش پر کروٹیں بدلتا رہا۔ کچھ تو کھٹمل خون چوس رہے تھے۔ اور کچھ آنکھوں سے نیند بھی بھاگ گئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور دماغ بول رہا تھا۔

"شوبھا اور پریتوش کا بیاہ ہو جائے گا۔ اور اگر پرتگالیوں کی گولی...... پریتوش کا خون میں نہایا ہوا جسم آہستہ آہستہ سانس لیتا ہوا ابھرا۔ نہیں نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا۔ اس وہم نے مجھے اپنا دشمن بنادیا۔ میں اٹھ بیٹھا...... گلی میں کتے رو رہے تھے اور دور کہیں سے جھانجھن بجنے کی آواز آ رہی تھی۔

جب شروع شروع میں مشرقی پاکستان سے سینکڑوں کی تعداد میں لوگ کلکتہ آرہے تھے تو ایک دن پریتوش سے میری ملاقات اچانک ایک بڑی سی فرم میں ہو گئی تھی، جہاں ہم دونوں روٹی کے سہارے کے لیے گئے تھے۔

پریتوش کی بھیگی بھیگی سی قہقہہ زن آنکھیں اتنی سچی تھیں، اتنی روشن کہ میں اپنی جذباتی گھٹن کے باوجود پہلی ملاقات میں اس کا دوست ہو گیا۔ اس کی باتیں بے جھجک اور بڑی ہمدردانہ تھیں۔

"دیکھو بات صاف ہے یہاں اتنے امیدوار۔ اور جگہیں صرف تین ہیں ہم سب تو لیے نہیں جاسکتے۔ زیادہ لوگوں کو مایوس ہونا پڑے گا اور ہم زیادہ لوگوں میں ہوں گے۔"

رفتہ رفتہ پریتوش نے مجھے اس اندھیرے خول سے نکال لیا جس میں زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں نے مجھے اسیر کرلیا تھا۔ میرے ساتھ ہی وہ تارون بابو کے یہاں آنے جانے لگا۔ وہ میری طرح کبھی ہمت نہ ہارتا۔ ہمیشہ قہقہہ لگا کر مایوسی کا غبار نکال دیتا۔

اس نے طرح طرح کے کام کیے وہ دن بھر میں چار پانچ جگہ ٹیوشن کرتا۔ شام تک اس کی جیب میں ٹراموں کے ٹکٹ جمع ہو جاتے۔ رات کو سونے سے پہلے وہ کبھی گیت لکھتا، کبھی اخبار کے لیے کوئی مضمون لکھتا، یا کبھی صرف موٹی موٹی کتابیں پڑھتا ہوا نیند کی آغوش میں چلا جاتا۔ اور جب میں بھی اس کے گھر موجود ہوتا تو وہ اپنی ماسی کو چھیڑتا، ان سے پرانے زمانے کی کہانیاں سنتا۔ اور میری طرف مغرور آنکھوں سے دیکھتا، ہنستا، آنکھ مارتا اور کہتا: "اچھا بتاؤ میری ماسی سے زیادہ سندر ماسی اور کسی کی ہوگی؟"

میں فوراً نفی میں سر ہلادیتا۔

اور ماسی ناراضگی کا پوز بنا کر اپنی مسکراہٹ کو ہونٹوں میں دبائے ہوئے اور آنچل میں بندھے ہوئے کنجیوں کے گچھے کو کندھے کے پیچھے پھینکتے ہوئے ہمارے پاس سے چلی جاتیں۔ اور پکار کر کہتیں "بیٹے اپنے چہیتے کو روک لینا۔ میں نے اس کے لیے بھی بھات پکایا ہے۔"

ہم ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے تھے۔ لیکن پریتوش میرا سہارا زیادہ تھا۔ ان ہی دنوں مجھے ایک دھکا لگا۔ ایک دن پریتوش بہت خوش خوش آیا "وہ یار بات یہ ہے کہ شوبھا بھی مجھ سے خوش ہے۔ میرا مطلب ہے مجھے پسند کرتی ہے" اتنی سی بات کہنے میں اسے پسینہ آگیا۔ میں خود ایک زمانے سے شوبھا کو خاموشی سے پوجتا آیا تھا۔ لیکن

اپنے اوپر بھروسہ نہیں تھا۔ لیکن اس وقت پریتوش کے اس جوش نے مجھے اس کا شاکی بنادیا۔ لیکن وہ اسی طرح جوش و خروش سے اپنے دل اور جذبات کی نازک نازک کلیاں کھلاتا رہا۔ پھر ہم نے ایک ساتھ ہی چائے پی۔ میں بہت دیر کے بعد مسکرایا۔ میں نے صرف اتنا کہا "پریتوش تم کتنے خوش نصیب ہو۔ تم پر رشک آتا ہے۔" اس کی مسکراہٹ ختم ہوگئی۔ کچھ سوچتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ سچ سچ بتانا کیا تم بھی شوبھا کو چاہتے ہو۔" میں نے تیزی سے اور جلدی سے کہا: "نہیں۔ پاگل، بیوقوف۔" پھر وہ میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر دیر تک فٹ بال کے میدان میں ٹہلتا رہا۔ "شوبھا کی پڑھائی ختم ہونے کے بعد ہی بیاہ ٹھیک رہے گا...... کتنا اچھا ہو تمہارا بھی بیاہ ہو جائے...... اور ہم کہیں اکٹھے رہیں......" وہ پوری شام شوبھا ہی کی بات کرتا رہا۔ جدا ہوتے ہوئے اس نے زور سے میرا ہاتھ دبایا اور میں نے اونچے مینار پر نظریں گاڑے ہوئے دوبارہ کہا "تم بڑے خوش نصیب ہو۔ تم پر رشک آتا ہے۔" اب کے اس نے زور سے قہقہہ مارا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلتی ٹرام میں غائب ہوگیا۔

اس رات میں سونے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ تمام باتیں یاد آرہی تھیں۔ اور پھر دروازے کی دراز سے شوبھا کا چہرہ نظر آتا۔ ہتھیلیوں پر رکھا ہوا، آنکھوں میں اداسی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ میں اپنی آنکھیں کھول دیتا اور دور سے اونچی اونچی عمارتوں کی کھڑکیاں ہوا میں معلق سنہرے آئینوں کی طرح چمکتی نظر آتیں۔

چند ہی دن قبل پریتوش مجھے اپنے ایک ساتھی کو دیکھنے لے گیا تھا...... اس کا تصور اس وقت یوں ابھرا کہ میں تقریباً چیخ پڑا۔ اس کے چہرے پر گہری خراش تھی۔ جیسے چاقو سے خون کی نہریں کھودنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس کے تلوے سوجے ہوئے تھے۔ اور انگلیوں سے ناخن نُچے ہوئے تھے۔ اس کے زخم پک گئے تھے اور وہ آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ "گوا...... گوا جھنڈا...... خون...... سورج......" یہ باتیں کہتے ہوئے بار بار اس کی مٹھی بھنچ جاتی تھی۔

میرا خون کھولنے لگا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ اندھیرا پگھلنے لگا تھا۔ اور کارخانوں کی طرف

جاتے ہوئے مزدوروں کے زور سے بات کرنے کی آواز آرہی تھی......"

"کارخانے کا منافع ہمارا خون پسینہ ہے...... آخ تھو۔"

میں نے طے کرلیا صبح ہی صبح دیدی اور گوکل کو اپنا فیصلہ سنادوں۔ دیدی روئیں گی لیکن میں انہیں منالوں گا......"

انجن زور سے سانس لے رہا ہے۔ دوستوں نے ہمارے گلے میں ہار ڈال دیئے ہیں۔ سب مسکرارہے ہیں۔ ہاتھ دبا رہے ہیں اور قہقہے لگا رہے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہاتھوں کا یہ دباؤ پھر نصیب نہ ہوگا۔ ہم یہ قہقہے پھر نہیں سن سکیں گے۔ دل دھڑک رہا ہے۔ میں اس کی آواز سن سکتا ہوں۔ ہونٹ خشک ہورہے ہیں۔ کیا ان پر پپڑیاں جم رہی ہیں۔ لیکن پریتوش کے ہونٹ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی بے باک شگفتگی پر تھکن کی ذرا بھی گرد نہیں۔ اس کے سفید دانت چمک رہے ہیں۔ اور وہ اپنی آنکھیں پھیلا کر پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر دیکھتا ہے کیا اسے کسی کا انتظار ہے۔ وقت کتنی تیزی سے اڑا چلا جارہا ہے۔ انجن کے منہ کا دھواں گاڑھا اور گاڑھا، کالا اور کالا ہوتا چلا جارہا ہے۔ چند ہی لمحوں کی خلیج بیچ میں ہے پھر یہ گاڑی ہمیں اس عظیم الشان، گونجتے دھڑکتے شہر کی گود سے چھین لے گی۔ دیدی اس وقت رورہی ہوں گی۔ گوکل اسکول چلا گیا ہوگا۔ اچھا کیا میں نے اسے پریتوش کے دیئے ہوئے روپے دے دیئے۔ اتنا چھوٹا ہے لیکن سمجھدار ہے گوکل۔ پریتوش کی ماسی کی آنکھیں جو آنسوؤں کو اپنے اندر دبائے تڑپ رہی تھیں اب چھلک گئی ہوں گی اور ان کے سفید آنچل سے بندھا ہوا کنجیوں کا گچھا اب آنچل کے ساتھ زمین پر پڑا ہوگا۔ پریتوش کی آنکھیں کیوں چمک اٹھیں اور اس کے ہونٹ اس طرح کیوں تھرتھرائے؟ لو وہ تو دوڑ کر ایک ہانپتی ہوئی لڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا...... انجن کی چیخ شور و ہنگامے کا دل چیر گئی۔ گاڑی کھسکنے لگی۔ اور میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ پریتوش چلتی ہوئی گاڑی میں اچھل کر اندر آگیا۔ وہ اب بھی اپنا

دھڑ باہر نکال کر جھانک رہا ہے۔ میں بھی جھانکتا ہوں۔ شوبھا آہستہ آہستہ اپنا آنچل ہوا میں لہرا رہی ہے اس کا گندمی چہرہ کتنا دمک رہا ہے۔ کتنے ہاتھ ہوا میں اٹھ گئے ہیں۔ آنچل، رومال، ہاتھ ...... کتنی گاڑیاں، کتنی عمارتیں...... اور بھاگتے ہوئے پیڑوں اور تار کے کھمبوں سے آگے اونچی اونچی دیواروں اور چھتوں کے اوپر گردن اٹھائے چمنیوں کا تیرتا ہوا دھواں۔ لیکن اس دھوئیں میں اب بھی میں شوبھا کے دمکتے ہوئے چہرے کو دیکھ سکتا ہوں جس کے بالائی ہونٹ کے اوپر پسینے کی موتی چمک رہے ہیں۔ آنچل اڑ رہا ہے ...... لیکن دھواں ہے کہ اس کے بالوں کی طرح لہراتا ہی چلا آ رہا ہے۔

"شوبھا تمہارے لیے بھی پھول لائی تھی،" پریتوش کے بال بکھر گئے ہیں۔ میں اس کے ہاتھ سے پھول لے لیتا ہوں یہ پھول کتنے کومل اور نم ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پھول اوس میں نہیں بلکہ آنسوؤں میں بھیگے ہوئے ہیں۔ اور ان کی خوشبو شوبھا کے سانس کا رس چرا لائی ہے لیکن میں بھی عجیب دیوانہ ہوں۔ میرے ساتھی زور شور سے گپ کر رہے ہیں، پریتوش ان کی باتیں سن رہا ہے اور سستی پھستی سگریٹ کے کش اڑا رہا ہے۔ ہوا میں بہت تندی ہے۔ ہمارے جذبات ان جھونکوں سے بھی زیادہ تند ہیں۔ اگر میں اسی طرح سوچتا رہا تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ نہیں مل سکوں گا، میں ایک اجنبی بن جاؤں گا۔ دور افق پر شفق کے انگنت پھول دھیمی ہوتی ہوئی زرد روشنی کے دریا میں بہہ رہے ہیں۔ جل تھل کھیتوں میں سیال آگ سانس لے رہی ہے۔ کسان اپنے کندھوں پر ڈنڈا رکھے، ہاتھ ہلا ہلا کر کوئی گیت گا رہے ہیں۔ شاید کہہ رہے ہیں۔

دھرتی ...... تیرے سینے سے ابلنے والا سونا

ہمارے خون پسینے کا جادو ہے۔

سورج کا تازہ لہو افق پر پھیل گیا ہے۔

رات آنے والی ہے، رات آگئی ہے۔ لوگ اونگھ رہے ہیں۔

بھیڑ بہت زیادہ ہے اور ہر شخص سونے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن میرے چند

ساتھی تاش کھیل رہے ہیں۔ ایک ساتھی جس کی ابھی مسیں بھیگ رہی ہیں اتنی بڑی بڑی آنکھوں سے، پلک جھپکائے بغیر، باہر اندھیری رات کی وسعتوں میں اپنے سپنوں کو تلاش کر رہا ہے۔ وہ مسکراتا ہے اور اپنے ہونٹ بھینچ لیتا ہے۔ شاید وہ پہلی مرتبہ اتنے لمبے سفر پر جارہا ہے۔ اس کی آنکھیں آنے والے کل کا خواب دیکھ رہی ہیں، تب ہی وہ اتنا پھیل گئی ہیں۔ پریتوش نے اپنی کتاب اور آنکھیں بند کرلی ہیں۔ وہ گارہا ہے۔ میں اس کی روح کی آواز سن رہا ہوں۔

تم انتظار کر رہی ہو۔
پر طوفان کے پر الٹی سمت اٹھائے لیے جارہے ہیں مجھے۔
تم جل رہی ہو ہجر کی آگ میں
لیکن مرے سانس کی شبنم جلد ہی
نم کردے گی تمہارے جلتے ہوئے ہونٹوں کو۔

چاند کا رنگ پھیکا ہو گیا ہے۔ اندھیرا مٹ رہا ہے۔ گاڑی کے ڈبے میں زندگی نے ایک ہنگامہ پیدا کردیا ہے۔ کوئی کھانس رہا ہے، کوئی سورج کے سامنے سر جھکائے ہوئے آنکھیں بند کئے آہستہ آہستہ ہونٹ ہلا رہا ہے۔ میرے ساتھی کھڑکیوں سے باہر جھانک رہے ہیں۔ کھیت، جنگل، چشمے، گاؤں، مویشی، دیہاتی عورتیں، گھونگھٹ نکالے، گاگر کمر پر اٹھائے ...... سب ہوا کے زوردار جھونکوں میں اڑتے چلے جارہے ہیں۔ دن اسی طرح گزرتا ہے، اسی طرح افق پر سورج کا خون پھر پھیلتا ہے، جنگل سائیں سائیں کرنے لگتے ہیں ...... یہ ہوا وہ ہوا نہیں جو ہر بار گزرتے ہوئے برسات کا گیت سناتی ہے۔ زمین کا رنگ بھی سردی سے سرخ، سرخ سے سنہرا ہوتا جاتا ہے۔ ریت اڑتی ہے اور اندھیرے میں چھپ جاتی ہے۔ ساتھی تاش کھیل کر تھک چکے ہیں۔ کتابیں اور رسالے ختم ہو چکے ہیں۔ گپوں اور لطیفوں کا خزانہ بھی خالی ہو چکا ہے۔ گاگا کر لوگوں نے اپنی آواز بٹھالی ہے میرے سینے میں ایک درد اٹھتا ہے میں اپنے ہم سفر ساتھیوں کی طرف دیکھتا ہوں۔ سب خاموش ہیں اور ان کے چہرے بھی

چغلی کھا رہے ہیں، اُس درد کی جو میرے سینے میں آگ لگا رہا ہے۔ یہ درد ہے اپنے پرایوں سے دوری کا۔ اپنے شہر اور گاؤں سے بچھڑنے کا، اپنے رومانوں اور محبوبوں سے دور ہوتے چلے جانے کا۔ اب ہماری تعداد بڑھ گئی۔ دوسرے کئی اسٹیشنوں پر سے لوگ ہمارے ساتھ آگئے ہیں۔ اور انہیں کسی ان دیکھی طاقت نے ہمارا گہرا دوست بنادیا ہے۔ ان دوستوں میں بڑا جوش ہے، بڑی طاقت ہے، بڑی آگ ہے۔ یہ سب ہر لمحہ اپنی موت اور دھرتی کی آواز کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ خون دے کر جو چیز حاصل کی جائے بڑی قیمتی ہوتی ہے۔ اس قیمتی چیز کے تصور سے ہی ان کے چہرے دمک اٹھتے ہیں۔ لیکن وہ تھک چکے ہیں۔ سفر نے نڈھال کر دیا ہے۔ ان کے کپڑے سیاہ ہو چکے ہیں لیکن رات ان کپڑوں سے زیادہ سیاہ ہے۔

ہم اسٹیشن بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اس چھوٹے سے گاؤں میں ٹھہر گئے ہیں۔ اندھیرے کو تین چار چراغ داغ دار بنا رہے ہیں۔ ہمارے آس پاس بچے، عورتیں اور مرد جمع ہو گئے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں...... ان میں کوئی پری چہرہ نہیں ہے...... نہ کوئی غمزہ و عشوہ و ادا ہے۔ کالے کالے لوگ، جوان اور بوڑھی عورتیں اور دبلے پتلے چھوٹے چھوٹے حیران بچے...... ننگے، قریب آتے ہوئے سے اور دور جاتے ہوئے سے...... ہم منہ دھو رہے ہیں، نہا رہے ہیں۔ تھکن آہستہ آہستہ چھلکے کی طرح اتر رہی اور اب ہم قہقہے لگا رہے ہیں بحثیں کر رہے ہیں، کچھ لوگ ایک جگہ اس طرح بیٹھ گئے ہیں جیسے ان کا سفر ختم ہو گیا ہو۔ ان میں سے ایک نوجوان کی داڑھی، گھنی پلکوں اور بھاری پگڑی کے بیچ دو سحر انگیز آنکھیں چمک رہی ہیں۔ وہ پانچ دریاؤں کے دیس سے آیا ہے، ان پانچ شہ رگوں کی دھرتی سے جن کو چاقو سے کاٹا نہ جاسکا۔ وہ بہت اچھا گاتا ہے۔ میں اس کی زبان سمجھ نہیں سکتا۔ لیکن جب وہ جلیانوالہ باغ کا نام لیتا ہے تو میرے کانوں میں گولیوں کی بوچھار کی آواز ابھرنے لگتی ہے اور نگاہوں میں خون کے پانچ دریا، جن میں ہیر رانجھے اور مرزا صاحبان کا عشق بہہ رہا ہے، ابھر آتے ہیں اور بڑی بڑی سیاہ چٹانوں کو بہالے جاتے ہیں۔ میرے دل میں ایک عجیب قسم کی گرمی پیدا ہوتی

ہے ایسی گرمی پہلے تو کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی، مین ٹائیفائیڈ کا شکار ہوا تھا جب بھی نہیں۔ کیا جلیانوالے باغ کے شہیدوں کے دل میں بھی ایسی ہی گرمی پیدا ہوئی تھی؟

"نیک آدمی!" پریتوش کا ہاتھ میرے کندھے پر جم گیا ہے، جس طرح تھکا ہوا پرندہ طوفانی جھونکوں میں ہلتی ہوئی شاخ پر بیٹھ جاتا ہے۔ "دیکھتے ہو شرارت۔ اب ہمیں کوسوں پیدل چلنا ہوگا۔ یہاں سے کوئی سواری نہیں ملے گی۔ رکاوٹ، رکاوٹ، رکاوٹ"

"یہ بہت برا ہوا" میں کھڑا ہو گیا۔

"برا ہوا تو ہونے دو۔ ہم بھی دیکھیں گے چڑھتے دریا کو تنکے کیسے روکتے ہیں؟"

رات اندھیری ہے آسمان پر ستاروں کا غبار جھلملا رہا ہے۔ جنگل کے درختوں میں ہوا چیخ رہی ہے۔ فضا مٹی کی سوندھی خوشبو سے بسی ہوئی ہے۔ بھیگے ہوئے درخت تالاب سے نکلتی ہوئی عورتوں کے بال کی طرح چمک رہے ہیں۔ پتھر، نالے، گھاس، جھاڑیاں، سب ہمارے منہ چومتے ہیں اور آگے بڑھتے ہوئے قافلے کو حیرت بھری نظروں سے گھورتے رہ جاتے ہیں۔

یہ کتنا عجیب قافلہ ہے اور اس میں کیسے کیسے لوگ ہیں، دھوتی کرتے میں، شلوار اور قمیض میں، پتلون اور بش شرٹ میں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بن گئی ہیں۔ ان ٹولیوں میں زور زور سے گپیں ہانکنا جاری ہے۔ بعض ٹولیاں گیت گا رہی ہیں۔ یہ قہقہے اور گیت دلدل پر سے یوں گزر رہے ہیں جیسے سیب میں سے چھری کی دھار......

میں نے پریتوش کا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ وہ اپنا بڑا سا تھیلا کندھے پر رکھے ہوئے ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں وہ بہت دور سے اسی طرح چلا آرہا ہے۔ یعنی اس کا شانہ دکھ رہا ہوگا۔ خود میرا ہاتھ دکھ رہا ہے میں اپنی گٹھڑی دوسرے ہاتھ میں لینا چاہتا ہوں۔ لیکن دوسرا ہاتھ پریتوش کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا ہاتھ بہت گرم اور مضبوط ہے۔ آگے پیچھے، شانہ بہ شانہ سائے گزر رہے ہیں۔ بولتے اور ہنستے ہوئے سائے ......اور پریتوش خاموش ہے اور سوچ رہا ہے۔ کیا سوچ رہا ہے؟ شوبھا...... مایوسی...... کل......! میں نئی

نئی زبانیں سن رہا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ چند جیالوں کا قافلہ نہیں ہے جو سقراط کی طرح موت کا جام پینے کے لیے بڑھ رہے ہیں۔ اس قافلے میں تو سارا ہندوستان چل رہا ہے...... گیت گاتا ہوا پیار اور قربانی کی کہانی سناتا ہوا۔

منزل دور تھی اور رات اندھیری۔ ستاروں کی آنکھیں جھلکنے لگیں۔ لیکن زمین کے ستارے اسی طرح گیت گاتے ہوئے دلدل اور جنگل سے گزرتے رہے۔ اور لو یہ گاؤں بھی آگیا۔ ہماری منزل آگئی ہے۔

صبح ہونے والی ہے۔ ہوا ایک پراسرار گیت گا رہی ہے۔ اس میں ہوا میں چنگاریاں سی اڑ رہی ہیں نیند کی سرحد سے ہم بہت آگے نکل آئے ہیں۔ اور ہم اس سرحد کی طرف لوٹ نہیں سکتے۔ ہمارے قدم جب بھی اٹھیں گے آگے کی طرف اٹھیں گے۔ صبح کی روشنی کے ساتھ ہم اس اندھیری سرحد کو پار کر جائیں گے، جہاں اس وقت ہمیں آسیبی سایوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔

لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ہم اپنے بنگال سے سینکڑوں میل دور نکل آئے ہیں۔ لیکن یہ پورا گاؤں بنگال کیسے بن گیا ہے۔ عورتیں ہمارے لیے کھانا اور پانی لا رہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں منزل کوسوں دور ہے۔ اور بھیانک طوفان آنے والا ہے ایسے میں ہم اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بھوکا پیاسا کیسے جانے دیں۔ ان کی معصوم آنکھوں نے ہمیں اپنی پناہ میں لے لیا ہے، لو اب بجھاؤ چراغ۔ ہاہاہا! لیکن یہ چراغ پھونکوں سے بجھنے والے نہیں۔ یہ چراغ گا رہے ہیں اور ناچ رہے ہیں۔ صبح کی پہلی کرن ایک مقدس تہوار کا اجالا لائے گی۔ اس کا خیر مقدم ناچ کر، گا کر، اپنی روح کے تمام پھول کھلا کر ہی کیا جا سکتا ہے۔

میرا خون گنگنا رہا ہے اور میں پریتوش سے بات کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ چراغ کی روشنی میں کچھ لکھ رہا ہے۔ اس کے ہونٹ کھلے ہوئے ہیں اور چہرہ کسی اندرونی نشاط سے دمک رہا ہے، جیسے وہ ساری دنیا کی مسرتوں کو اپنے دل میں چھپا لے گا۔

جب وہ چراغ کی پھڑپھڑاتی لو کو دیکھنے کے لیے سر اٹھاتا ہے تو مجھے دیکھ کر ایک بڑی شرمیلی سی مسکراہٹ اس کے بند ہوتے ہوئے ہونٹوں میں دب کر رہ جاتی ہے۔

"چوری پکڑی گئی دوست!" میں زور سے قہقہہ لگاتا ہوں۔ اتنا زوردار قہقہہ تو میں نے پہلے نہیں لگایا تھا۔

چراغ بجھ گیا۔ دوستوں نے نہا کر کپڑے بدل لیے۔ اپنے سب سے اچھے کپڑے۔ برات کی تیاری دھوم دھام سے ہو رہی ہے۔ شیو کرنے کے بعد پریتوش کا رنگ اور نکھر گیا ہے۔

"یار تم تو آج......دولھے کی طرح خوبصورت نظر آرہے ہو۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ میری دلہن شوبھا کو میرا انتظار ہے اور میں......" وہ آہستہ سے ہنستا ہے۔

لوگ باہر قطار بنا کر جمع ہو گئے ہیں۔ پندرہ اگست کا سورج بہت شوخ ہے۔ درختوں کی ہریالی پر بہار آگئی ہے۔ ہوا زیر لب گا رہی ہے اور گاؤں کی عورتیں تھالی میں پھول لیے کھڑی ہیں۔ ہم ان کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ پریتوش کے بعد میرے ماتھے پر روبی کا تلک لگا دیا گیا ہے۔ اور میں آگے بڑھ رہا ہوں اور ایک بوڑھی عورت کی آواز بار بار ایک چشمے کی طرح میرے دل سے ابل رہی ہے "میرے تین بیٹے بدیسیوں کی گولی کھا کر مر چکے ہیں۔ میں کتنی خوش نصیب ہوں، میرے بیٹوں کا قافلہ قاتلوں کی قبر کھودنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔"

یہ ایک خیال ہے یا تلوار جو اچانک بے نیام ہو گئی ہے...... کیا سورج کی کرنیں مجھے آخری بار چوم رہی ہیں؟ کیا درختوں کی چمک پھر نظر نہ آئے گی؟ کیا میں ہوا کے گیت پھر نہ سن سکوں گا؟ اور یہ عورتیں، یہ عورتیں......"

پریتوش پلٹ کر مسکراتا ہے۔ اس کے لب ہلتے ہیں لیکن میں سن نہیں سکتا۔ میرے کانوں میں ہزاروں پروں کی سنسناہٹ ابھر رہی ہے۔ چند لمحے اور، چند لمحے اور...... یہ نعرے اور گیت یہ پرچم اور مٹھائیاں سب سرحد پار ہوں گے۔ سرحد پار ایک خاموش گاؤں ہے۔ جھونپڑے خاموش ہیں۔ شاید انہی میں کوئی اسکول ہو۔ شاید انہی میں کوئی ڈاک خانہ ہو۔ سب کی رگیں تن گئی ہیں۔ آنکھوں میں ایک آہنی عزم ہے۔

قافلہ آگے بڑھ رہا ہے۔ مٹھیاں اور بھی تن گئی ہیں۔ رگیں اور بھی ابھر ائی ہیں۔ اور ہمارے سینے سے گونج کر نکلتی ہوئی گرج کتنی پاٹ دار ہے۔ درختوں پر سے چڑیاں اڑ گئی ہیں۔ کبوتروں کا ایک جھنڈ ہمارے سر پر سے گزر گیا ہے۔ اور ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور اب ہر چیز میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گئی ہے۔ میں صرف خاکی وردیوں میں کتے کی طرح دو ٹانگوں پر بیٹھے ہوئے پرتگالی سپاہیوں کو دیکھ رہا ہوں۔ ان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو سور کی طرح منہ جھکا کر دیکھتے ہیں اور پھر وہ اچانک پتھر کی طرح سخت ہو جاتے ہیں۔ ہوا اور سنک گئی ہے۔ دھوپ ڈھل کر گرم ہو گئی ہے اور میں اب کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ میری نگاہوں میں ایک نہیں کئی جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ کئی جھنڈے ہیں اور درختوں کے جھنڈ ہیں، جھاڑیاں ہیں اور ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہم بھاپ کے دریا میں گزر رہے ہیں...... ایک چہرہ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ یہ اُسی داڑھی اور پگڑی والے نوجوان کا چہرہ ہے جس کی آنکھیں جل رہی ہیں جواب شاید ہیر رانجھے اور مرزا صاحبان کے عشق کی داستان سنا رہی ہیں۔ نعروں کے بیچ سے ایک گیت ابھرنے لگا ہے۔

کیا یہ گیت، ان دو جلتی ہوئی آنکھوں سے پھوٹ رہا ہے؟

یکایک درختوں میں ایک قہقہہ پھڑ پھڑا کر سو گیا۔ دو تین جھنڈے ہوا میں پرندوں کی طرح پر تول کر ذرا جھک سے گئے۔ ٹھیک اس وقت مجھے پریتوش نظر آیا۔ اس نے جھپٹ کر سکھ نوجوان کے ہاتھ سے جھنڈا لے لیا تھا۔ ہم سب زمین پر لیٹ کر رینگ رہے تھے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اور پھر ایسا معلوم ہوا کہ ٹڈی دل پکی ہوئی فصل پر ٹوٹ پڑے ہیں...... درخت کے پاس پرتگالی سپاہی کرسی پر بیٹھا مشین گن کی لبلبی دبا رہا تھا۔

یہ جنگ ایک گھنٹے سے بھی کم جاری رہی ہے۔ لیکن ایک صدی، کئی صدیاں گزر گئی ہیں...... زخمیوں اور شہیدوں پر گاؤں کی عورتیں آنسو بہا رہی ہیں۔ اور بچے بوڑھے پھول نچھاور کر رہے ہیں۔

تیز دھوپ سے میری آنکھوں میں اندھیرا چھارہا ہے۔ پریتوش گھاس پر لیٹا مسکرارہا ہے اس کا خون میں نہایا ہوا سینہ پھولوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ سفید پھولوں میں سے کون جھانک رہا ہے۔ اس کی آنکھیں نیم وا ہیں۔ اور پیشانی پر خون کے ستارے چمک رہے ہیں۔

میں اس کی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالتا ہوں جو خون میں رنگ گیا ہے اور پنسل کی تحریر نہیں پڑھی جاسکتی۔ بس اتنا نظر آتا ہے...... "صبح بڑی خوبصورت ہے اور میرا دل تمہاری یاد کے رس میں ڈوبا ہوا ہے...... سفر......اور انتظار......"

میری آنکھوں میں اندھیرا چھارہا ہے اور اس اندھیرے میں لہو کے چراغ جل رہے ہیں۔ ایک نہیں، دو نہیں کئی...... چراغوں کا یہ کارواں آگے بڑھ رہا ہے۔

پھر میں اسی شہر میں واپس آگیا ہوں۔ اپنے دیار میں وہی دریا موجزن ہے۔ اس کے سینے پر ڈوبتے سورج کی قوس قزح اسی طرح ناچ رہی ہے۔ ملاح گارہے ہیں۔ اور میں آہستہ آہستہ شرنارتھیوں کی بستی کی طرف جارہا ہوں۔ رفتہ رفتہ سارا شہر اندھیرے میں غرق ہو گیا ہے۔ لیکن آج میں کتنا اکیلا ہوں۔ اور میرا دل پھر اداس ہے۔ لیکن اب کے اس اداسی میں ایک آگ سی دہک رہی ہے۔

پریتوش کی کٹیا میں اندھیرا ہے۔ دروازے پر میرے قدم جم گئے ہیں۔ کٹیا کا دروازہ کھلتا ہے۔ ماسی دروازہ کھولتی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک لالٹین کانپ رہی ہے۔ وہ خاموش کھڑی مجھے دیکھ رہی ہیں۔ ان کے آنچل میں کنجیوں کا گچھا اسی طرح لٹک رہا ہے۔

"بیٹے......" یہ آواز درختوں میں پھنسی ہوئی ہوا کی چیخ تو نہیں۔

میں اخبار نہیں کھولتا ہوں۔ پریتوش کی خون میں ڈوبی ہوئی سرخ قمیض بوڑھے ہاتھوں میں اٹھ رہی ہے۔ ماسی کے ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہے ہیں۔ جیسے خون میں ڈوبی ہوئی قمیض بہت بھاری ہو، جیسے وہ پریتوش کا جسم ہو۔ اور یہ پریتوش کی بنائی ہوئی ٹیگور کی ادھوری تصویر ہے لگتا ہے بوڑھے شاعر کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑیں گے۔

اور یہ خط ہے جس سے ادھ کھلے پھولوں کی خوشبو آ رہی ہے۔

''یہ کیا ہے؟''

''شوبھا کے نام پریتوش کا خط''

ماسی کی آنکھیں چمک اٹھی ہیں۔

''صبح بڑی خوبصورت ہے.........اور میرا دل تمہاری یاد کے رس میں ڈوبا ہوا ہے......سفر......اور انتظار......''

اور اب قمیض اور خط کا عکس ماسی کی بوڑھی آنکھوں میں گھل رہا ہے۔

اور اب ان آنکھوں میں لہو کے چراغ جل رہے ہیں۔ اور جب میں اندھیرے میں پلٹ رہا ہوں تو دور سے اپنے دوست کی آواز آ رہی ہے۔

''تم انتظار کر رہی ہو۔

پر طوفان کے پر الٹی سمت میں اٹھائے لئے جا رہے ہیں مجھے۔

تم جل رہی ہو ہجر کی آگ میں۔

لیکن میرے پیار کی شبنم جلد ہی

نم کر دے گی تمہارے جلتے ہوئے ہونٹوں کو!''

○○

ڈوبے چاند کی خوشبو

۵

روشنی کی جھیل پیچھے رہ گئی ہے اور چھتنار درختوں کے سائے اس میں ڈوب گئے ہیں۔
جہاں اندھیرا پھیلا ہوا ہے، وہیں میری زندگی کا کھنڈر ہے۔ وہیں میرا بسیرا ہے۔
اور میں چپ چاپ روشنی کی جھیل میں، جو یہاں سے دھندلی دھندلی نظر آتی ہے، اپنے آپ کو ڈوبتے دیکھ رہا ہوں۔

منڈیرے سے پرے چاند ڈوب چکا ہے۔ لیکن کالی ہواؤں میں، جو دکھائی نہیں دیتیں، چاند کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔

اور میں سب کچھ بھول چکا ہوں۔

پو پھٹے دبے پاؤں چلنا کہ آہٹ سے کسی کی آنکھ نہ کھلے۔ کھانسی آئے تو منہ پر ہتھیلی رکھ لو تاکہ سناٹے میں شکن نہ پڑے۔ جوتے اٹھاؤ اور دبے پاؤں کچن میں چلے جاؤ۔ برش نہ مارو، اس کی گھس گھس بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ لگتا ہے کوئی جنگل میں بوڑھے درخت کو کاٹ رہا ہے۔

چائے؟ چائے تو کینٹین میں بھی مل سکتی ہے۔ اور میں اسکوٹر کو دھکیلتا ہوں، گیٹ کے باہر۔ یہاں اسٹارٹ کروں گا تو سب کی آنکھ کھل جائے گی۔ "ارے بھئی مجھے سونے بھی دیں گے یا نہیں۔" "یہ آدمی سنائل ہو گیا ہے...... سنکی، ضدی! کیا اسکوٹر گیٹ کے باہر نہیں اسٹارٹ ہو سکتی؟" ہو سکتی ہے بھائی، ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے ہینڈل پر رات بھر اوس برستی رہی ہے اور میرے دستانوں میں سوراخ ہو گئے ہیں۔

ٹھنڈی اوس میری ہتھیلی کو بھگو رہی ہے اور میرے دانت بج رہے ہیں۔ کیا دانت بھی بجنے بجانے کی چیز ہے؟ میں سچ مچ سٹھیا گیا ہوں۔

ذرا رکیئے، ذرا رکیئے۔ دیکھئے ناپانچویں منزل پر دفتر ہو تو یہی ہوتا ہے۔ سانس پھول جاتی ہے۔ اوپر چڑھتے چڑھتے۔ جی ہاں دفتر بھی پرانا ہے اور عمارت بھی۔ اور ہوا یہ کہ راستے میں چالان ہو گیا۔ لال بتی جل رہی تھی اور جاڑے کی ہواؤں سے آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ آپ جانتے ہیں اسکوٹر ہوا سے بات کر رہی ہو اور آنکھوں میں آنسو جم گئے ہوں تو لال بتی بھی ہری نظر آسکتی ہے۔ نہیں نہیں بات ساون کے اندھے کی نہیں۔ صاحب نظر کا دھوکہ کسے نہیں ہوتا۔ جی آپ کا کمرہ بڑا گرم رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ڈانٹ پلاتے رہیں۔ یہاں اس بہانے سے ہاتھ سینکنے کا موقع مل جاتا ہے۔ نہیں صاحب اب بھلا لیٹ ہونے کا کیا سوال ہے۔ کل سے دیکھئے گا۔

مائی گاڈ...... عورتیں ٹائپ کر رہی ہیں یا مشین گنیں چلا رہی ہیں!

وہ لوگ اب اٹھ گئے ہوں گے۔ نہانے کا پانی ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔ پھر دوبارہ پانی گرم کرنے کا حکم جاری ہوا ہو گا۔ بیڈ ٹی بھی ٹھنڈی ہو چکی ہو گی۔ اور توست مکھن بچوں نے کتے کو کھلا دیا ہو گا۔ تب ہی تو وہ خبیث ان کی ہر ادا پر دم ہلاتا ہے اور مجھے دیکھ کر پلنگ کے نیچے چھپ جاتا ہے۔ اب مزے میں گھر میں قہقہے گونج رہے ہوں گے اور رات کی ٹی وی فلم پر بحث ہو رہی ہو گی۔ کیا جسم ہے صاحب ہیرو کا، جاپانی ربڑ کا بنا ہوا دکھتا ہے۔ درخت سے لپٹ کر گاتا ہے تو لگتا ہے درخت گا رہا ہے اور وہ درخت کی شاخ بن گیا ہے۔ صاحب ہوا بہت تیز ہے لیکن اگر ہیرو پردے پر گا رہا ہو تو اسے سردی تو لگتی نہیں۔ یہی اس کے گڈ ہیومر کا راز ہے۔ پھر سامنے والے درخت کے گرد ایک ہیروئن بھی تو شعلے کی طرح لپکتی ہے۔ اب بھلا ایسے میں سردی لگے تو کیسے؟ جاڑا تو صاحب ہما شما کے لیے ہے کیوں کہ ہم تو ٹی وی اسکرین کے باہر جیتے ہیں۔

جی ہاں آپ کی کیبن کے باہر میری میز پر بہت سے کاغذات رکھے ہیں۔ ان کو چیک کرتا ہوں۔ امید تو یہی ہے صاحب۔ آج کی ڈاک سے کوئی بھاری آرڈر آئے گا۔

نہیں صاحب کوئی آرڈر مس نہیں ہوگا۔ آج تک کبھی ایسا ہوا ہے۔ دیکھئے دفتر پہنچتے ہی میں بدل جاتا ہوں۔

I become a picture of selfconfidence!

گھر کی بات چھوڑیئے۔ ہاں سب مجھ سے بہت بے تکلف ہیں۔ جی ہاں بچے بھی، بچوں کے بچے بھی اور ان کا چہیتا کتا بھی۔

ارے گپتا جی آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اب اگر ذرا سی غلطی ہو گئی تو اس پر اتنا ہاتھ ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھا اچھا، سردی بہت بڑھ گئی ہے۔ میں سمجھا آپ پچھتا رہے ہیں اور ہاتھ مل رہے ہیں۔ اچھا اچھا تو آپ پچھتا رہے ہیں۔ گپتا جی، پچھتانے کی بھلا کیا بات ہے اس میں۔ تھوڑا سا افسوس کر لیا سو ٹھیک ہے۔ دیکھئے ناجینے کی فرصت ہی نہیں۔ عجیب زمانہ ہے، ایسے میں ایک چھوٹی سی غلطی پر اتنا ہاتھ ملنا، چاہے جاڑا کتنا ہی کڑا کے کا پڑ رہا ہو، بالکل بے کار ہے۔ ہاں زندگی میں نمک برابر افسوس تو ضروری ہے۔ بس جائیے۔ غلطی حساب میں نہیں ہو گی تو اور کاہے میں ہو گی۔ نہیں نہیں میں صاحب سے کہہ دوں گا۔ لیکن اگر آپ ذرا چوکس رہیں تو اچھا ہے۔ پنشن سے پہلے ایک چھوٹی سی بات پر پتہ کٹ جائے تو...... ہاں ہاں، میں یہی کہہ رہا تھا۔ گھوڑا اصیل ہو تو اشارہ کافی ہے۔ چابک تو محض اسٹائل کے لیے ہے ورنہ۔ جی ہاں، جی ہاں۔ ہاں بس خیال رکھئے گا، پھر چوک نہ ہو۔

فائل، پنسل، کاغذ۔

جھوٹ اور جھوٹ، شو اور شو۔ کچھ رعب، کچھ دھمکی، پھر لنچ، پھر سہ پہر کی چائے، پھر چھٹی۔ پھر وہی اسکوٹر، پھر ڈھلتے سورج کی نارنجی دھوپ میں، بھاگتے سایوں کے درمیان پہیوں کی رفتار اور گھر کا راستہ۔ دوری اور کم، اور کم۔

اچھا تو آپ آگئے۔ ارے بابا، ذرا کتے کو ٹہلا دیجئے۔ His dying for your company ہاں ہاں ضرور۔ کانٹے دار تاروں کی باڑ کے ساتھ ساتھ، جن پر ہری بیلیں لپٹی ہوئی ہیں، میں کتے کو ٹہلا رہا ہوں۔ یا شاید وہ مجھے ٹہلا رہا ہے۔ زنجیر میرے

ہاتھ میں ہے۔ لیکن ٹہلا وہی رہا ہے۔ یہ بھی ایک طرح سے نظر کا دھوکا ہے۔ کب سے جانے کب سے یہی ہو رہا ہے۔ زندگی کتے کی طرح مجھے ٹہلا رہی ہے۔ اور میری زنجیر اس کے ہاتھ میں ہے۔

آہستہ آہستہ ہری بیلوں کے اس پار سڈول بدن والے سفید پیڑوں کے آگے، اونچی شاخوں پر بہت بڑا چاند پھول کی طرح کھل رہا ہے۔ دھند چھٹ رہی ہے اور چھٹتی دھند سے چاندنی چھن رہی ہے۔ پھواروں کی طرح درختوں کے جھلملاتے پتوں، شاخوں اور تنے بدن کو بھگو رہی ہے۔ میں ایک چھوٹے سے پتھر پر بیٹھ گیا ہوں اور کتا میرے آنسو چاٹ رہا ہے۔ اور میں حیران ہوں۔ میں نے اس کو کچھ نہیں دیا۔ نہ لگاؤ نہ دیکھ ریکھ، نہ لمس، نہ چمکار، ...... اور اب دیکھو اس کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ میرے آنسو چاٹ رہا ہے۔ اور میں جانتا ہوں میری زندگی کا سارا نمک ان ہی آنسوؤں میں ڈھل کے آ گیا ہے۔

اور اب سب کچھ روشنی کی جھیل کے اس پار ہے۔

شہر، جزیرہ، مرغزار، پہاڑ، وادی، کھیت اور چشمے، سب نظر سے اوجھل۔ بس ایک جھیل ہے یادوں کی، یا شاید خوابوں کی، جگمگاتی، کچھ صدائیں جو گونج گونج کر سو گئیں، اسی جھیل میں ...... کچھ ہوائیں، کچھ ہوائیں جو جھیل کے پگھلے شیشے پر تیر تیر کر تھم گئی ہیں۔ میری آنکھیں کھلی ہیں اور میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ اور لگتا ہے میں جھیل میں کبھی جیا ہی نہیں۔ جب سے اپنے آپ کو جانا ہے، اسی کھنڈر میں ہوں، چمگادڑ کی طرح، کبھی کھنڈر کی اس دیوار سے ٹکراتا ہوں، کبھی اس دیوار سے ٹکراتا ہوں۔

گھٹو، چپ چاپ مرو، چپ چاپ!

کھنڈر آخری پڑاؤ ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔ یادوں کا چاند بھی نہیں جس کی خوشبو میں اس وقت میں جی رہا ہوں۔

کتنی دیر، یہ کون جانتا ہے!

○○

آہٹ

۶

کون ہو بھائی؟ کوئی نہیں۔ پھر یہ قدموں کی چاپ کیسی۔ خیر میری بلا سے۔ کب سے چڑھ رہا ہوں شام کے زینے پر۔ پر اوپر والی منزل آتی ہی نہیں۔ نہیں یہ چاپ نہیں، یہ تو میری سانس ہے۔ اور تم؟ تم کون ہو بھائی؟ کوئی نہیں۔

سانس پھول رہی ہے۔ جیسے جیسے اوپر چڑھتا ہوں۔ گلے میں کانٹے پڑتے جاتے ہیں۔ کیا کروں بھائی۔ چڑھنا تو ہے ہی۔ اور نہیں تو کیا رات مکڑی کے جالوں میں کاٹوں گا۔ ویسے مکڑی کی راتیں جالوں میں کٹ سکتی ہیں تو میری کیوں نہیں کٹ سکتیں؟

اب دروازہ دور نہیں ہے۔ یہاں سے زینہ ختم ہوتا ہے اور رات کا دروازہ کھلتا ہے۔

دن بھر روشنی بند، ہوا بند، میں بند۔ آوازیں بند، نظر بند، تبھی تو میں دن کی تلاش میں باہر نکل جاتا ہوں۔ مگر وہاں بھی، شہر میں، اتنا ہی اندھیرا ہے۔ گلیاں بند، رفتار بند، ہونٹ بند، لمس بند، ایک تھکن ہے جو آزاد ہے۔ رسنے کے لیے، زخم کی طرح۔ چبھنے کے لیے کانٹوں کی طرح۔

YOU'RE SUCH A LOUSY BORE!

تمہارے قدموں کی چاپ بہت قریب آ گئی ہے۔ اور میرے جسم میں کپکپی سی دوڑ رہی ہے۔ ریڑھ کی ہڈی نہیں ہے۔ کپکپی تو ہے۔ سچی بات کہوں؟ مجھے ریڑھ کی ہڈی کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں نے کہا تھا ریڑھ کی ہڈی۔ ایک ہی بات ہے۔

موم بتی۔ موم بتی۔ رکھی تو یہیں تھی۔ کھڑکی پر۔ پھر گئی کہاں۔ اوہو کہیں اور

رکھ دی ہو گی۔ اب میں کتنی دیر کر سیوں، کتابوں، چوہے دان، بوٹ پالش کی ڈبیہ، فولڈنگ بیڈ وغیرہ سے ایک ایک کر کے ٹکراتا رہوں۔ نہ یہ اندھیرا جائے گا نہ یہ چیزیں اور موم بتی ملے گی۔

اچھا چھوڑو۔ موم بتی بعد میں ڈھونڈتے رہیں گے۔ ابھی جوتے اتاروں جن کے تلوے گھس گئے ہیں۔ اور پاؤں میں پسینے سے بھیگے ہوئے موزے چپک رہے ہیں۔ اور سڑک کی دھول کر کراہی ہے۔ موزوں کے اتارتے ہی کمرے میں پسیجتے پیروں کی بو پھیل گئی ہے۔ سو تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ چوہے...... بھلا یہ کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو۔ ڈھیٹ۔ چڑھ گئے پیروں پر۔ تھوڑی دیر میں یہ میرے تھیلے میں گھس جائیں گے اور روٹی کھا جائیں گے جو میں نہ جانے کتنی دور سے ادھار لایا ہوں۔ مل گئی، مل گئی۔ ماچس تو خیر سے پتلون کی جیب میں ہے۔ موم بتی کا اجالا بھی کیا چیز ہے۔ کباڑ میں بھی کیا رنگ بھر دیتی ہے۔

تھیلے سے نکالی ہوئی روٹی میں چمڑے کی بو بس گئی ہے۔ وہ تو بسے گی ہی۔ کاغذ میں لپیٹ کر رکھنا تھا۔ تنور والا لپیٹ رہا تھا پر وہ پان کی پیک جو نظر آ گئی کاغذ پر۔ سو کھی تھی تو کیا ہوا۔ کچھ تو ہائیجین کا خیال ہونا چاہئے۔ روٹی، ٹماٹر، پیاز کا ایک ٹکڑا اور چھوٹی سی تیتی ہری مرچ۔ مجھے یاد ہے شب برات میں مرَ بّا ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ جو میرے ہاتھ میں پھٹ گیا تھا اور ہتھیلی کی کھال چھلکے کی طرح اتر آئی تھی۔ بچپن بھی کیا چیز ہے۔ نہ جانے کتنی کھالیں اتر جاتی ہیں مگر چند دن میں پھر تازہ کی تازہ۔ اور اب ایک زخم لگ جائے تو مہینوں جھک مارتے رہو۔ وہ تو اس وجہ سے کہ تم تو تم ہو۔ مگر تم ہو کون جو اتنی بے تکلفی دکھا رہے ہو۔ سچ پوچھو تو میں کوئی نہیں ہوں۔ میں نہ بھی ہوتا تو تم ہوتے۔ اور اب اگر میں ہوں تو بھی تم ہو۔ پھر فرق کیا پڑتا ہے۔ YOU ARE RAVING۔ سو جاؤ۔ صبح ہو گی تو تم سب بھول جاؤ گے۔ میں کبھی کچھ نہیں بھولتا۔ میں یہ بھی نہیں بھولا کہ کل میں نے تم کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو تم کرتے ہی رہتے ہو۔ چوہے تھک کر کہیں چلے گئے۔ میں بھی کہیں چلے جانا چاہتا ہوں۔ بائی بائی! چوہو!

امر چو ہو! اب کیا ہو گا؟ وقت تو گزارنا ہی ہے۔ نیند ابھی آئے گی نہیں۔ کھڑکی کی چٹخنی کھلتی نہیں۔

پچھلے ایک مہینے سے یہی ہو رہا ہے۔ وہ بلاتا ہے اپنے ایئر کنڈیشنڈ روم میں۔ پائپ جلاتا ہے۔ تھوڑی دیر مجھے دیکھتا رہتا ہے جیسے میں کوئی بلی کا بکرا ہوں۔ پھر سر ہلائے گا اور ہنسے گا، سونے کے دونوں دانت جھلکائے گا اور پوچھے گا...... "آپ تو بالکل ہٹے کٹے ہیں۔ جایئے یہ لوگ یونہی آکر ایسی ویسی باتیں کرتے رہتے ہیں۔" "کون لوگ صاحب؟" میں سوکھے ہوئے گلے سے سوکھی ہوئی آواز میں پوچھوں گا اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمنے لگیں گی۔ وہ جلے ہوئے پائپ کو پھر سے جلانے کی کوشش کرے گا، سونے کے دانتوں کی نمائش کرے گا اور کہے گا: "آپ اپنی فائل وغیرہ تو نبٹا لیتے ہیں نارور؟" اور نہیں تو کیا۔ لیکن میں کچھ کہوں گا اور وہ اپنے چکنے ہونٹ چوسنے لگا اور پائپ سے مونچھوں پر تاؤ دے گا اور "جایئے! اپنا کام کیجئے۔ یہ لوگ بیکار ایک بوڑھے آدمی کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ان کو کیا معلوم اس بڈھے نے اپنی کمر کی ہڈی اس عمارت کی نیو میں گاڑ رکھی ہے۔ پکا ہوا آم جانے کب ٹپک جائے۔ پھر میں یہ گناہ اپنے سر کیوں لوں۔"

اور یہ سب اپنا قصور ہے۔ نہ میں اٹھارہ برس کی عمر میں سرسوں کے کھیتوں سے بھاگتا اور نہ آج پھانسی کے پھندے میں لٹکتا۔ کب تختہ پاؤں کے نیچے سے نکل جائے کون جانے۔ پر میں نہ بھاگتا تو اور کیا کرتا۔ اور جب سے اب تک بھاگ ہی رہا ہوں۔ جانے اس کا کیا ہوا۔ بڑی جان لیوا تھی۔ اور جو اس کی آنکھوں سے نہ ڈرتا۔ اور اس کا ہاتھ نہ چھوڑتا تو کیا وہ سچ مچ چیخ پڑتی۔ اماں چھوڑو۔ کون چیختا ہے کون ہاتھ چھوڑتا ہے۔ اور اب نہ سرسوں کے کھیت ہیں، نہ کوئل، نہ گھاس کو دھوتی ہوئی اوس، نہ منہ اندھیرے پیپل اور گولر کے پیڑوں پر چڑیوں کے گیت۔ دل میں بس ایک چڑیا ہے! ڈر سے کبھی اس کے پر پھیل جاتے ہیں، کبھی سمٹ جاتے ہیں۔ اور جب سے یہی ہو رہا ہے۔ کہیں نہ کہیں تو یہ سب ختم ہونا چاہئے۔ میں تھک گیا ہوں۔ چلتے چلتے تلوے گھس گئے ہیں۔ اور موزوں میں میرے پورے وجود کا پسینہ رچ گیا ہے۔ اور میں کل صبح پھر

یہی موزے نہیں پہننا چاہتا۔ نہ اس کوٹھری سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ جانے وہ پھر بلالے، پھر پائپ جلائے، پھر سونے کے دانت جھلکائے اور آخر میں وہ سنوں جو میں سننا نہیں چاہتا۔ "دیکھئے آپ کا ہم پر بہت احسان ہے۔ آپ یہاں تب آئے تھے جب پاپا زندہ تھے اور میں تب ایک کچا پودا تھا۔ اور اب میں درخت بن چکا ہوں اور اب مجھے کچھ اور چاہئے۔ آپ کی تھکن کے سوا اور کچھ ہے بھی تو نہیں آپ کے پاس۔" "سو تو ٹھیک ہے۔ پھر؟" "اب میں کیا کہوں؟" پھر اس کے سنہرے دانت چھلکیں اور وہ پھر پائپ کو دانتوں سے دبالے۔ کیا میں اس وقت کا انتظار کروں؟

نہیں نہیں۔

میں دھنسی ہوئی کرسی سے اٹھنا چاہ رہا ہوں۔ ٹھیک ہے میرے پاس نائٹ سوٹ نہیں ہے۔ لیکن میں ان کپڑوں میں تو نہیں سو سکتا۔ لیکن نیند کہاں ہے۔ چند قدم بھی چلتا ہوں تو اپنے ساتھ ساتھ قدموں کی آہٹ سنتا ہوں۔ سنو یا تو کوئی آکر مجھے دبوچ لے۔ یا میرا پیچھا چھوڑ دے۔

دیکھو، جب ایسا ہو کہ کمرے میں موم بتی جھلملانے لگے، جب چوہے بھی تھک کر سو جائیں۔ جب چمگاڈر بھی دیواروں سے ٹکرانا بند کر دیں اور اس اجنبی آہٹ کے سوا اور کوئی ساتھ نہ دے تو موم بتی کو وقت سے پہلے بجھا دینا چاہئے اور گیت گانا چاہئے، وہ گیت جو ابھی تک گایا نہیں گیا۔

ایسا تو ہے نہیں کہ میں نہیں جانتا کچھ
کہاں سے آیا ہوں اور جاؤں گا کہاں
رات کا پچھلا پہر ہے، اتنی کٹ چکی ہے
اور بھی کٹ جائے گی!
وہاں جہاں افق پر آگ کی مو افق
ایک جنگل سا اگ رہا ہے، وہیں کہیں،
کھو جاؤں گا میں، وقت تلاش کرے گا مجھے۔

پر ہاتھ نہیں آؤں گا میں
وقت کو مٹھی میں بند کرنے میں
کب کامیاب ہوا ہے کوئی!
وقت کوئی تتلی تو نہیں

وقت کیا ہے
آہٹ کے سوا
ٹوٹتی ہوئی آہٹ کے سوا!

اب میں نڈر تمہارے انتظار میں ہوں۔ میں نڈر اپنے انتظار میں ہوں۔ میری آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی ہیں۔ اور میرے ہونٹوں پر تمہاری گرم گرم آہٹ کا بوجھ پڑ رہا ہے۔ میری ٹانگیں بیساکھیوں کی طرح سخت ہو گئی ہیں۔ پھر آنکھیں کھل گئی ہیں اور موم بتی پگھل پگھل کر بوند بوند ٹپک رہی ہے۔ آنکھوں میں، جہاں پتلیوں میں لویں بجھ رہی ہیں۔ اور یہ سب کچھ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ مری ہوئی آہٹ کی طرح۔ شانت اور سبک۔ جینے کے احساس سے گریزاں۔ ○○

کچھ بھی نہیں

۷

گلابی سردیوں کی رات تھی، جنتا ایکسپریس کا ڈبہ ماچس کی نئی ڈبیہ کی طرح بھرا ہوا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ اگر کسی اسٹیشن پر قسمت سے ایک آدھ مسافر اترتا تو اس کی جگہ دو تین نئے گھس جاتے۔ نئے مسافر شروع میں تو کھسیائے سے، کیکڑوں کی طرح لوگوں کے سروں پر رینگتے، پھر گالیاں کھا کھا کر اور گھونسے دکھا دکھا کر کسی نہ کسی طرح فٹ ہو جاتے۔ جب گاڑی چلتی اور کھڑکیوں سے ہوا کے جھونکے آتے تو پرانے مسافروں کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا اور وہ صبر کر لیتے۔ جس طرح فیملی پلاننگ کی تمام الٹی سیدھی تدبیروں کے بعد آخر میں جڑواں بچے بھی کلیجے سے لگا لیے جاتے ہیں، ان ہی میں سے کوئی بیڑی کے کش اڑاتے ہوئے نو گرفتار پرندے سے پوچھتا۔

کہاں جاؤ گے ؟"

"ٹنڈلے۔"

"ٹنڈلے؟"

دوسرا مسافر گھٹے ہوئے سر سے میلی کچیلی گاندھی ٹوپی اتارتے ہوئے اتنے اچنبھے سے دوہراتا گویا کہہ رہا ہو۔ "ٹنڈلے؟ اماں یار ٹنڈلے بھی کوئی جانے کی جگہ ہے؟ جانا ہی تھا تو الہ آباد جاتے۔ امرود کھاتے، کاشی جاتے، گنگا اشنان کرتے، گیا جاتے، بودھ مندر کے درشن کرتے، کلکتے جاتے، ہوڑے کا پل دیکھتے...... لوگو! ذرا اس گدھے کے سینگ کو دیکھو...... اور کوئی جگہ مرنے کو نہیں ملی اسے۔ ٹنڈلے جا رہا ہے۔"

لوگوں کی ہنسی بھنبھناہٹ کی طرح ابھرتی اور رفتہ رفتہ قہقہوں میں بدل جاتی۔

"رام رام!......رام رام!۔" بوڑھا سادھو کونے میں اونگھ رہا تھا۔

دلیپ کے خشک ہونٹوں سے پھوٹتی ہوئی زہر بھری مسکراہٹ کی مدھم جوت اس کے زرد اور پچکے ہوئے چہرے پر پھیل رہی تھی۔ برابر بیٹھے ہوئے نوجوان کا نام منور تھا۔ وہ گہری سیاہ آنکھوں سے دلیپ کی عینک اور مسکراہٹ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

"عیسیٰ کا کمزور جسم بھی شاید اس مسکراہٹ کی طرح صلیب پر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہوا ہوگا......!" اس نے اپنے گھنے گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"اچھا بھائی یہ بتایئے اس سادھو کے من میں اس وقت کیا ہے؟"

سادھو نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"رام رام! سیتا رام!" اس کی ننگی رانوں کی جھریاں لرز گئیں۔

دلیپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے سادھو پر آنکھیں جمادیں۔ کھدر کی جیکٹ سے پائپ نکالا اور سلگا کر کش اڑانے لگا۔ اس کی کھوئی ہوئی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے گیروے رنگ کے کرتے کا دامن برابر کیا اور سر جھکا کر اپنا گھٹنا سہلانے لگا۔

"بھائی یہ تو کسی شریف آدمی کا گھٹنا ہے، بچے کا سر نہیں ہے۔" منور اپنے اس خیال پر ہنس پڑا۔ پھر اس کی ہنسی یکایک موم کی طرح جم گئی "منے کا سر اب کون سہلاتا ہوگا۔ میں اسے چھوڑ کر کیوں چلا آیا۔ جب ماں چھوڑ کر چلی گئی تو بھلا میں کون ہوتا ہوں۔ خیر جب نوکری مل جائے گی تو میں اسے بلالوں گا......اور اس کا سر سہلاؤں گا......ماں جائے جہنم میں......بے وفا کہیں کی......"

"دیکھ رہا ہوں۔ میں اس کے من کے اندر دیکھ رہا ہوں۔ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف روشنی ہے۔"

"اچھا؟" منور کے خیال کا تار ٹوٹ گیا۔ "روشنی؟"

سادھو نے اپنی جھولی سے چھوٹی سی چلم نکالی، اس میں گانجا بھرا، پڑوسی سے ماچس مانگ کر اسے جلایا اور اس پر چھوٹا سا باریک کپڑا لپیٹ کر پھک پھک دم لگانے لگا۔

"ہاں روشنی۔ اور یہ روشنی ایک مرتبان میں بند ہے۔"

"مرتبان میں۔"

"ہاں یہ انسان نہیں ہے۔ یہ ایک مرتبان ہے اور اس میں ایک میلا سا جال ہے۔ الجھا ہوا۔ اور جال میں روشنی، یہ لو مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ مجھے تو یہ سب کچھ نظر نہیں آتا۔"

"نظر نظر میں فرق ہوتا ہے۔ دیکھو بات یہ ہے کہ میں اسٹیج کا آدمی ہوں۔ بھائی یہ درخت چالیس سال پرانا ہے۔ کوئی مذاق نہیں ہے۔ دیکھو یہ چاندی کے تار۔ دیکھا؟ میں جسم کو نہیں دیکھتا۔ میری نظر جسم کے اندر دیکھتی ہے جس طرح "چھاؤں میں سورج کی کرن اترتی ہے......"

"پھر؟" منور نے جانے کیوں مسکراتے ہوئے چٹخارے کے ساتھ پوچھا۔

دلیپ نے اس کے 'پھر' کا جواب نہیں دیا اور سادھو کے پچکے ہوئے پیٹ اور داڑھی سے چھنتے ہوئے دھویں پر نظریں جمائے رہا۔

یکا یک پائپ میں تمباکو کی آگ کو انگوٹھے سے دباتے ہوئے اس نے ایک بار پھر کش لیا اور ہنس کر بولا۔

"کیا تم جانتے ہو کلا کس چڑیا کا نام ہے؟"

"نہیں میں نہیں جانتا۔ سنا ضرور ہے۔ ایسی کوئی چڑیا دیکھی نہیں۔"

"اچھا تو تم یہ بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ دل کس طرح خون ہوتا ہے۔"

"نہیں۔" منور نے سر ہلاتے ہوئے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"تم نے بلبل کی کہانی نہیں سنی جو رات بھر گلاب کے کانٹے کو اپنے سینے میں چھپا کر گاتی رہتی ہے اور جب سورج کی پہلی کرن پھوٹتی ہے تو پھڑ پھڑاتی ہوئی زمین پر گر جاتی ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ گلاب کی پنکھڑیوں کا رنگ تو سرخ ہو گیا......

اور ان پر شبنم کے موتی چمک رہے ہیں کون جانے یہ شبنم ہے یا بلبل کے آنسو......"
منور کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
دوسرے کونے میں ایک موسمی لیڈر قسم کا ادھیڑ آدمی بڑی دیر سے ایک ہی راگ ٹرا رہا تھا۔ اس کی گردن کی رگیں جونکوں کی طرح پھول گئی تھیں اور اس کی آواز میں بڑی ڈراونی چیچاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔
"میں کہتا ہوں پاپ اور پن، آزادی اور غلامی کا یہ سارا ڈھونگ فضول ہے۔"
"میں کہتا ہون زبان کو لگام دو۔"
"لگام؟ کیا کہا، لگام؟ میں کوئی گھوڑا ہوں جو لگام دوں؟"
"میں کہتا ہوں تم گھوڑے ہو۔ اب تم نے پاپ اور پن کا راگ الاپا تو میں جوتے سنبھال کر بات کروں گا۔"
"جوتے سنبھال کر؟ خبر دار...... تمہارے سر پر جوتوں سے طبلہ بجاؤں گا۔"
اچانک موسمی لیڈر گیند کی طرح ٹپے کھانے لگا۔ اور اونگھتے ہوئے مسافر گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیچ بچاؤ ہو گیا۔ اس بیچ میں صرف دلیپ اور منور چپ چاپ اپنی جگہ پر جمے رہے۔
سادھو نے کان کھجایا اور زور سے بولا۔ "کلجگ ہے بھائی کلجگ۔" اس کی دھونکنی اور تیز ہو گئی اور ڈبے کے کونے میں دھویں کا خیمہ سا تن گیا۔
"دیکھا تم نے؟ اسے کہتے ہیں ڈراما!" دلیپ ہنسا۔
منور نے بھری ہوئی نظروں سے دلیپ کو دیکھا۔
"یہ سب جھنجھلائے ہوئے ہیں" اس نے بڑی دبی ہوئی زبان سے کہا۔ 'کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔"
"ہاں کتوں کی طرح! پر جانتے ہو کیوں؟"
"نہیں۔"
"تم آخر جانتے کیا ہو؟ اتنی سی بات نہیں جانتے تو زندگی کا ڈراما کیسے سمجھو گے؟"

منور نے بے بسی کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا گھنے جنگل کی طرح اگا ہوا تھا اور سیاہ پھننگیں ستاروں کو چھو رہی تھیں۔ ستاروں کے جھرمٹ میں آدھا چاند مقتول عورت کی پیشانی کی طرح چمک رہا تھا۔ دور کہیں کہیں الاؤ جلتے اور جھلملاتے نظر آتے تھے۔

"آپ نے کبھی جنگل میں الاؤ جلتے دیکھا ہے؟" منور نے اچانک چہکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "نہ جانے کیوں...... لوگ الاؤ کے چاروں طرف بیٹھ جاتے ہیں اور دل کی باتیں کرتے ہیں تو دیکھنے والوں کے دل میں بھی الاؤ سا جل جاتا ہے۔"

"دل کی باتیں؟" دلیپ نے بالکل انجان بن کر پوچھا۔ "کیا کبھی کوئی دل کی باتیں بھی کرتا ہے کسی سے؟"

منور نے دلیپ کو نظر بھر کر دیکھا۔ دلیپ کے دانتوں میں دبا ہوا پائپ سرکس کے کھلاڑی کی طرح ہل رہا تھا۔

اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ جب اس نے قہقہہ لگایا تو اس کے پچکے ہوئے رخساروں کی ہڈیاں اور بھی نکیلی ہو گئیں۔

"یہ شخص مجھے اتنی بھوکی اور حیرت زدہ آنکھوں سے کیوں دیکھ رہا ہے؟" دلیپ نے سوچا اور اس کے پورے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ "میری راگنی کے شوہر کی آنکھوں میں بھی خودکشی سے پہلے ایسا ہی الاؤ جلتا نظر آیا تھا۔" دلیپ کے گلے میں کانٹے سے چبھنے لگے۔

"آپ بڑی انوکھی...... میرا مطلب ہے، بڑی ٹیڑھی باتیں کرتے ہیں۔" منور نے اپنی جیب سے آدھی بیڑی نکالی۔

"سگریٹ پیو۔"

"نہیں۔ ایک زمانے میں سگریٹ بھی پیتا تھا۔ لیکن سگریٹ سے نہ جانے کیوں میرا کلیجہ پھونکنے لگتا ہے اور آنکھوں میں میٹھی نیند بھر جاتی ہے۔" منور نے آنکھیں بند کر لیں۔

"نیند؟" دلیپ نے پھر قہقہہ لگایا۔ "ویسے بیڑی سگریٹ سے سستی بھی تو رہتی ہے بھائی!"

منور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ "آپ نہ جانے کیوں...... میرا مطلب ہے...... برا نہ مانئے گا......" منور کے گلے میں کچھ پھنس رہا تھا۔ "آپ نہ جانے کیوں۔ برا نہ مانئے گا...... میرا مطلب ہے۔"

یہ کم بخت مجھے آپ آپ کیوں کہے جاتا ہے...... کم بخت پھوٹتا کیوں نہیں، میرا مطلب ہے، میرا مطلب ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اس نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے دوہرایا...... "کہو کہو......"

منور نے جھجکتے ہوئے جو اپنے ہم سفر کے چہرے کو دیکھا تو اسے ایک عجیب سی زرد اور پھیکی جھلی پگھلتی نظر آئی۔

"میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

دلیپ نے اپنی آنکھوں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرتے ہوئے اسے دیکھا اور منہ سے کچھ نہ بولا۔

"اسٹیج پر جھوٹ دکھایا جاتا ہے یا سچ؟"

"کیا؟" دلیپ کی آنکھوں کا نشہ کچھ کم ہو گیا۔ اور وہ جلدی جلدی بجھے ہوئے پائپ کو بجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ "جھوٹ؟ نہیں جھوٹ پر کیسے چل سکتا ہے؟ اسٹیج بیساکھیوں پر نہیں چل سکتا۔ اس کی اپنی ٹانگیں ہوتی ہیں۔"

دلیپ کی آنکھوں سے رحم میٹھے زہر کی طرح چھلک رہا تھا۔ منور ہونٹ کاٹنے لگا۔ اسے اسٹیج کے اداکار کی آنکھیں مسکراتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ اس مسکراہٹ کا مطلب خوب جانتا تھا۔ تم کچھ نہیں سمجھتے۔ تم بڑے بھولے ہو!

"کبھی تم نے اچھا ڈراما دیکھا ہے؟ میرا مطلب ہے شیکسپیئر؟ ابسن؟ شا؟"

"جی نہیں۔ میں نے آغا حشر کا ڈراما دیکھا ہے۔ کیا نام تھا اس کا بھلا سا، یہی...... ہاں یہودی کی لڑکی۔ لڑکپن میں نوٹنکی بہت دیکھا کرتا تھا جس میں لڑکے مسی

لگا کر اور پان کھا کر چھوکریوں کی طرح کولہے مٹکاتے تھے۔"

دلیپ کی نشیلی آنکھوں کا نشہ بڑھ گیا۔ اب کے اس نے قہقہہ نہیں لگایا۔

"چھوکریوں کی طرح؟" وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔ "ڈراما چھوکرے چھوکریوں کے چونچلے کا نام نہیں ہے۔ ڈراما اونچی چیز ہے۔ ستاروں بھرے آسمان کی طرح۔ اس کے ایک ایک لمحے میں زندگی اور عشق کی نہ جانے کتنی بجلیاں چھپی رہتی ہیں۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

منور کا منہ اتر گیا اور آنکھیں جھک گئیں۔ اس کی ہونٹوں کی پپڑیاں نچ گئی تھیں اور ادھڑی ہوئی لکیروں سے خون رس رہا تھا۔

"تم کیا کرتے ہو؟"

"بزنس۔" منور نے تڑسے جواب دیا۔ جیسے گھنٹوں سے اس سوال کی راہ دیکھتا رہا ہو۔

"کاہے کا بزنس؟" دلیپ کی آواز میں بڑا چٹکارہ سا پیدا ہو گیا تھا۔

"اکسپورٹ امپورٹ کا۔"

"کاہے کا؟"

"اکسپورٹ امپورٹ کا۔"

دلیپ کی آنکھوں کا نشہ غائب ہو گیا اور ہونٹوں پر شرارت کھیلنے لگی۔ "ہاں اکسپورٹ امپورٹ کا بزنس ہے اچھی چیز۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے!"

اس نے کالی کالی موٹی کمانیوں والی عینک اتاری۔ جیکٹ کی جیب سے کھدر کا رومال نکالا۔ عینک کے شیشے صاف کئے اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے سادھو کو دیکھتا رہا۔ سادھو بالکل لکڑی کے قدیم بت کی طرح اوٹ پٹانگ طریقے سے کونے میں منہ کھولے بنگالن کو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

دوسرے کونے میں موسمی لیڈر کہہ رہا تھا۔

"یہ راکٹ اور جیٹ ہوائی جہاز کیا ہے...... مہابھارت کی تیاری ہے۔"

اگنی بان کی باتیں نہیں سنی ہیں کیا؟ وہی راکٹ۔ پھر مہابھارت ہوگی۔ غضب کا رن پڑے گا۔ پھر دنیا سانت ہو جائے گی۔"

"ہاہاہا! یار اُس آدمی کے سر میں کچالو بھرا ہوا ہے۔ مہابھارت تو اس وقت چھڑتی ہے جب ہر چیز مخالف ہو جاتی ہے۔ گھی دودھ، دھرم ایمان، دل اور پریم...... ہا ہا ہا!"

"پریم؟" سادھو نے سر گھما کر دوہرایا اور اس کی سفید لٹیں آنکھوں پر جھک گئیں۔

موسمی لیڈر نے ٹوپی برابر کی اور کچھ ہکابکا، کچھ منہ پھلائے ہوئے، تمام مسافروں کو دیکھنے لگا۔

"تم نے سچا اسٹیج نہیں دیکھا۔ نوٹنکی نہیں۔ تھیٹر...... چاند کی طرح خوبصورت تھیٹر۔ اکسپورٹ امپورٹ کرنے والا تھیٹر نہیں، ہمارے تمہارے دل کی طرح دھڑکنے والا تھیٹر......"

منور کی آنکھوں میں ایک شعلہ سا لپک کر بجھ گیا۔

"کس چیز کا اکسپورٹ امپورٹ کرتے ہو؟"

"کاہے کا؟"

"ہاں۔"

"آٹے دال کا۔"

دلیپ نے تھوڑی دیر کچھ سوچا اور پہلو بدل کر سادھو کی طرف دیکھنے لگا جس کی چلم ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

"میں اس چلم کی طرح ٹھنڈا ہو گیا ہوں۔ مگر کوئی ہے جو اب تک دم لگائے جا رہا ہے۔" دلیپ نے دل ہی دل میں کہا۔ پھر منور کی طرف جھک کر بولا۔ "میں نے لندن، پیرس اور برلن کے اسٹیج پر انسان کی زندگی کو ناچتے دیکھا ہے، میں نے غم کو پھول کی طرح مسکراتے دیکھا ہے، زہر کو پری کی طرح دل کے شیشے میں اترتے دیکھا ہے......"

منور کو اس کی باتیں شیشے کی طرح ٹوٹتی محسوس ہوئیں جیسے کوئی اجنبی، اجنبی

زبان میں باتیں کر رہا ہو۔ لیکن اس کی باتوں میں کوئی جادو تھا جو اس پر بادلوں کی طرح چھاتا چلا جا رہا تھا۔

"یہ آدمی نہیں سپیرا ہے...... "منور نے سوچا اور بڑے چاؤ سے بولا۔ "اچھا؟"

پاس والے ڈبے سے بڑی چٹخارے دار آواز آئی۔

"...... آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے شہزادی ہار سنگار کے پودے کے پاس سانس لینے کو رکی تو دیکھتی کیا ہے کہ شہزادہ بیلوں اور پھولوں میں چھپا بڑی شرارت سے جھانک رہا ہے...... شہزادی چیخ پڑی...... ہائے رام!"

"دھت تیرے کی...... سب جھوٹ!" ایک مسافر نے چیلنج کیا۔

"کیوں بھلا؟"

"شہزادی ہوتی تو کہتی اوئی اللہ! اور جو لونڈیا ہائے کہتی ہے تو سالی ہو نہ ہو راج کماری ہے...... لالہ طوطا رام لگی لپٹی نہیں رکھتے جو کہتے ہیں ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں......"

بڑے زور کا قہقہہ پڑا اور لالہ طوطا رام پر چھوٹی بڑی چھینکوں کا دورہ پڑنے لگا۔

"بھیا لالے نے چھینکوں سے اپنا الو سیدھا کر لیا۔ اسے کہتے ہیں کم خرچ بالا نشیں۔"

ایک قہقہہ اور پڑا۔ چند ہی منٹ بعد ڈبے میں خاموشی چھا گئی۔ کھڑکیوں سے خنک ہوا آ رہی تھی۔ زیادہ تر لوگ ایک دوسرے کے شانوں کے سہارے سو گئے۔ سادھو کی آنکھیں بند تھیں اور اس کا نکیلا گھٹنا بنگالن کی کمر میں چبھ رہا تھا۔

منور کو بھی اپنے پپوٹوں پر نیند کا بوجھ محسوس ہوا۔ دلیپ والی کھڑکی اب تک کھلی ہوئی تھی۔ اس کا سر کھڑکی سے باہر لٹک رہا تھا۔ لمبے لمبے خشک بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور عینک کی کمانیوں سے الجھ رہے تھے۔

"کیا میں سچ کہہ دوں اسٹیج کے اس جادوگر سے...... کہہ دوں سچ؟" منور کے ذہن میں اٹھتی ہوئی ہوا کی موج آنے والی آندھی کا پتہ دے رہی تھی۔ "کہہ دوں...... دو

دن سے بھوکا ہوں اور بغیر ٹکٹ سفر کر رہا ہوں اور اس وقت تک سفر کرتا رہوں گا جب تک ٹکٹ کلکٹر مجھے دھکے دے کر اس گاڑی سے نہیں اتارتا۔"

منور خود اپنے خیال سے سہم گیا۔ اس نے غور سے اپنے ہم سفر کو دیکھا۔

دلیپ کے پتلے ہونٹ بھی آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔

"میں تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں اور شاید میں تمہیں پھر کبھی نہیں دیکھوں گا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ تم کسی اور روپ میں مل جاؤ گی۔ بس نام راگنی نہ ہوگا۔ تم اوشا ہو گی، یا گیتا، نرگس ...... تم مجھے ہمیشہ ملتی رہو گی۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔ زندگی یوں بھی گزر جائے گی۔ لیکن تم اب کیا کرو گی۔ مکان کا دو مہینے کا کرایہ کیسے دو گی۔ بارہ سو روپے کہاں سے لاؤ گی۔ نرسنگ ہوم والے تمہارے کلاکار پر لعنت بھیجیں گے اور تمہاری خدمت میں اپنا شاندار بل پیش کریں گے۔ یہ پندرہ سو روپے کہاں سے لاؤ گی۔ تم تو اپنے زیور بھی بیچ چکیں۔ پھر تم میری کمپنی کے ان پچیس لڑکے لڑکیوں کو کس طرح بہلاؤ گی جو اسٹیج کی دنیا میں تہلکہ مچا دینے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت تم خود اس ملاح کی طرح ہو جس کی کشتی ڈوب چکی ہے اور جس کے ہاتھ پاؤں تیرتے تیرتے شل ہو چکے ہیں لیکن یہ سب کیوں سوچوں۔ مجھے تو اب نئے روپیہ لگانے والے کی تلاش ہے۔ میں تو کلا کا پجاری ہوں۔ میں یہ سب کیوں سوچوں۔ میں تو ایک ایسا تھیٹر بنانا چاہتا ہوں جو آج سے ہزاروں سال بعد بھی میرے نام کو زندہ رکھے، جیسے کالیداس، جیسے شیکسپیئر ......" دلیپ نے آنکھیں بند کئے کئے زور سے سانس لی...... "لیکن تم جانتی تھیں ...... کلاکار بھونرا ہوتا ہے، وہ ایک ہی پھول پر بیٹھ کر زندگی کی صبح کو شام نہیں کر سکتا......" اس کا سینہ تن گیا۔ "تم مجھے شکاری کہو گی۔ لیکن یہ جھوٹ ہے۔ میں شکاری نہیں ہوں۔ شکار ہوں۔"

منور نے دلیپ کی آخری بات صاف سنی اور چونک گیا۔

"کیا؟"

''کچھ نہیں۔''

''کچھ نہیں؟''

''ہاں کچھ بھی نہیں۔''

سادھو کے زوردار خراٹوں نے دونوں کو چپ کرادیا۔

''دلیپ بابو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی تھیئٹر میں کام کروں؟''

''تم اور تھیئٹر میں؟''

''ہاں۔''

''لیکن تم تو امپورٹ اکسپورٹ کا بزنس کرتے ہو بھائی۔''

منور نے اس کے پتلے ہونٹوں پر دبی مسکراہٹ کو دیکھ لیا۔ اس نے گھبرا کر اندھیرے میں کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اسے کوئی اکیلا چراغ بھی ٹمٹاتا نظر نہ آیا۔ گاڑی کی دھڑکن اچانک دگنی تیز ہو گئی۔

دلیپ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اسے منور کے شانے کی ہڈیاں تلوار کی دھار کی طرح کاٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''یار تم بزنس مین ہو۔ تھیئٹر میں روپیہ لگاؤ۔''اس نے چبا چبا کر کہا اور خود اپنے نداق کی بے دردی پر تلملا گیا۔ ''دیکھو دیکھو اس غریب کی آنکھیں بھر آئیں۔ بھوکا ہے۔ اس کا جسم بھوکا ہے اور میری روح بھوکی ہے۔ اس کا جسم اندھیرے میں ہے اور میری روح اندھیرے میں ہے۔ رو رہا ہے غریب۔ رونے دو۔ میں کسی پر رحم نہیں کھاتا۔ انسان صرف خارش زدہ کتے پر رحم کھا سکتا ہے۔ مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ میں بھی خارش زدہ کتا ہوں۔ خارش روح میں ہے۔ کوئی روح کو نہیں دیکھ سکتا۔ یہی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ لوگ مجھے آوارہ کہتے ہیں۔ عورت باز۔ اف کتنا گھناؤنا لفظ ہے۔ جب راگنی کے شوہر نے خودکشی کی تو کیا...... میں نے اس کے گلے میں پھندا ڈالا تھا۔

وہ راگنی کو بھول سکتا تھا۔ کم بخت کو معلوم ہی نہیں تھا کہ جو مزا بھولنے میں ہے یاد

رکھنے میں نہیں...... میں جانتا ہوں میں کوزے میں بند نہیں ہو سکتا۔ میں سمندر ہوں، میں تو ساحل ساحل ٹکراؤں گا......"

"کس تھیئٹر میں لگاؤں روپیہ؟" منور نے سنبھل کر پوچھا اور دلیپ اچھل پڑا۔

"میرے تھیئٹر میں۔"

"کہاں ہے تمہارا تھیئٹر؟" منور نے آہستہ سے دلیپ سے پوچھا۔

"ابھی تو کہیں نہیں ہے۔ لیکن میرا تھیئٹر بنتا بگڑتا رہتا ہے۔" دلیپ کی لمبی لمبی انگلیاں تڑپ رہی تھیں۔ پائپ سے دھوئیں کا ایک تار لرزتا ہوا نکل رہا تھا۔

"میں ایسے تھیئٹر میں روپیہ کیسے لگا سکتا ہوں؟"

"بھئی بات یہ ہے کہ" دلیپ نے گلا صاف کیا۔ "تھیئٹر بھی زندگی کی طرح ہے۔ زندگی بھی بنتی بگڑتی رہتی ہے اور تھیئٹر بھی۔"

منور کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"اچھا؟"

"تم ایسی نظروں سے کیوں گھور رہے ہو؟" ایک لمحے کو رکتے ہوئے اس نے کہا۔ "میں اصل میں ایک ایسے نوجوان کا ڈراما پیش کرنا چاہتا ہوں جو سورج کی طرح روشن ہے۔ مگر زمانے نے اس کو گہن لگا رکھا ہے۔ وہ گہن سے لڑتا رہتا ہے اور آخر میں گھبرا کر خودکشی کر لیتا ہے۔"

"یہ تو بڑی بزدلی ہے۔"

"بزدلی؟ ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" دلیپ خاموش ہو گیا پھر اچانک بولا۔ "انسان بھوکا مرے، اس کے ماں باپ بھوکے مریں، بچے دودھ کو ترسیں، بیوی پڑوسی کے ساتھ بھاگ جائے...... تو پھر وہ خودکشی کیوں نہ کرے۔ اسی بات پر میری لڑائی ہو گئی کمپنی کے مالکوں سے۔" وہ رک گیا کیوں کہ اسے یاد آ گیا کہ مالک سے لڑائی اس بات پر نہیں ہوئی تھی بلکہ اس بات پر ہوئی تھی کہ راگنی شوہر کو چھوڑ کر دلیپ کی ہو گئی تھی۔

منور کو اپنے دماغ میں ہر چیز گڈمڈ ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"جو ہے وہ ہے، جو نہیں ہے، نہیں ہے!"

بھوک کا شعلہ پیٹ سے دماغ تک پہنچ رہا تھا۔

"میں اسٹیج پر بالکل نیا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ روشنی اور اندھیرا، سائے آواز اور قدم، خون روتی ہوئی آنکھیں، قدم قدم پر زندگی کو لوٹتی ہوئی ریاکاری اور جھوٹ...... زہر پیتے ہوئے دل...... زندگی کو اسٹیج پر پیش کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ لیکن میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ ننگی زندگی...... جیسی سڑک پر ہوتی ہے، کپڑوں میں لپٹی ہوئی، ڈرائنگ روم کے صوفوں میں دھنسی ہوئی زندگی نہیں...... لیکن تم نہیں سمجھو گے......"

دلیپ نے دیکھا کہ منور کی بھوکی آنکھوں میں حیرت اور ہمدردی کی جوت جھلملا رہی ہے۔

"ایک ڈراما ہے۔ معمولی کلرک کی زندگی کا ڈراما۔ افسر اس کے خلاف ادھار کھائے بیٹھے ہیں کیونکہ وہ فائلوں سے نفرت کرتا ہے۔ وہ نفرت کیوں نہ کرے، اس کی پوری زندگی، اس کا دل فائلوں کے ڈھیر تلے دبا ہوا ہے۔ فائلوں سے ایسی سڑاند اٹھتی ہے کہ چوہے بھی ان کے پاس نہیں پھٹکتے۔ لیکن تم کیا جانو فائلوں کی بو...... تم تو امپورٹ اکسپورٹ کے کاروباری ہو...... ہاں تو اس عقل کے دشمن کا پتہ کٹ جاتا ہے ظاہر ہے الٹی کھوپڑی کا پتہ تو کٹنا ہی تھا...... سو......"

"پھر؟" منور کے دماغ کو چاٹتا ہوا شعلہ بجھ گیا "اچھا پھر؟"

"پھر کیا۔ کلرک کتے کی طرح آوارہ پھرتا ہے۔ اس کو دوسرا کام نہیں ملتا۔ اسی بھوک میں اسے ہوا سے لڑنے والی ایک عورت سے عشق ہو جاتا ہے۔"

"اچھا تو پھر وہ اس عورت سے شادی کیوں نہیں کر لیتا؟"

"عورت کسی اور کی بیوی ہے۔"

"کسی اور کی؟" منور کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اور نہیں تو کیا...... لیکن عورت بہت سمجھ دار ہوتی ہے۔ وہ بے روزگار کلرک

کے آگے گھاس نہیں ڈالتی۔"

"گھاس بھی نہیں؟" منور کا گلا خشک ہو گیا۔

"ہاں یار گھاس بھی نہیں...... نوجوان آخر اپنی معشوقہ کی کھڑکی کے سامنے پھندا ڈال کر لٹک جاتا ہے۔ بس چھٹی!"

"چھٹی؟"

"ہاں چھٹی......" دلیپ نے تالی بجائی۔ "اور جب عاشق کی جان نکل رہی ہے تو اس کی معشوقہ اپنے شوہر کے گلے میں ٹائی باندھ رہی ہے اور کہہ رہی ہے...... تمہاری ٹائی ڈیئر بہت پھیکی ہے...... مور والی ٹائی خریدو......"

"مور والی؟...... چھٹی؟"

"لیکن آج تک یہ ڈراما اسٹیج پر نہیں آیا۔ سب زندگی سے ڈرتے ہیں!"

"زندگی سے یا موت سے؟"

دلیپ نے اب کے قہقہہ نہیں لگایا لیکن اپنے آپ سے بات کرتا رہا۔

"لیکن میری تباہی میں میرے دل کا ہاتھ ہے۔ اگر میں ہر ہیروئن سے عشق نہ کروں، اگر میں ہر ایک عورت کو اپنے شوہر سے چھڑا کر کافی ہاؤس اور پارک نہ لے جاؤں تو یہ سب تماشا نہ ہو۔ لیکن میں عشق کئے بغیر کیسے رہ سکتا ہوں۔ کلاکار عشق کرتا ہے تو اس کے دل میں تارے چٹک جاتے ہیں۔ اور جب تارے چٹک جاتے ہیں تو......"

"لیکن اس نے خودکشی کیوں کر لی؟" منور نے آنکھ کھولتے ہوئے پوچھا۔

"اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ اور کیا کرتا؟" دلیپ نے بیزاری سے دوبارہ پائپ سلگایا اور اپنے خیال میں کھو گیا۔

"اور کیا کرتا؟ اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا؟"

"نہیں بھائی نہیں۔" دلیپ نے دانت پیس کر کہا اور دل میں سوچا "بیوقوف کہیں کا۔ اف جنتا اکسپریس میں سفر کرنا عذاب ہے۔ کیسے کیسے گدھوں سے پالا پڑتا ہے!"

منور نے خشک ہونٹ چاٹتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

اچھا تو واقعی اس کے سامنے اور کوئی راستہ نہ تھا؟ کیا میری بیوی کے سامنے بھی اور کوئی راستہ نہ تھا۔

مگر وہ...... میری بیوی...... آخر وہ بھاگی کیوں؟ اور منے؟ وہ تو ہمارے جیتے جی یتیم ہو گیا نا؟ میں کتنا عشق کرتا تھا! میرا قصور کیا تھا۔ یہ تو میں جانتا ہوں ایک سو بیس روپے بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن ہزاروں تو اس سے بھی کم لاتے ہیں گھر۔ اف میں اس عورت سے کیسی نفرت کرتا ہوں۔ سامنے کھڑی بال سکھا رہی ہے۔ اف ظالم کتنی خوبصورت ہے۔ ٹھوڑی پر تل کیا ہے قیامت ہے۔ آنکھیں بھونروں کی طرح پر تول رہی ہیں۔ بال سکھا رہی ہے۔ اس الو کے پٹھے کی صورت تو دیکھئے۔ اگر میں جانتا، اگر میں جانتا...... اور منے؟ ہمک رہا ہے، ہاتھ پھیلا رہا ہے......"

منور کی بند آنکھیں بھیگ گئیں۔

"اور کوئی راستہ نہیں...... کوئی راستہ نہیں۔ میں کب تک بغیر ٹکٹ سفر کروں گا۔ اور یہ اسٹیج کا جادوگر...... مداری...... مجھے بزنس مین سمجھتا ہے...... ہا ہا ہا!"

منور کے قہقہے سے دلیپ کے دل پر چوٹ لگی۔ اب کے اسے منور کی آنکھیں دیوانے کی آنکھوں کی طرح سرخ اور سوجی سوجی سی نظر آئیں۔

"یہ آدمی بالکل خونی معلوم ہوتا ہے۔" اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

"اکسپورٹ امپورٹ کا بزنس کرنے والے جنتا اکسپریس میں سفر نہیں کرتے!"

دلیپ کی بند آنکھوں میں راگنی لہرا رہی تھی۔ اس کا مکھڑا ستا ہوا تھا۔ ڈوبتے چاند کی طرح زرد۔ ہونٹ آدھے کھلے ہوئے تھے اور گھنگھریالے بال شانوں پر پڑے تھے۔ ٹھنڈے اور بے جان...... اس کے جسم سے بڑی معصوم سی خوشبو آ رہی تھی۔

"تم اتنی بجھی ہوئی کیوں ہو؟" دلیپ نے اس کے ہاتھ سے کافی کی پیالی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تم تو اسٹیج پر دنیا بھر کا دکھ بکھیر دینا چاہتے ہو۔ کیا تم اتنا نہیں جانتے دلیپ کہ

عورت کے دل میں سب سے گہرا گھاؤ بچے کی موت کا ہوتا ہے......"

"لیکن...... لیکن جو پیدا نہ ہوا ہو وہ مر کیسے سکتا ہے؟ کیا کہہ رہی ہو؟" دلیپ کی زبان لڑکھڑا گئی۔

راگنی کی پلکیں اٹھیں۔

"بچہ سب سے پہلے عورت کے دل میں پیدا ہوتا ہے...... تم جانور ہو......"

دلیپ کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی۔ "لیکن تم جانتی ہو ہم اپنا ڈراما جو......"

"مجھے نہیں چاہئے تمہارا ڈراما...... مجھے تو......"

ریل گاڑی زور سے دھڑکی۔ منور اٹھا اور ڈبے کی دروازے کی طرف لپکا۔ گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ نے دلیپ کو جگا دیا۔ سادھو کے خراٹے بند ہو گئے۔ دلیپ نے آنکھیں ملیں۔ دروازہ کھلا بھائیں بھائیں کر رہا تھا اور ہوا کے تیز جھونکے اندر آ رہے تھے۔ وہ پاگل کی طرح لپکا اور دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ دریا میں آدھا چاند جھلملا رہا تھا۔

دلیپ لٹے ہوئے انسان کی طرح بڑبڑایا۔

"کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں......

○○

رات گئے

۸

یہ شہر کبھی سوتا نہیں۔ البتہ رات گئے گھنٹے دو گھنٹے کو ایسا وقت آتا ہے جب اس کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔ تب اس کا بدن ٹوٹتا ہے اور جوڑ جوڑ سے زمانے بھر کا درد رِستا ہے۔ ایسا ہی وقت تھا، جب میں لفٹ سے نیچے اترا۔ تب میرے کانوں میں نشے میں ڈوبے ہوئے قہقہے گونج رہے تھے، جو میں پیچھے چھوڑ آیا تھا، اوپر ساتویں منزل پر نیون کی ٹھنڈی روشنی کے ساتھ تھکن اور آزردگی بہہ رہی تھی۔ سمندر کی لہروں کا جھاگ ہوا میں اڑتی ہوئی آستینوں کی طرح شہر کو اپنے پھیلاؤ میں سمیٹ رہا تھا۔

یکایک ایک ٹیکسی رینگتی ہوئی آئی اور میرے سامنے آکر رک گئی۔

میں نے دروازہ کھولا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دھند لکے سے چھنتی ہوئی روشنی میں مجھے ڈرائیور کی پشت نظر آئی اور بڑا سا سر۔ مجھے لگا کہ اس کے سر پر بڑا سا صافہ ہے جو ونڈ اسکرین سے چپکا ہوا ہے۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب سی لگی۔

"یہ کون سی سڑک ہے؟" میں نے یونہی پوچھا۔

"وارڈن روڈ۔" ڈرائیور کی آواز کھرجدار تھی۔

اس نے ٹھیک بتایا تھا۔ "کہاں جانا ہے؟"

"جوہو۔"

اس نے کندھے جھٹکے۔ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اس کا سر آہستہ آہستہ اسٹیرنگ کی طرف مڑا۔ جب ٹیکسی کا انجن اور زور سے غرایا تو مجھے ایسا لگا کہ کسی نے پچھلی سیٹ کا

دوسرا دروازہ کھولا اور کوئی آہستہ سے میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ میں نے غور سے دائیں طرف دیکھا، لیکن مجھے دھند لکے میں کوئی نظر نہ آیا۔ لیکن کوئی میرے پاس زور زور سے سانس لے رہا تھا۔

لہروں کا جھاگ، سڑک کی روشنی، صافہ اور عمارتوں کی کلاہیں، دھند لکوں کا ٹھنڈا سیلاب، مجھے لگا کہ سب کچھ رو میں ہے۔ صرف ٹیکسی کھڑی ہے۔ میں نے ڈرائیور کو غور سے دیکھا۔ ونڈاسکرین پر اس کے داڑھی بھرے چہرے کا ایک رخ نظر آیا۔ یہ سب کچھ بہت پراسرار تھا۔

عام طور پر آدھی رات کا سفر میرا خاموشی میں طے ہوتا تھا لیکن میں اپنی آواز سے چونک گیا۔

"کیا حال چال ہے بھائی؟" ٹیکسی ڈرائیور ہو یا ریستوران کا ویٹر، اس قسم کا سوال کرنا میری عادت ہے۔

جواب میں انجن کی غراہٹ کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دی۔

کافی دور جانے کے بعد، جہاں دوراہے پر ٹیکسی ذرا ترچھی ہو کر مڑی، ڈرائیور کی آواز سنائی دی: "جس کا ستائیس سال کا بیٹا یوں مر جائے اس کے حال چال کیا پوچھتے ہو بابو جی؟"

مجھے لگا کہ میرا دل برف کا غبارہ ہے جو پھولتے پھولتے میرے گلے تک پہنچ گیا ہے۔ میرے پورے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس کی آواز نے جیسے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جھنجھوڑا ہو۔ میں نے پھر اپنے دائیں طرف کسی کی موجودگی محسوس کی۔ لیکن اب بھی مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔

"کیا ہوا تھا آپ کے بیٹے کو؟"

"کچھ نہیں، بس مر گیا۔ ستائیس سال کا تھا بابو جی۔ بس یونہی مر گیا۔ میرے پاس دو ہی چیزیں تھیں۔اپنی۔ایک بیٹا، دوسری ٹیکسی۔ بیٹا چلا گیا، ٹیکسی رہ گئی۔"

ٹیکسی وہی پہلے کی سی رفتار سے چلتی رہی۔اس کی رفتار نہ تیز ہوئی نہ کم۔

میں پھر ان چند گھنٹوں میں واپس چلا گیا جن کو میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

جگن ناتھ کا سر ٹیبل لیمپ کے اوپر جھکا ہوا ہے اور اس کی گنجی کھوپڑی چمک رہی ہے۔ سنیتا اس پر ہاتھ پھیر رہی ہے اور سگریٹ کے کش لے کر ہونٹوں پر زبان پھیر رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ مجھے رجھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی شکار ہو چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں وہ تاش کے پتوں کے ساتھ کوئی کھیل کھیلتی ہے۔ ورنہ ایسا کیوں ہے کہ جس کو وہ نظر بھر کر دیکھتی ہے اس کے ہاتھ ڈھنگ کے پتے آتے ہی نہیں۔ ماتا ہری مجھے ڈھنگ کے پتے دو۔ مجھے بھی جتواؤ۔ میری ماتا ہری، مجھے بھی جتواؤ، ورنہ میں لٹ جاؤں گا۔ پوری شام کیسی بکواس کرتے رہے ہیں یہ لوگ۔ اکتائے ہوئے لوگ۔ دیکھو اگر میری فلم ہٹ ہو گئی تو اگلی فلم میں شاں زے لیزے پر شوٹ کروں گا۔ کرن یوگی میرے آگے بچھ جائے گی۔ اور وہ جانتی ہے اس کے بعد اس کا نام انٹر نیشنل مارکیٹ میں ڈالر کی طرح چلے گا۔ اس کے ہونٹ لگتا ہے صرف سرگوشی کے لیے بنے ہیں! یہ ہونٹ سلگ رہے ہیں۔ لیکن جس کارنر میں وہ ہے وہ یہاں سے بہت دور ہے۔ دو تین میزوں کا فاصلہ ہے۔ بہت سی باتوں کا، بہت سی سرگوشیوں کا فاصلہ۔ میں چاہوں تو یہ فاصلہ پاٹ سکتا ہوں۔ نگاہوں نگاہوں میں پاٹ سکتا ہوں۔ بہت سی بازیاں اس شہر میں یوں ہی جیتی یا ہاری جاتی ہیں۔ نگاہوں نگاہوں میں۔ اماں یار ماتا ہری کو یوں نگاہوں نگاہوں میں کھائے جا رہے ہو بھائی۔ جہاں پتے چل رہے ہوں وہاں تم تیر چلتے دیکھ رہے ہو۔ بات یہ ہے کہ تم کو معلوم ہی نہیں تم چاہتے کیا ہو۔ تم غلط دھندے میں پڑ گئے ہو بھائی۔ بیٹھ گئے کالے بازار کی کشتی میں۔ سمجھے بیڑا پار۔ ایسا نہیں ہوتا ہے بھائی۔ سوڈا مت ڈال بھائی۔ اب وہ بڑی بڑی آنکھیں پھاڑ کر گنگنا رہا ہے ''اور چابی کھو جائے'' اور پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔ اور اس کی بند بند سی آنکھیں میزوں کے فاصلے طے کرتی ہیں اور ماتا ہری اس کی نگاہوں کا سواگت ایک فلائنگ کس سے کرتی ہے۔ بالکل ہلکی پھلکی، فاختہ کے پر کی طرح ہلکی پھلکی سی۔ وہ مسکراتا ہے اور اپنے پتوں کو بند آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ فائن!

تمہاری چال ہے۔ یار، let me concentrate! جہاز ڈوب جائے گا یار۔ یہ مسخرے بڑی اونچی ہانک رہے ہیں۔ ساری شام ہار تا رہا ہوں۔ لگتا ہے میں یہاں سے نکلوں گا تو دونوں ہاتھ خالی ہوں گے۔ اور جیب؟ وہ بھی۔ So you see یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ Life is a hand of cards! مزا کھیلنے میں ہے۔ قسمت کیا ہے۔ ماچس کی تیلی۔ ڈبیہ میں بچا کر رکھو گے تو رکھی رہے گی۔ نکالو اور مارو مسالے پر، پھر دیکھو، لو کیسی لہرا کے اٹھتی ہے۔ سارا کھیل ماچس کا ہے۔ تیلی کو مسالے پر مارو تو سہی۔ No dear, no more! اب تم میزوں کا فاصلہ طے کرو اور پہنچ جاؤ، اس کے پاس۔ روشنی دھندلی پڑتی جا رہی ہے۔ آنکھیں پلکوں کی چھاؤں میں چھپ گئی ہیں۔ اب اتنی دور سے بھلا کون تھاہ پائے گا ان کی۔ خود اپنی تھاہ نہیں ہے۔ نہیں یار آج نہیں۔ نہیں میں نشے میں نہیں ہوں۔ میری فلم باکس آفس پر پٹ گئی ہے۔ دل توڑنے والی رپورٹیں آرہی ہیں۔ اتنے سارے ستاروں میں اپنا ستارہ تو بجھ گیا، یار۔ نہیں آج نہیں۔ کل صبح ملو یار، When we will both be sober! ہاں ہاں ملادوں گا۔ پھر تم جانو اور تمہاری قسمت۔ دیکھو کس طرح جارہا ہے ہوا میں تیرتا ہوا میزوں کے اس پار، جہاں کرن یوگی گلاس پر ہونٹ رکھے ہوئے گلاسوں کی گردش اور پتوں کی اڑان دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں ہنس رہی ہیں۔ اور ہمارا دوست میزوں سے کترا کر فاصلہ طے کر رہا ہے۔ پتہ پھینکو بھائی۔ تمہاری باری ہے۔ اماں رکو۔ ہچکی آرہی ہے۔ ذرا گلاس اٹھانا۔ نہیں نہیں میں نے اس کو نہیں دھکیلا تھا بھنور میں۔ آیا، کہنے لگا میں فلم بناؤں گا۔ میں نے کہا، بناؤ۔ بولا، میں سارے سوپر اسٹار لوں گا۔ میں نے کہا مارے جاؤ گے۔ اکڑ گیا نہیں میں تو سوپر ہٹ بناؤں گا۔ اسٹوری؟ اسٹوری کیا یار، جب اتنے اسٹار ہیں تو اسٹوری تو اپنے آپ بن جائے گی۔ اون اور سلائیاں موجود ہوں تو مفلر بننے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ Come! Let's celebrate! ہاہاہا یہ ہوئی نا بات! ماتاہری، میں ڈوب رہا ہوں۔ ان آنکھوں میں بہت سے ڈوبے ہیں۔ میں تو اپنے دھندے کی باتیں کر رہا ہوں۔ اوہو دھندا، بھلا دھندے میں میرا کیا کام۔ بس اتنا کر سکتی ہوں کہ اپنی شبھ کامنائیں تمہیں دے دوں۔

اچھا، وہی دے دیجیے۔ ہاہا۔ پھر وہی پتے، وہی چال، وہی آنکھوں کے اشارے، اور گلاسوں کی گفتگو۔ اب میرے لیے یہاں کیا ہے۔ کوئی میرے کام نہیں آئے گا۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ قیامت کے دن ایک ایک قبر سے ستر ستر ہزار مردے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور مجھ سے محشر میں پوچھا جائے گا...... بتاؤ تمہیں ایک زندگی دی گئی اس میں تم نے کیا کیا۔ کوئی نیک کام؟ تو میں کیا کہوں گا۔ یہی کہ ایک سوپر ہٹ بنانے کی کوشش کی مگر وہ فلاپ ہو گئی۔ سامنے پل صراط ہے، تلوار کی دھار۔ اس پر چلنا ہے۔ آگے جنت ہے۔ نیچے جہنم۔ اور میرے پاؤں کانپ رہے ہیں۔ رات آدھی کٹ چکی ہے۔ باقی آدھی بھی کٹ جائے گی۔ بس چلتے ہیں۔

سناٹا ہے۔ ٹیکسی دھندلکے میں تیرتی چلی جارہی ہے اور بائیں ہاتھ کو جھاگ کا سمندر سانس لے رہا ہے۔ اب نہ کانوں میں قہقہوں کی گونج ہے اور نہ آنکھوں میں گلاس کو چومتے ہوئے ہونٹ۔ ٹیکسی ہے، اور بھاگتی ہوئی سڑک کا دھندلکا۔

وہ جو میرے پاس بیٹھا ہے، اور جس کو میں دیکھ نہیں سکتا، میرے کان میں کہہ رہا ہے، بابا میرا بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ ساری زندگی اس کی اس شہر کی سڑکوں کو ناپتے گزر گئی۔ اور فاصلہ کم نہ ہوا۔ تم کون ہو بھائی۔ تم دکھتے کیوں نہیں۔ میں اس بوڑھے کا بیٹا ہوں۔ دیکھو اس کا صافہ پورے ونڈ اسکرین پر پھیل گیا ہے۔ اور اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ اندھیرے میں ونڈ اسکرین پر وہ اپنی جھریوں کو دیکھ رہا ہے اور رو رہا ہے۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ مگر اس کا جوتا، لمبی چونچ والا جوتا، اسی طرح accelerator کو دبا رہا ہے۔ اس نے کوئی پچاس برس اسی طرح ٹیکسی چلائی ہے۔ اور اب خفا ہے کہ میں اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھے تو جانا ہی تھا۔ نہ جاتا تو میرا بھی یہی حال ہوتا۔ سڑکیں اور فاصلہ۔ ان فاصلوں میں کیا رکھا ہے۔ اب بڑا سکھ ہے۔ میں چپ چاپ آکر اس کے مسافروں کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ جاتا ہوں اور بوڑھے کی باتیں سنتا ہوں۔ اور جب وہ چلاتے چلاتے تھک جاتا ہے اور چلتی گاڑی میں اس کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں تو میں اسٹیرنگ سنبھال لیتا ہوں۔ شہر کبھی سوتا نہیں۔ اور اس کی

سڑکیں کہیں ختم نہیں ہوتیں۔ صرف ایک دوسرے کو کاٹتی رہتی ہیں۔

"بس یونہی مر گیا۔ ستائیس برس کا تھا۔ کڑیل جوان۔"

میرے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

"ہوا کیا تھا؟"

"کچھ نہیں۔"

"اس کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا!"

"ہوا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر کچھ نہیں۔"

جس دن وہ مرا اس سے ایک دن پہلے کی بات ہے۔ رات کا وقت تھا۔ یہی وقت ہوگا جو اس وقت ہے۔ میں اپنے اسٹینڈ پر گاڑی سے پیٹھ لگائے بیٹھا تھا کہ میں نے دیکھا وہ لڑکھڑاتے ہوئے آرہا ہے۔ میں نے دل میں کہا گیا چھوکرا کام سے۔ اب تو اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگی ہیں۔ اور جو میں اسے وہیں چھوڑ دیتا گاؤں میں تو مزے میں ٹیلے کی گھاس پر بکریاں چراتا ہوتا۔ کمر میں تہمد، ہاتھ میں کڑا، کندھے پر ڈنڈا، اور کھلے آسمان تلے تیز ہوا اور ہونٹوں پر ہیر...... یہاں سے وہاں تک وقت کی بہتی دھوپ۔ آنکھوں میں گرم روشنی اور بازوؤں میں تڑپتی مچھلیاں۔ مگر اب کیا۔ مر گیا وہ اسی رات۔ جھگڑا تو ہونا ہی تھا۔ میں نے کہا جا تو پھر ان ہی لوگوں کا ہو رہ۔ وہ ہماری برادری کے نہیں ہیں مار ڈالیں گے تجھے۔ بلا سے مار دیں میں تو جاؤں گا اسی کے پاس۔ بولا اور مجھے گھورتا رہا۔ تب بھی وہ درخت کی طرح ہل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ مڑا اور چلا گیا۔

اگلے دن اس کی لاش ملی بھیگی ریت پر۔ اس کا بدن نیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ مر گیا تھا پر اس کی آنکھوں میں اب بھی دھوپ بھری ہوئی تھی۔ ہوا بہت تیز تھی۔ سمندر بہت بے چین تھا۔

میں نے پوچھا بھی اس کا جسم نیلا کیوں پڑ گیا ہے۔ لیکن کسی نے جواب نہیں دیا!

میں نے کہا بس یہیں ریت پر روک دو۔ اس نے بریک لگائے۔ پیسے لے کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ٹیکسی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی موڑ پر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

☆☆☆

اب میں جہاں کھڑا تھا وہاں سے ریت شروع ہوتی ہے اور پانی تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔ اسی ریت پر کوئی سویا ہوا ہے جس کا جسم نیلا پڑ گیا ہے۔ پھر وہ کون تھا جو پچھلی سیٹ پر چپکے سے آکر بیٹھ گیا تھا۔ میں اب آہستہ آہستہ بھیگی ریت پر چل رہا ہوں۔ اور سمندر اجلے جھاگ کی لہروں کو سمیٹ کر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ ○○

سات منزلہ بُھوت

۹

ہمارا سات منزلہ مکان بہت پرانا ہے۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے اس مکان کا نام بھوت رکھ دیا ہے۔

"ابے لونڈے دوڑ کے جائیو...... بھوت کے ہوٹل سے کباب لے آئیو تین گرما گرم!" آس پاس کے لوگ پکارتے ہیں۔

راتوں کو نانیاں اور دادیاں بچوں کو اسی بھوت سے ڈرا کر سلاتی ہیں۔ جب شام کو کھڑکیاں روشن ہو جاتی ہیں تو یہ مکان اس چوراہے پر بھکاری کی طرح کھڑا نظر آتا ہے...... بھکاری جس کی انگنت آنکھیں ہیں۔ یہ آنکھیں کھلی بھی رہتی ہیں تو روشنی کے باوجود بے نور معلوم ہوتی ہیں۔ کھڑکیوں پر مکڑے کے جالے جھڑتی ہوئی پلکوں کی طرح لرزتے رہتے ہیں۔ سامنے کی خاموش جھیل میں اس کا عکس ڈھل کر نہ جانے کیوں نکھر جاتا ہے۔ کبھی کبھی جب ہوا ذرا سنکنے لگتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے مکان میں جان پڑ گئی ہے اور اس کے چہرے سے اندرونی جذبات پھوٹ رہے ہیں۔ شام کو جب سورج دہک اٹھتا ہے اور ہوا کی سرسراہٹ میں اداسی سلگنے لگتی ہے تو پانی میں لرزتے ہوئے چہرے سے خون رسنے لگتا ہے۔ اس جھیل میں نہ کشتی چلتی ہے اور نہ اس کے کنارے رومانی جوڑے ٹہلتے ہیں۔ یہاں دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔ عورتیں برتن مانجھتی ہیں اور پوتڑے کھنگالتی ہیں۔ ایک طرف بھینس نہلاتی جاتی ہیں اور دوسری طرف دن کے تھکے ہارے لوگ اشنان کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو ماں بہن کی گالیاں دیتے ہیں۔

کبھی کبھی قہقہے بھی سنائی دیتے ہیں۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ سورج ڈوبنے کے بعد تو یہ ڈھیلے اور بھی کم برستے ہیں۔

ایک بار رات کو میرے دفتر کا ایک ساتھی بھنایا ہوا آیا۔ میں نے اس کے پچیس روپے نہیں لوٹائے تھے۔ اس لیے وہ مجھے ذلیل کر کے اپنے پیسے وصول کرنا چاہتا تھا۔ اس مکان کے لوگوں میں میری بڑی ساکھ ہے۔ میں بہت گھبرایا۔ میں نے جھٹ اس کا بازو پکڑا اور اسے لے کر جھیل کی طرف چل دیا۔

"کتنی خوبصورت جھیل ہے......" میں نے اس کا دھیان بٹانے کو کہا۔

"یہ جھیل ہے؟" اس نے غرا کر پوچھا اور چاندنی میں سانس لیتے ہوئے مکان کے دھندلے عکس پر تھوک دیا۔ "یہ کالا جوہڑ ہے اور تم اس کو جھیل کہتے ہو؟"

اس نے جھیل کی طرف سے منہ پھیر لیا لیکن اس کے بعد مجھ سے پیسے نہ مانگے۔

میں اسے اپنی خوبصورت جھیل کا ہی جادو سمجھتا ہوں جس کے اوپر سرد چاند بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ ہاں ہماری جھیل بڑی جان لیوا ہے۔ اس پر کالی کائی جمی ہوئی ہے تو کیا ہوا۔ جب بطخیں کائی کی موٹی چادر کو چیرتی ہوئی تیرتی ہیں اور اونگھتے ہوئے درختوں میں آگ لگ جاتی ہے، جب دھوبیوں کی چھواں چھوں ختم ہو جاتی ہے، جب دبے پاؤں شام اترتی ہے اور ہر چیز کو دھندلا اور پراسرار بنا دیتی ہے تو جھیل ڈبڈبائی ہوئی آنکھ کی طرح چمک اٹھتی ہے۔ اس کے دل میں آگ سی لگ جاتی ہے جو دکھائی نہیں دیتی مگر اس کی آنچ انسان کے دل تک پہنچتی ہے۔ یہی آنسوؤں جیسی گرمی ہماری جھیل کو اتنا حسین بناتی ہے۔

ہمارا مکان ایک گندے ٹیلے پر کھڑا ہے اس لیے جتنا اونچا ہے اس سے زیادہ اونچا دکھائی دیتا ہے۔

ایک بڑے گلیارے سے گزر کر اندھیرے کنویں میں ٹٹولنے سے زینے کی دیوار پر ہاتھ پڑتا ہے، جو انسان کی زندگی کی طرح چکراتے ہوئے اوپر جاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انسان کی زندگی چکراتی ہوئی اوپر نہیں جاتی بلکہ نیچے گرتی ہے جیسے خزاں کا سوکھا پتہ۔

جب خزاں کا پتہ زمین پر گرتا ہے تو ہوا کا نغمہ سنائی دیتا ہے۔ لیکن جب میں اپنے اندھیرے مکان کے اوبڑ کھابڑ زینے پر چڑھتا ہوں تو مجھے کوئی نغمہ سنائی نہیں دیتا۔ اپنی متلاطم سانس ضرور سنائی دیتی ہے۔ حالانکہ یہ تلاطم نہیں ہے۔ تلاطم ہو تو جانے کیا سے کیا ہو جائے۔ بیس سال سے میں اسی زینے پر چڑھ رہا ہوں اور اتر رہا ہوں۔ کیسی اندھیری روشنی ہے، کیسا روشن اندھیرا ہے اس بھوت کے دل میں، یہ کچھ میں جانتا ہوں اور میرا دل۔

میں کبھی جیل نہیں گیا ہوں۔ ایک بار جاتے جاتے بچا ہوں۔ کیوں اور کیسے یہ خیال آتے ہی میری رگوں میں خون جم جاتا ہے۔ کبھی کبھی ڈاکوؤں، چوروں اور قاتلوں کے جیل میں ٹھونسے جانے کا حال اخباروں میں پڑھتا ہوں۔ میری آنکھوں میں جیل کی عمارت ابھرتی ہے...... سنگ مرمر کی ڈھلی ہوئی سڈول، سجل عمارت۔ چاروں طرف پھولوں کی کیاریاں ہیں، رات کی رانی مہک رہی ہے۔ سرو کے پیڑ درباریوں کی طرح دم بخود کھڑے ہیں، جھن جھن، جھن جھن...... زنجیر بج رہی ہے، بہار آرہی ہے...... اور پھر یہ سب کچھ مٹ جاتا ہے اور اس بھوت کے پیٹ کا اندھیرا ہوتا ہے اور میں۔ اے جیل، اے چاند، تو کتنا حسین ہے۔ کیا میں کبھی تیری آغوش میں پناہ نہیں لے سکتا؟ میری لرزتی ہوئی روح پوچھتی ہے۔ کہیں سے آواز آتی ہے۔ ”ہمت ہے تو قتل کرو، ڈاکہ ڈالو، کسی حسینہ کو پھول کی طرح مسل ڈالو، اور یہ سب نہ ہو سکے تو زمانے کو بدل ڈالنے کے خواب دیکھو...... پھر تم ہوں گے اور میری بجھی ہوئی ٹھنڈی آغوش...... آؤ، آؤ......“

میں سہم جاتا ہوں اور اپنے خیال سے، اپنے وجود سے ڈرنے لگتا ہوں اور اپنے پرانے کمبل میں منہ لپیٹ کر سو جاتا ہوں جس میں ہزاروں محرومیوں اور رستی ہوئی بے خواب راتوں کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ ”نہیں نہیں مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہئے، نہ مرمریں عمارت، نہ رات کی رانی، نہ چاند......

میں یہیں خوش ہوں، یہیں جہاں میری زندگی کے بیس سال دفن ہیں۔“

بیس سال سے میں ایک ہی قسم کے چہرے دیکھ رہا ہوں۔ ایک ہی قسم کی باتیں سن رہا ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ جب سے مجھے بینک میں نوکری ملی اور مین اس گھونسلے میں رہنے لگا یہاں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ذرا بھی نہیں۔ لوگ پیدا بھی ہوئے اور مرے بھی۔ کچھ چلے بھی گئے، کچھ آئے بھی۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ یہاں رہتے ہوئے نئے لوگوں کے چہرے بھی پرانے لوگوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ مکان میں رہنے والے لوگوں میں درودیوار کے اکھڑتے ہوئے پلاستر کا، اندر ہی اندر بل کھاتے ہوئے دھویں کا، میلے کچیلے پوتڑوں، زنگ آلود تاروں پر، بدروحوں کی طرح پھڑ پھڑاتے ہوئے، گیلے کپڑوں کی بو کا، دواؤں کی لڑھکتی ہوئی خالی شیشیوں کا، پرانے جوتوں کو کترتے ہوئے چوہوں اور کاغذوں میں سرسراتی ہوئی چھچھوندروں کا، ناگہاں سروں پر گرتی ہوئی راکھ اور کوڑے اور سڑی ہوئی دال کا انسان کی شخصیت پر یکساں اثر کیوں نہ پڑے؟ آخر کہتے ہیں نا کہ انسان ایک ایسا جانور ہے جس کی نشو ونما پر ماحول کا اثر پڑتا ہے۔ یعنی ماحول ایک سانچا ہے اور انسان اینٹ۔ میں بھی اسی سانچے میں ڈھل کر اینٹ بن گیا ہوں۔ یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن ہے سچ۔ خدا کی قسم سچ سے زیادہ عجیب اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟

میرا کمرہ چھوٹا ہے تو کیا ہوا میں تو اکیلا رہتا ہوں۔ لیکن یہ جو پڑوس کے کمرے ہیں جن کے دروازوں پر بڑی شان سے ٹاٹ کے مٹیالے پردے پڑے ہوئے ہیں، ان میں تو پورا پورا خاندان رہتا ہے۔ کیا جاڑا، کیا گرمی، کیا برسات، وہ اسی شان سے چین کی بنسری بجاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تو میں نواب سے کم نہیں۔ یہ جھلنگ چارپائی میری شریک حیات ہے۔ لیکن ایسی کوئی بلاشرکت غیرے بھی نہیں۔ کھٹمل بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھے زندگی نے تسلیم و رضا کا جو سبق پڑھایا ہے، اس سے بڑا فائدہ ہے۔ میں اپنے بینک میں کھٹملوں کے ساتھ اچھی طرح نباہتا چلا آرہا ہوں اور اپنے کمرے میں بھی۔ مجھے تو غضب کی نیند آتی ہے، بادل کی طرح ٹوٹ کر۔

سالے بادشاہ کو بھی اس شان کی نیند کاہے کو کبھی آتی ہوگی۔

جاڑے کی ٹھٹھری ہوئی رات ہے، آدھا چاند شیشم کے درختوں کے اوپر بجھ رہا ہے، جھیل میں طرح طرح کے بلوریں سائے ایک دوسرے میں جذب ہو رہے ہیں، جھینگر بول رہے ہیں اور ہوا اپنے پروں پر، کسی دکھے ہوئے دل کا ادھورا گیت لیے پھر رہی ہے...... جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اینٹ نہیں ہوں، پتھر نہیں ہوں اور کوئی چیز میرے سینے میں ٹوٹ رہی ہے۔ تب میں بے چین ہو جاتا ہوں اور کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں۔ میری آنکھیں اسی مکان کی سیاہ دیواروں سے ٹکراتی ہیں۔ پڑوس کے کمرے میں کوئی بچہ روتا ہے، باپ گرجتا ہے اور ایک عورت کی سسکیوں کی آواز آتی ہے۔

"کہاں سے لاؤں ڈاکٹر...... اگر ایسا ہی ہے تو جا منہ کالا کر......"

پھر سسکیوں کی آواز آتی ہے اور نہ جانے کیوں کسی کی کلائیوں کی چوڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

میں چاند کی تلاش میں ہوں جو دکھائی نہیں دیتا، میری آنکھیں جھیل کے جھلملاتے پانی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ لیکن دیواریں کچھ دیکھنے نہیں دیتیں۔ میرا دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے۔ کسی کمرے کے کواڑ چرچرا رہے ہیں۔ کسی کے قدموں کی آہٹ میرے کمرے کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ آج بھی وہی ہوا۔ ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے۔ آہٹیں کبھی میرے دروازے کے سامنے نہیں رکتیں، بس گزر جاتی ہیں، ہوا کی طرح جو نہ جانے کہاں جا رہی ہے، جو نہ جانے کس درخت کی شاخوں سے کھیل رہی ہے۔

مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب میں نے پہلی بار اس مکان میں قدم رکھا تھا۔ میں نقلی اون کی بھوری پتلون پہنے ہوئے تھا جو میں نے قرض لے کر بینک کی نوکری کے لیے سلوائی تھی۔ میں اس وقت پچاسی روپے پر بحال ہوا تھا۔ جب میں بہت دبلا پتلا تھا۔ لوگ مجھے پہلی نظر میں دق کا مریض سمجھتے تھے۔ رنگ بھی تو میرا زرد تھا۔ بال بہت گھنے تھے، بالکل سیاہ اور نہ جانے کیوں ہمیشہ بھیگے بھیگے سے رہتے تھے حالانکہ نہانے کے معاملے میں بڑا کاہل تھا میں۔ میری پتلون نئی تھی اور مجھ سے زیادہ پتلی دبلی۔ اس لیے

چلتا تھا تو لگتا تھا کوئی رانوں میں چٹکیاں بھر رہا ہے۔
جیسے ہی میں نے یہ دروازہ کھولا بڑے زور کا بھبکا آیا۔
لیکن صاحب میرے دل میں اتنا جوش، اتنی امید، اتنی خوشی تھی کہ میں روشنی کی کرن کی طرح اندھیرے کمرے میں دوڑتا چلا گیا۔ میں نے پچھواڑے کی کھڑکی کھولی۔ سرمئی رنگ کی بہت سی دیواریں آنکھوں سے ٹکرائیں۔ اس طرف جو مکان تھا اس کے صحن میں ایک گائے بندھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی بڑی محبت سے آنکھ ماری اور دم ہلائی۔ خوشی سے میرا دل بلیوں اچھل گیا۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکالا کہ اس کا شکریہ ادا کروں۔ ابھی میری مسکراہٹ ہونٹوں کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلی بھی نہیں تھی کہ کوئی چیز دھم سے میرے سر پر گری اور بکھر کر رہ گئی۔ ساتھ ہی میری نظر میں، میرے دماغ میں جتنی چیزیں تھیں وہ بھی بکھر گئیں۔
سب سے پہلے میں نے ناک پر انگلی پھیری۔ عینک غائب تھی۔ میں نے آنسو پونچھے اور نیچے جھانک کر دیکھا۔ گوبھیوں کی کیاری کے کنارے کوڑے کرکٹ کا بہت بڑا ڈھیر تھا۔
یکایک پھر کوئی چیز جھنجھناتی ہوئی آئی اور سر پر گری۔
یہ قہقہہ تھا کسی کا۔
میں نے زمین سے نظر اٹھائی اور پلٹ کر اوپر دیکھا۔ کرم کلے کی طرح ایک بڑا سا گول چہرہ ساتویں منزل کی کالی کھڑکی سے جھانکتا دکھائی دیا۔ کرم کلے کا منہ کھلا۔
"الو کی دم تو سر کیوں نکالتا ہے سنگل کی طرح۔ کیا یہ تیری ماں کا جھروکا ہے؟"
میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سر اندر۔
ایک اور قہقہہ پھٹ پڑا۔
"نہ جانے بھینس کا انڈہ کھانے والے مرغے اسی ڈربے میں مرنے کو کیوں آجاتے ہیں؟"
میری آنکھیں اب بھی بند تھیں اور دانتوں میں راکھ پھنس رہی تھی۔

"کون ہے؟" ایک سہمی ہوئی آواز، ہوا کی طرح گنگناتی ہوئی آواز آئی اور مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل پر ٹھنڈی شبنم کی طرح ایک بوند ٹپک گئی۔

"اے ہے ہوتا کون؟ ہوگا کوئی مردار نیا کرایہ دار۔"

"اماں ایسی ویسی بات کیوں کہو کسی بھلے آدمی کو؟" پھر شہد کی ایک بوند میرے دل پر ٹپکی۔

"ہوگا کہیں کا بھلا آدمی۔ دنیا جہان کے سارے چور اچکے یہیں آکر مرتے ہیں۔ بڑا آیا کہیں کا بھلا آدمی۔ بھلا آدمی ہوتا تو یوں کوڑے کے نیچے اپنا سر دیتا...... بڑا آیا کہیں کا بھلا آدمی!"

ساتویں منزل کی کھڑکی زور سے بند ہوئی اور آواز کٹ گئی۔ بیس سال ہوگئے۔ پر آج بھی جب میں بینک سے آتا ہوں اور اپنی چارپائی پر لیٹتا ہوں اور تھکن سے آنکھیں بند کر لیتا ہوں تو یہ آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ بیس سال سے یہ آوازیں یہاں بند ہیں۔ کرم کلے جیسے چہرے کی گالی اور کسی لڑکی کا گھبرایا ہوا سوال...... "کون ہے!"

نہ جانے کیا بات ہے جب یہ سوال گونجتا ہے تو کمرے میں اجالا ہو جاتا ہے۔ آنکھیں بند ہیں لیکن میں دیکھ سکتا ہوں۔ میں ان تھرتھراتی ہوئی آوازوں کو دیکھ سکتا ہوں۔ ان کا رنگ چاندی جیسا ہے، یہ آوازیں ہیں یا پرندے...... ننھے ننھے پر ہوا میں تھرتھرا رہے ہیں اور مجھے اڑائے لیے جا رہے ہیں۔ یہاں نہ کوئی چھت ہے، نہ دیواریں، نہ ٹمٹاتا ہوا بے جان بلب، نہ اکھڑتے ہوئے پلاستر اور سیلن کی بو...... نہ اندھی چمگادڑوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ، نہ تیل چٹوں کی سرسراہٹ، نہ جھینگروں کی ٹرٹر، نہ تام چینی کی مبروص پلیٹیں...... نہ اسٹوو کی کالک، یہاں کچھ بھی نہیں...... نیلا آسمان ہے، چودھویں کا چاند ہے اور آوازیں ہیں جن کے پروں پر میں اڑ رہا ہوں۔ آسمان کتنا قریب ہے، زمین کتنی دور ہے! جب آسمان اتنا قریب آجاتا ہے اور زمین اتنی دور ہو جاتی ہے تو نہ جانے کیوں نشاط کی شدت سے دم گھٹنے لگتا ہے اور میں ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح زمین پر آجاتا ہوں۔ کمرے کی منحوس دیواریں مجھے گھیر لیتی ہیں اور

بلب کی زرد روشنی میں بھی اندھیرا چاروں طرف سے مجھے دبانے لگتا ہے۔ کوئی نڈر تیل چٹا میرے پیروں پر سرسراتا ہے، کونے میں چوہے دوڑتے ہیں اور پیٹ میں بھی۔ لیکن میں پڑا رہتا ہوں کیونکہ کوئی میرے کانوں میں کہتا ہے۔

"لو تم اب بجھے کہ تب بجھے۔"

"میں وہ چراغ ہوں جو کبھی جلا ہی نہیں۔" میں ہنستا ہوں۔

"بھائی اس جگ کے کھیل نیارے ہیں۔ یہاں وہ چراغ بھی بجھ جاتے ہیں جو کبھی جلے ہی نہیں۔"

یہ آواز دور سے آتی ہے اور مجھے اپنی طرف پکارتی ہے اور تب مجھے لگتا ہے کہ یہی آواز ازل بھی ہے اور ابد بھی۔ میں اسی آواز میں شروع ہوتا ہوں اور اسی آواز میں ختم ہو جاتا ہوں۔ پھر میں دیکھتا ہوں، صاف دیکھتا ہوں، یہ آواز نہیں، جنگل ہے اور میں اس کی آغوش میں چھپے ہوئے سیاہ دلدل میں ڈوب رہا ہوں...... جب ڈوب ہی رہا ہوں تو ایسے میں بیچے کون جائے، بھوت کے ہوٹل میں جہاں ٹیڑھی میڑھی لوہے کی میزوں پر جھکے ہوئے پسینے میں شرابور لوگ پالک کا ساگ اور تنوری روٹیاں اڑا رہے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو کھا نہیں رہے ہیں، صرف بیڑی پی رہے ہیں، لیکن وہ بھوکی آنکھوں سے کھانے والوں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کے منہ سے رال ٹپک رہی ہے۔ میرے منہ سے کبھی رال نہیں ٹپکتی۔ میں اپنے کمرے میں پڑا پڑا یہ سارا تماشہ دیکھ رہا ہوں، بیس سال سے دیکھ رہا ہوں۔

میرے کمرے میں کوئی آئینہ نہیں ہے۔ اس لیے نہیں کہ میں بینک کا ایسا کلرک ہوں جو اپنی صورت دیکھنے کو آئینہ بھی نہیں خرید سکتا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اپنی بوڑھی ماں، بیوہ بہن اور اس کے بچوں کے لیے روپیہ بھیجنے کے بعد ایک آئینہ خریدنے بھر پیسے بچتے ہی نہیں جیب میں۔ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ چاہوں تو ایک وقت کا کھانا نہ کھاؤں اور ایک دو آئینے خرید لاؤں۔ آئینہ نہیں ہے تو کیا ہوا، میں جانتا ہوں اب میں وہ دبلا پتلا چھریرا نوجوان نہیں رہا ہوں جو بیس سال پہلے تھا، جب میں نے

پہلی بار اس سات منزلہ مکان میں قدم رکھا تھا۔ اب میرا چہرہ گول ہو گیا ہے۔ جب بینک میں لوگوں کی نظر بچا کر صاحب کے آئینے میں دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی مونچھیں ضرورت سے زیادہ گھنی معلوم ہوتی ہیں، میری ناک کتنی موٹی ہو گئی ہے اور ٹھوڑی کیسی دوہری ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے چہرے پر عجیب سی گھناؤنی زردی نظر آتی ہے، بالکل چھپکلی کے پیٹ والی۔ میرا جی متلانے لگتا ہے لیکن صاحب کی سرمئی فلٹ ہیٹ پر نظر پڑتے ہی جی سنبھل جاتا ہے۔ ہیٹ جو بینک کے بڑے آئینے کے اوپر ہرن کے سینگ پر پڑی رہتی ہے اور نہ جانے کیوں یہ دیکھ کر میرے دل میں خوشی کا ایک بلبلا ابھرتا ہے جو فوراً ٹوٹ جاتا ہے۔ میری نگاہیں تیزی سے گنجے ہوتے ہوئے چمکدار سر پر پھسل جاتی ہیں۔ پھر اس آئینے میں بہت دور سے دوسرے چہرے ابھرتے ہیں۔ یہ چہرے جونیئر بھی ہیں اور سینئر بھی۔ لیکن ان سب کے ہونٹ مڑے ہوئے ہیں جیسے منہ چڑا رہے ہوں۔ اس وقت مجھ پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے اور میں لڑکھڑاتا ہوا اپنے کاؤنٹر پر جا بیٹھتا ہوں۔ میں یہ سوچ کر پانی پانی ہو جاتا ہوں کہ میں بیس برس میں اتنا بدل گیا ہوں۔ اب مجھ میں عجیب سا گل گلا پن پیدا ہو گیا ہے جیسے ابلی ہوئی ٹھنڈی بھنڈی۔ ایک عدد چھوٹی سی توند بھی نکل آئی ہے۔ مجھے اس کا بہت غم ہے کہ اب وہ نقلی اونی پتلون نہیں پہن سکتا جس کے گھٹنوں پر پیوند لگے ہوئے ہیں۔ ہر چیز ٹھہری ہوئی ہے۔ میں رکا ہوا ہوں لیکن حلیہ بدل گیا ہے۔ یہ کیا ہے؟

یہاں رہنے والے سب ہی ایک جیسے ہیں لیکن ایک جیسے نہیں ہیں۔ سب ہی اس مکان کی طرح سات منزلہ ہیں اور پر پیچ بھی۔ اندر سے بھی باہر سے بھی۔ ان سب پر کائی اور پھپھوندی جمی ہوئی ہے۔ ان کا پلاسٹر اکھڑ رہا ہے اور ان کی زندگی میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ اب وہ عورت جو ساتویں منزل پر رہتی ہے بری عورت نہیں ہے۔ اس کا چہرہ سیٹھے کرم کلے جیسا ہے تو کیا ہوا۔ عید آئی تو اسی نے سب سے پہلے میرے اندھیرے کمرے میں سویاں بھجوائیں۔ پان اور الائچیاں بھجوائیں۔ اس کا شوہر مرغیاں اور انڈے بیچتا ہے۔ کبڑا اور چیچک رو ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس کا دل بڑا غنی ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ اس کی روح بھی کبڑی ہے اور اس کے دل میں چیچک ستاروں کی طرح چٹکی ہوئی ہے۔ مجھ سے نفرت کرتا ہے میں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ بگاڑ بھی کیا سکتا ہوں اس مرغی والے کا۔ کبڑا بالکل لوہے کے پتلے کی طرح چلتا ہے، پیر پٹک پٹک کر، جانے کیا بڑبڑاتا ہوا۔ میں اس کی ہر زیادتی کو معاف کر سکتا ہوں مگر جب وہ مجھے دیکھ کر، زور سے کھانستا اور تھوکتا ہے تو میرے کان جل اٹھتے ہیں۔ اس وقت، صرف اس وقت، مجھے یقین ہوتا ہے کہ میں لکڑی کا سڑا ہوا کندہ نہیں ہوں جو صدیوں سے وادی کی آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی ندی میں بہہ رہا ہو۔

یہ رات کتنی خوبصورت ہے۔ جو چیز خوبصورت ہوتی ہے اتنی خطرناک کیوں معلوم ہوتی ہے۔ چاندنی دھوپ کی طرح کھری نہیں ہوتی۔ لو دیکھو اس وقت کھڑکی سے کیا کچھ نظر آ رہا ہے۔ کچھ دھندلے دھندلے سائے، کچھ مبہم مبہم سی لہراتی ہوئی بیلیں، کچھ مکانوں کی چھتوں پر دھوپ چھاؤں کا غبار سا اڑتا ہوا، درخت ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے، اور جھیل جیسے زیر لب گنگنا رہی ہو۔ دن کے وقت تو ایسا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اسی لیے میں رات سے ڈرتا ہوں۔ لو پھر وہ آواز سن رہا ہوں......

"کون ہے؟" کوئی پوچھ رہا ہے۔ نہ جانے کیوں جب میں یہ آواز سنتا ہوں تو لگتا ہے کہ پہاڑی جھرنے میں بہا جا رہا ہوں۔ پھر لگتا ہے میں خود نور کا جھرنا ہوں اور بڑی اونچائی سے سیاہ چٹانوں پر گر رہا ہوں، گر رہا ہوں اور دودھیا موتیوں کی طرح بکھر رہا ہوں۔

کوئی دبے پاؤں آ رہا ہے اور میرے تار جیسے سخت بالوں میں انگلیوں سے کنگھا کر رہا ہے۔

"کون ہے؟"

اب میں کیا بتاؤں۔ میں کون ہوں! یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں کوئی نہیں ہوں۔ پھر...... ہوتا تو ضرور ہوتا، مگر اب جو نہیں ہوں تو کیسے کہوں کہ ہوں۔ اور جو نہیں ہوں تو پھر دل سے نور کا چشمہ کیسے پھوٹ رہا ہے۔ لیکن یہ دل ہے کیا چیز۔ میں دل ہوں یا دل میں ہوں۔ میرا مطلب ہے میں دل میں ہوں یا دل مجھ میں

ہے۔ نہیں یوں نہیں۔ اب میرے دماغ میں کچا دھاگا سا کیا الجھ رہا ہے۔ یہ رگیں ہیں یا چاندی کے تار۔ چوہیا میرے تلوے کو گدگدا رہی ہے اور میں الجھ رہا ہوں۔ کوئی گدگدائے تو کہتے ہیں ہنسی آتی ہے۔ مجھے تو نہیں آتی۔ پھر آواز آ رہی ہے: ''کون ہے!'' اب میں اس کا کیا جواب دوں۔

چاندنی کی ایک بلوریں اور شفاف قاش میرے کمرے کے میلے فرش پر گر رہی ہے۔ کمرے میں آئی ہوئی چاندنی کو کون لوٹاتا ہے۔ لیکن میں آنکھیں تو موند سکتا ہوں۔ لو یہ بھی نہیں ہوتا مجھ سے اور چاندنی میری آنکھوں میں، دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے اور مجھ سے کہہ رہی ہے ''تم کتنے اکیلے ہو!'' کہہ رہی ہے اور ہنس رہی ہے۔ اور جب چاندنی ہنستی ہے تو نہ جانے کیوں میں اکیلا ہو جاتا ہوں۔ اب یہ چوہیا جانے کب تک گدگدائے جائے گی مجھے۔ آج میں روٹی لانا جو بھول گیا تو وہ غریب کرے کیا۔ جب روٹی نہیں کترے گی تو گدگدائے گی ضرور۔ تیل چٹے بھی سرسرا رہے ہیں اور جھینگر چیخ رہے ہیں۔ رات نکلتی جا رہی ہے، چاندنی نکھرتی جا رہی ہے، میری تنہائی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ تنہائی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اور اس تنہائی میں یہ آواز پھر گونج رہی ہے۔ میری تنہائی ایک اندھا کنواں ہے جس میں آواز پتھر کی طرح گر رہی ہے۔ ''کون ہے؟'' کوئی نہیں! کوئی نہیں!

لیکن کوئی دبے پاؤں آ کر میری جلتی ہوئی آنکھوں کو نرم انگلیوں سے سہلا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ کون ہے۔

میں گھبرا کر کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں اور سامنے والے چھجے پر وہی بوڑھا رنگریز سبز لنگی کو گھٹنوں تک اٹھائے نظر آتا ہے۔ اس کی ایک آنکھ پر اس وقت بھی وہی چکٹ سبز پٹی جھنڈی کی طرح لٹک رہی ہے جس پر شیشے سے محروم عینک کا فریم دھرا ہوا ہے۔ رات کا وقت ہے اس لیے سبز پٹی سیاہ دھبہ معلوم ہو رہی ہے۔ اس کی ننگی توند بھیگی ہوئی مشک کی طرح اندھیرے میں بھی چمک رہی ہے۔ وہ خاموش کھڑا ہے۔ اس کا چہرہ بالکل بے جان نظر آ رہا ہے اور اس کی توند میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ

رنگریز ناک سے سانس نہیں لیتا بلکہ اس کی توند میں ناف کی جگہ ربڑ کی ناک فٹ ہے جو تیزی سے ہوا کو اندر کھینچتی ہے اور اسی تیزی سے چھوڑ دیتی ہے۔ میں اس رنگریز کو شروع سے اسی طرح دیکھ رہا ہوں۔ اس کی عمر نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی ہے۔ یہ آدمی ہے یا دیوارِ چین۔ اس کو دیکھ کر ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ نظر آرہا ہے وہی سب کچھ نہیں ہے۔ کچھ اور بھی ہے جو دیوارِ چین کے اس پار ہے، لیکن اس پار جھانک کر دیکھے تو کون دیکھے۔ چلو یہی ٹھیک ہے، اور اس کی ایک آنکھ کو کسی ڈائن کی نظر کھا گئی۔ سر گھٹا ہوا ہے۔ لیکن اتنا چکنا اور مریل سا سر ہے کہ کیا مجال جو اسے دیکھ کر ہتھیلیوں میں کھجلی ہو۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ رنگریز جو حاجی صاحب کہلاتا ہے آخر کیا سوچ رہا ہے۔ اسے دیکھ کر تو یہی خیال ہوتا ہے کہ دماغ پانی جذب کر سکتا ہے، سوچ نہیں سکتا۔ وہ پچھواڑے والی گلی کے اس پار بند کھڑکیوں کو دیکھ رہا ہے جو پچھلی برسات سے بند ہیں۔ یہ مکان بھی اسی سات منزلہ مکان کا ایک اندھیرا حصہ ہے جس میں میں رہتا ہوں۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کھڑکیاں کبھی کھلی ہی نہیں۔ حالانکہ مجھے خوب یاد ہے کہ یہ کھڑکیاں پچھلی برسات کو کھلی رہتی تھیں۔ چوبیس گھنٹے کھلی رہتی تھیں۔ اور وہاں کھڑکیوں کے پیچھے جو کچھ ہوتا تھا سب نظر آتا تھا، کیونکہ وہاں کوئی دیوارِ چین نہیں تھی۔ وہاں کوئی پچاس برس کا ایک مریل سا، بالکل کھٹائی جیسا سوکھا ہوا انسان رہتا تھا۔ وہ بڑی نفیس دھوتی اور ریشمیں کھادی کا کرتا پہنتا تھا۔ جس کے گریبان میں سونے کے بٹن اور زنجیریں جھلملاتی رہتی تھیں۔ اس کے بال سور کے بال کی طرح نظر آتے تھے، تیل میں بھیگے مگر کھڑے ہوئے، جیسے خوف سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی جھریوں میں سرد گرم دیکھی ہوئی زندگی کی نرمی نہیں ہوتی، ...... لگتا تھا کسی نے نشے میں چھینی ذرا گہری اور آڑی ترچھی دوڑا دی تھی۔ اس کا رنگ پیلا تھا، چینیوں یا جاپانیوں کی طرح۔ ناک پتلی تھی، اٹھی ہوئی۔ جب شام کو کھڑکیوں کے سامنے والا دروازہ کھلتا اور وہ بغل میں چھتری دبائے ہوئے اندر آتا تو اس کی ناک پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپتی ہوئی معلوم ہوتی۔ آتے ہی وہ چھتری کونے میں

پھینکتا، سفید فرش پر بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھتا۔ جب مرد اس گھر میں رہنے آیا تو اکیلا آیا تھا۔ پھر وہ چند دن کو غائب ہو گیا اور کھڑکیاں کھلی چھوڑ گیا۔ ایک رات لوٹا تو اس کے ساتھ ایک عورت تھی...... کھڑکیاں اب بھی کھلی ہوئی تھیں۔ وہ شام کو چھتری دبائے ہوئے آتا اور سفید فرش پر بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھتا رہتا، دیکھتا رہتا۔ اس کے پتلے ہونٹ ہلتے، سنہرے دانت چمکتے، اس کی ناک اور زور سے تھرکتی۔ وہ جھکتا اور عورت کی چھاتیاں پکڑ کر اٹھاتا، وہ سر اٹھا کر مرد کی آنکھوں میں دیکھتی اور کھڑی ہو جاتی۔ مجھے نہ جانے کیوں عورت کی آنکھوں میں شیشہ سا پگھلتا اور چھلکتا ہوا نظر آتا۔ عورت کھڑی ہو جاتی اور مرد اس کی چھاتیوں کو دانت پیس کر دباتا۔ عورت کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ بالائی ہونٹ کے اوپر تل پسینے میں چمکنے لگتا۔ اس کی پیشانی پر موتی جھلکنے لگتے، مرد کانپنے لگتا۔ وہ کانپتا اور عورت مسکراتی۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں کی مسکراہٹ کتنی عجیب ہوتی ہے! مرد یکایک اس کی چھاتیاں چھوڑ دیتا اور اس کے بال نوچنے لگتا، لیکن کچھ اس طرح جیسے چاند کو بادلوں میں چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ گھنی زلفیں عورت کے چہرے پر بکھر جاتیں۔ عورت مرد سے قد میں نکلتی ہوئی تھی۔ اس لیے اگر اسے پیار کرنا چاہتا تو زیادہ سے زیادہ اس کی گردن یا ٹھوڑی کے نچلے حصے تک پہنچ سکتا تھا۔ لیکن نہ عورت جھکتی اور نہ وہ عورت کے ہونٹوں تک پہنچتا۔ وہ عورت کی زلفیں پریشان کر کے کونے کی طرف لپکتا اور چاندی کی طرح چمکتے ہوئے گلاس میں صراحی سے پانی انڈیلتا اور غٹا غٹ پی جاتا۔ پھر عورت کی طرف لوٹتا اور مجھے محسوس ہوتا کہ عورت کا پورا جسم بید مجنوں کی شاخ کی طرح لرز رہا ہے۔ بید مجنوں کی شاخیں جھکی رہتی ہیں لیکن یہ شاخ نیزے کی طرح سیدھی تھی۔ مرد اس کے پاس آتا۔ بڑے اطمینان سے اس کے بلاؤز کے بٹن کھولتا۔ بلاؤز فرش پر گر جاتا۔ وہ تھوڑی دیر انگلیوں میں چھپے ہوئے صحت مند جسم کو دیکھتا رہتا جیسے سوچ رہا ہو اس سرکش کا سر کیسے کچلا جائے۔ پھر وہ پھدک کر عورت کے پیچھے چلا جاتا۔ انگیا ڈھیلی پڑتی اور خدا کی قسم ایسی روشنی پھوٹتی، ایسی روشنی پھوٹتی کہ مجھے خود اپنی آنکھوں سے ستارے جھڑتے ہوئے محسوس ہوتے۔

مرد پھدک کر پھر عورت کے سامنے آجاتا،اس کا ہاتھ عورت کی کمر کی طرف بڑھتا اور سفید پیٹی کوٹ فرش پر بڑے سے سفید گلاب کی طرح ڈھیر ہو جاتا۔ مرد دو تین قدم پیچھے ہٹتا اور اسے حیران آنکھوں سے دیکھنے لگتا۔ اس وقت اس کی پتلی مونچھیں بھیگ سی جاتیں۔ وہ سپہ سالار کی طرح کھڑا رہتا اور میدان جنگ میں قتل و خون کا تماشہ دیکھتا رہتا۔ حالانکہ مجھے لگتا کہ وہ چھوٹا سا کیڑا ہے اور سنگ مرمر کے حسین مجسمے کے سامنے کھڑا ہے۔ کبھی کبھی لگتا یہ مجسمہ نہیں خدا ہے۔ خدا کتنا حسین ہے،اس کا جسم کتنا سڈول ہے، شبنم میں بھیگا ہوا، روشن اور پاک۔ اس وقت میرے دل میں پرندہ جاگ اٹھتا اور پر پھڑ پھڑانے لگتا۔ کوئی کہتا جاؤ اس روشنی سے لپٹ جاؤ۔ اس کی آنکھوں کو چومو، ان سڈول کولہوں کو آنکھوں سے چومو اور چمکتی ہوئی رانوں پر سر رکھ دو۔ خدا کھڑا ہے اور میں کتنا بے بس ہوں۔ مرد لپکتا اور روشنی کے حسین اور لچکدار جسم کو فرش پر گرادیتا۔ میں آنکھیں بند کر لیتا۔ مجھ سے خدا کی روز روز کی شکست دیکھی نہ جاتی۔ اسی غم میں مجھے نیند آجاتی۔

لیکن ایک رات ایسا ہوا کہ مجھے نیند نہیں آئی۔ برسات کا موسم تھا۔ بادل موسلا دھار برس رہے تھے۔ بجلی کی چمک بار بار میرے کمرے میں آتی اور پھر جھپٹ کر سامنے والے کمرے میں غائب ہو جاتی۔ جہاں وہی عورت بیٹھی کڑھائی کر رہی تھی اور گنگنا رہی تھی۔ اس کی ناک کی کیل سرخ ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا ہاتھ رک جاتا اور وہ کھڑکی کی سلاخوں کو دیکھنے لگتی۔ میں اس کی گنگناہٹ نہیں سن سکتا تھا کیوں کہ بارش کی سرسراہٹ میں اس کی آواز ڈوب گئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کے ہونٹوں کی حرکت سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ کوئی اداس گیت گا رہی ہے،اس کا دل بوند بوند اس کے ہونٹوں سے ٹپک رہا ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں اس کے پاس جاؤں۔ لیکن میں کیسے جاتا...... سامنے کھڑکی کی سلاخیں تھیں اور میں پرندہ نہیں تھا۔ اور دروازے پر باہر سے تالا پڑا ہوا تھا جس کی کنجی اس سوکھے ہوئے مریل مرد کے جنیؤ سے بندھی ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ کسی نے عورت کو ٹھوکا دیا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔

مسکرائی۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی لگا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ میں لپک کر اپنی کھڑکی پر کھڑا ہو گیا۔ بجلی چمکی اور آنکھوں میں چاندی کے ان گنت تار لرز اٹھے۔ میں نے اپنے کمرے کی بجلی بجھا دی۔ سامنے والا دروازہ کھلا۔ مرد سر جھکائے اندر آیا۔ اس کی بغل میں چھتری نہیں تھی۔ ہاتھوں میں بڑا سا تالا اور کنجیاں تھیں۔ اس نے تالا فرش پر پھینک دیا۔ سیدھا عورت کی طرف بڑھا اور اس کی کمر میں ایک لات ماری۔ میرے دانت بج اٹھے۔ عورت نے سر جھکا لیا۔ مرد جھکا۔ اس کے گریبان میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیر ہوا میں جھولنے لگی۔ اس نے عورت کے بال پکڑے اور اسے زمین پر پچھاڑ دیا۔ وہ اس پر بھوکے بلے کی طرح ٹوٹ پڑا۔ عورت کے کپڑوں کی دھجیاں اڑنے لگیں۔ اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ عورت کی ننگی ننگی ٹانگیں فرش پر تڑپ رہی تھیں اور مرد اس کی رانوں کے اوپر جھاگ کی بہت بڑی موج کی طرح لرز رہا تھا۔ مرد اچھل کر اس کے سینے پر کھڑا ہو گیا۔ عورت ایک ہی جست میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس میں دیوی کے مجسمے والی بات نہیں تھی۔ اس کے جسم میں مرمریں ٹھنڈک نہیں تھی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اس رات پہلی بار اس کو دیکھ کر میرے دل میں خوف کا اندھیرا چھانے لگا۔ روشنی کہاں تھی...... مرد عورت کے دھکے سے اب تک لڑکھڑا رہا تھا۔ عورت خاموشی سے اسے گھورتی رہی۔ پھر وہ چوکے میں گئی۔ اس نے کھانا پروسا۔ پیتل کی تھالیاں چاند کی طرح چمک رہی تھیں۔ مرد سب کچھ بھول گیا اور کھانا کھانے لگا۔ عورت ان ہی نچے ہوئے کپڑوں میں بیٹھی اسے گھورتی رہی۔ اس کا چہرہ تمتایا ہوا تھا۔ مرد کھانا کھا رہا تھا۔ وہ ہر لقمے کے بعد ایک لقمہ عورت کی کالی بلی کے آگے رکھ دیتا جو فوراً اسے چٹ کر جاتی۔ عورت آہستہ آہستہ کالی بلی کی گردن سہلا رہی تھی۔

رات گزرتی رہی اور میں اس کے دھارے میں بہتا رہا۔ میری آنکھوں میں سیاہ روئی کے سیاہ گالے اڑتے رہے۔ سامنے والی کھڑکی کی روشنی بجھ گئی۔ صرف میری آنکھیں جلتی رہیں۔ نہ جانے کب میری آنکھیں بھی بجھ گئیں اور بجھی ہوئی آنکھوں میں کوہ قاف کی پری کا مرمریں جسم ابھرتا رہا اور اس کے انگ انگ سے چاند ٹوٹتے

رہے۔ میں سفید بادلوں پر اڑ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بادل کے قالین سے اتری اور میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس سے پوچھا "تم کون ہو؟" وہ مسکرائی۔ "میں عورت ہوں۔" اس کے منہ سے پھول جھڑے اور میری سانس رکنے لگی۔ میں نے اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے حیرت سے کہا "عورت؟" میں نے سر ہلایا۔ "نہیں تم پری ہو۔ کوہ قاف سے آئی ہو۔" اس نے بھی سر ہلایا۔ اس کی زلفیں پریشاں ہو گئیں۔ زلفوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ وہ اور قریب آ گئی۔ اس کے جسم پر کوئی لباس نہ تھا اور پیشانی سے پیروں کے انگوٹھوں تک چاندنی لپٹی ہوئی سانس لے رہی تھی۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا اور میرا دل دھک سے ہو گیا "تم اندھے ہو۔" میں نے سر ہلایا۔ "لیکن میں تمہیں آنکھوں کی جوت دے سکتی ہوں۔" پری نے اتنا کہا اور اپنا گرم سینہ میرے پسینے سے بھیگے ہوئے منہ پر رکھ دیا۔ "دیکھا؟ میں پری نہیں ہوں! عورت ہوں۔ عورت ہوں!!" اور میری آنکھ کھل گئی۔ چاروں طرف دھندلکا چھا رہا تھا۔ میں نے گردن موڑی۔ سامنے والی کھڑکی کے دھندلکے میں وہی عریاں پری جھولتی نظر آئی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ میں نے آنکھیں ملیں اور پھر دیکھا۔ وہی دھندلکا تھا، وہی لہلہاتا ہوا جسم۔ اس کی گردن رسی کے پھندے میں بھنچی ہوئی تھی۔ گردن لٹکتے ہوئے سڈول کولہوں اور گدرائی ہوئی پنڈلیوں کے بوجھ سے کچھ زیادہ لمبی ہو گئی تھی۔ زلفیں اس کے آدھے چہرے کو چھپائے ہوئے تھیں۔ کالی بلی بیٹھی لٹکتے ہوئے بے جان جسم کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بار بار اچھلتی اور لٹکتے ہوئے مرمریں پیروں کو چھو کر پھر نیچے آ جاتی۔

پولیس بھی آئی ہنگامہ بھی ہوا۔ عورتوں نے آنکھیں چمکا چمکا کر اور تالیاں بجا بجا کر رسی کے پھندے میں لٹکتی ہوئی ٹھنڈی عورت کو رنڈی اور چھنال بھی کہا۔ کچھ نیک بختوں نے "غریب" اور "مظلوم گائے" کی موت پر آنسو بھی بہائے اور اس کے لیچڑ اور ظالم مرد کے اٹھتے جنازے کی دعائیں بھی مانگیں۔ وہ سوکھا ہوا پراسرار مرد کھٹائی جیسے چہرے، لرزتے ہاتھوں، چھتری اور سونے کے دانت سمیت غائب ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ کھڑکی بند ہو گئی۔ نہ جانے کتنے برس ہو گئے پر آج تک نہ

کھلی۔ اب اس میں بھوت رہتے ہیں۔ میں نے بھوتوں کو بھی نہیں دیکھا۔ البتہ وہی کالی بلی سراسیمہ سراسیمہ بند کھڑکی کی سلاخوں سے چپکی ہوئی اب بھی نظر آتی ہے جس کی گردن آخری رات عورت کی نازک انگلیوں نے سہلائی تھی۔ بلی میری طرف دیکھتی ہے اور میں اسے چمکارتا ہوں۔ پہلے وہ سہم جاتی ہے۔ پھر اٹھتی ہے، بڑی نرمی سے میاؤں کرتی ہے اور آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس مکان کے دوسرے لوگ اس بلی کے سائے سے بھی لرزتے ہیں۔ جب وہ راستہ کاٹتی ہے تو کوئی اس راستے سے نہیں گزرتا۔ سب کو لنگڑے تانگے والے کا انتظار رہتا ہے جو نہ کالی بلی کا خیال کرتا ہے اور نہ سہمے ہوئے چہروں کا۔ وہ ٹھرا چڑھائے رہتا ہے اور لال لال آنکھوں سے لوگوں کو گھورتا ہے، اپنے مریل گھوڑے کو ماں بہن کی گالیاں دیتا ہے اور کہتا ہے "بلی سے ڈریں گناہ کے بیٹے...... رمضانی وہ ہے جو دامن نچوڑ دے تو فرشتے وضو کریں...... سیاں بھئے کوتوال...... کوتوال......" علاقے کا راجپوت کا توال نہ جانے کتنی بار اس رٹ پر اس کا چالان کرا چکا ہے مگر اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کوتوال کے بول پر پہنچ کر ٹوٹے ہوئے ریکارڈ کی طرح اٹک جاتا ہے اور وہ بڑے لحن سے نشیلی آواز میں چنگھاڑتا ہے...... "کوتوال...... کوتوال......"

مجھے وہ شام یاد آرہی ہے...... شام دھواں دھواں اور بڑی زہریلی ہے۔ میں سات منزلہ بھوت کی اندھی آنکھوں سے دور، جھیل کے کنارے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھا ہوں جس پر بڑی شاداب مخملیں گھاس ٹھنڈی محسوس ہو رہی ہے۔ درختوں کے سرمئی سائے جھیل کے کائی جیسے پانی میں آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں جہاں شفق کے عکس نے آگ لگا رکھی ہے۔ میرے دل پر پتھر کی سل رکھی ہوئی ہے۔

یہ اسی صبح کی تو شام ہے...... اور میں دیکھ رہا ہوں عورت کی گردن رسی کے پھندے میں بھنچی ہوئی ہے اور ایک کالی بلی اچھل اچھل کر......

گھنگروؤں کی جھنکار مجھے چونکا دیتی ہے۔ رمضانی کا تانگہ آکر رک جاتا ہے۔ رمضانی کے گھوڑے کی گردن میں پڑے ہوئے گھنگھرو خوب بولتے ہیں۔ شام کے

سناٹے میں، درختوں پر گھونسلوں میں پرندے پر پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ رمضانی پائیدان پر پیر رکھے بغیر کود جاتا ہے۔ کھانستا ہے۔ پان کی پیک کی ایک لمبی پچکاری پھینکتا ہے...... میرے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں اسے دیکھ رہا ہوں اور لگتا ہے کہ میں اسے نہیں دیکھ رہا ہوں۔ شفق بجھ رہی ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ اس کی مونچھیں آہستہ آہستہ ہل رہی ہیں۔ وہ چابک گھاس پر مارتا ہے۔ گھوڑا چونک جاتا ہے۔ گھنگھروؤں کی آواز فضا میں گھل جاتی ہے۔

"بس مر گئے...... ایک عورت کی جان کیا گئی اور تم بجھ گئے؟"

میں ایک عورت کی لاش کو، ایک دہکتے ہوئے مرمریں جسم کو ہوا میں جھولتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

"عورت؟ کیسی عورت؟"

اور مجھے بادلوں پر اترتی ہوئی پری والا خواب یاد آرہا ہے۔

"ہاہاہا!"

اچانک رمضانی خاموش ہو گیا۔ میں نے شام کے جھٹپٹے میں اس کی جھریوں کو لرزتے دیکھا۔

"زندگی ایسی ہی ہوتی ہے میاں، جگنو ہے جگنو...... جلتی ہے، بجھتی ہے، بجھتی ہے جلتی ہے......"

یہ کیا کہہ رہا ہے بھائی۔ زندگی کیسی ہوتی ہے؟ اور اس زندگی کا کیا رشتہ ہے اس عورت سے جو لاکھوں سال پرانی زمین پر پھول کی طرح کھلتی ہے، چمکتی ہے، مہکتی ہے، مرجھا جاتی ہے، کھو جاتی ہے...... لیکن اس پھول کا کیا رشتہ ہے زندگی سے؟...... کیا خوشبو بھی اڑ گئی؟ لیکن یہ کیوں ہوتا ہے؟ کیسے ہوتا ہے؟

"کیا سمجھتے ہو وہی ایک عورت ایسی تھی۔ نہ جانے میاں دن رات لاکھوں عورتیں رسی کے پھندے میں لٹکتی رہتی ہیں۔ کچھ مر جاتی ہیں، کچھ تڑپتی رہتی ہیں، پر رہتی ہیں اسی رسی کے پھندے میں۔ تڑپتی رہتی ہیں۔ ہاہاہا!"

میں اس شخص کی صورت دیکھ رہا ہوں۔ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ تو ایک بھوت ہے جس سے سب ڈرتے ہیں۔ اسے میں روز نیچے ہوٹل میں دیکھتا ہوں۔ وہ لنگڑاتا ہوا آتا ہے۔ بفاتی کے میلے شانے پر ہاتھ مارتا ہے۔ گاہکوں کو دیکھے بغیر آنکھ مارتا ہے اور بھنکتا ہوا کسی میز پر بیٹھ جاتا ہے۔

"پالک گوشت بیٹا!" کسی کو مخاطب کئے بغیر نعرہ لگاتا ہے۔

جیب سے چلم نکالتا ہے، سلگاتا ہے اور اس پر میلا کپڑا رکھتا ہے اور زور سے دم لگاتا ہے۔

سب گاہک ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہتے ہیں۔

میں نہ جانے کیوں سر جھکا لیتا ہوں۔ مجھے اس مجذوب کی لال لال آنکھوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔

"میں نے دو تھپڑ جڑ دیے...... دن میں تارے نظر آ گئے اس عقل کے دشمن کو...... اہا...... دن تارے!" وہ کسی سے مخاطب ہوئے بغیر بکتا رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ لوگ اس کے بارے میں بھول جاتے ہیں۔ تناؤ ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ باتیں کرنے لگتے ہیں۔ وہ سب کی باتوں سے بے نیاز بکتا رہتا ہے اور کھاتا رہتا ہے۔ اس کی داڑھی پر رنگین میلی رال ٹپکتی رہتی ہے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں اس کے بالوں کو دیکھتا ہوں۔ لال لال آنکھیں جن میں میل بھرا ہوا ہے۔ کانوں پر سفید روئیں ہل رہے ہیں۔ پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ آواز بھرائی ہوئی ہے۔ داڑھی کی نوک چیتھڑے چیتھڑے بھورے کوٹ کے کالروں میں سے نکلتی ہے اور پھر وہیں دفن ہو جاتی ہے۔ وہ سر دھنتا ہے جیسے کوئی اس سے اس کی سب سے قیمتی چیز مانگ رہا ہو اور وہ جھنجھلا کر انکار کر رہا ہو۔ "نہیں یہ سب تماشا ہے...... میں نے جڑ دیے دو تھپڑ تھانیدار کے...... گدھا منہ بسورتا اپنی ماں کے پاس بھاگ گیا...... سو میں نے کہا یہ پہاڑ، یہ جھیل...... یہ پالک گوشت۔"

کبھی کبھی وہ منہ اٹھا کر سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہے۔ اس کی بچھری ہوئی نگاہوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ میری طرف ضرور دیکھ رہا ہے مگر مجھے

نہیں دیکھ رہا ہے۔ میں پھر بھی سہم جاتا ہوں اور جلدی جلدی پانی کا گلاس خالی کر کے ہوٹل کی دھندلی روشنی سے بھاگ جاتا ہوں۔

لیکن اس وقت ٹیلے پر بیٹھا چابک مارتا ہوا رمضانی بڑی صاف صاف گونجتی ہوئی باتیں کر رہا ہے۔ اور اس کی گرجدار، آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز اور بجھتی ہوئی شفق میں عجیب آہنگ پیدا ہو گیا ہے، میں اس کی آواز کو دیکھ سکتا ہوں۔ اس کی آواز جھلملا رہی ہے۔ میں اس کی آواز سن سکتا ہوں۔ شفق بول رہی ہے۔ میرے دل میں کسی قسم کا ڈر نہیں ہے۔ بس یہی لرزاں شفق سلگ رہی ہے۔ شفق سلگ رہی ہے، شفق بجھ رہی ہے۔ اونچے اونچے درخت دھندلکے میں تحلیل ہوتے جا رہے ہیں۔ سرمئی سائے ہیں اور رمضانی کی آواز ہے اور کچھ بھی نہیں۔ میرے دل میں الاؤ سا جل رہا ہے۔

"تم بے وقوف ہو...... میں جانتا ہوں اس عورت کو۔ جو کل تک تھی آج نہیں ہے۔ میں ہی اسے اپنے تانگے پر لایا تھا۔ تم جانو میں ایک دیوانہ۔ اف کیا عورت تھی۔ وہ میرے تانگے پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں آدھی بند تھیں اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ تم نے کبھی گلاب کھلتے دیکھا ہے...... میں نے دیکھا ہے۔ ہوا چلتی ہے تو پنکھڑیاں تھرتھراتی ہیں نا...... سو اس کے ہونٹ بھی تھرتھرا رہے تھے۔ وہ تانگے میں بیٹھی چلی جا رہی تھی اور مجھے لگا میرے دل میں چاند نکل رہا ہے...... تم جانو میں جنم کا سنگ دل ہوں اور اس دل میں چاند نکل رہا ہے...... پر میں جانتا ہوں اس کے ہونٹ کیوں ہل رہے تھے۔"

رمضانی کہنی سے مجھے ٹہوکا دیتا ہے۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہوں...... "کیوں، اس کے ہونٹ کیوں ہل رہے تھے۔؟"

"وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر بھاگ رہی تھی...... اور دیکھو قسمت اسے کہاں لئے جا رہی تھی...... اس لیے اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ عورت جو کل تک تھی، آج نہیں ہے۔"

رمضانی مجھے ہاتھ پکڑ کر اٹھاتا ہے، اپنے تانگے میں بٹھاتا ہے۔ گھوڑے کی گردن کے گھنگھرو بولتے ہیں۔ لمبے لمبے درخت پیچھے ہٹنے لگتے ہیں اور پورا چاند آگے آگے

چلنے لگتا ہے۔ تانگہ آگے اور آگے بڑھتا جاتا ہے اور چاند پیچھے ہٹتا جاتا ہے۔ ہم شہر سے باہر نکل جاتے ہیں اور سنسان وادیوں میں گھوڑے کے گھنگھروؤں کی جھن جھن گونجتی ہے اور پھر سرگوشی کرتی ہے اور گونجتی ہے۔ رمضانی بڑی انجانی سی آواز میں گا رہا ہے اور چاندنی میں لپٹے ہوئے درختوں کے اسرار کو اور بھی گہرا بنا رہا ہے...... میری آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہہ رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں اور نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ میرے آنسو نہیں ہیں، کسی اور کے آنسو ہیں...... رمضانی کی آواز گھنگھروؤں کی جھنکار سے الجھ رہی ہے......

"رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو......"

رات بھیگتی جاتی ہے۔ ہم شہر کی فصیل کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ جہاں اِکّادُکّا بلب جل رہے ہیں اور چاندنی میں بڑے پھیکے اور بے جان معلوم ہو رہے ہیں۔ رمضانی خاموش ہے، درخت خاموش۔ صرف گھوڑے کی ٹاپیں اور گھنگھروؤں کی آواز گونج رہی ہے۔ میں چپ چاپ تانگے سے اترتا ہوں اور اندھیرے میں ٹوٹے پھوٹے زینے پر چڑھنے لگتا ہوں۔ میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ پھر وہی کمرہ ہے، وہی اندھیرا! میں لیٹ جاتا ہوں اور کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں۔ سامنے والی کھڑکی کی سلاخیں چاندنی میں چمکتی نظر آتی ہیں۔ فرش پر تیل چٹے دوڑ رہے ہیں اور چاندنی کی قاش کو چاٹ رہے ہیں۔ ہر طرف سناٹا ہے۔ آسمان کا ایک حصہ نظر آ رہا ہے۔ پگھلتے ہوئے آسمان میں ستاروں کی گچھے کے گچھے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ فضا میں انجانے چراغوں کے اڑن کھٹولے اڑ رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے یہی چراغ میرے دل میں لو دے رہے ہیں۔ کوئی مر جاتا ہے تو ستاروں کی چمک کیوں بڑھ جاتی ہے؟ میری آنکھوں میں آنسو جل رہے ہیں۔ یہ آنسو کہاں سے آتے ہیں؟ ان چراغوں سے جو فضا میں اڑ رہے ہیں یا ان ستاروں سے جو دل میں لو دے رہے ہیں؟

وہ رات اور آج کی رات...... ان دو راتوں کے درمیان کتنی راتیں ہیں، کتنی سیاہ خلیجیں۔ سب ایک جیسی ہیں۔ نہ لہریں اٹھتی ہیں، نہ شور ہوتا ہے، نہ ساحل کٹتے ہیں،

نہ کشتیاں ڈوبتی ہیں۔

اور راتوں کے اس جنگل میں کیا کیا ہے، کیا کیا نہیں ہے...... میرے ٹوٹے ہوئے جوتوں سے روٹی کے سوکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نکلتے ہیں اور میں مسکراتا ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ چوہوں کی کرامات ہے۔ میں جوتوں کو پھر کونے میں رکھ دیتا ہوں۔ بجلی بجھا دیتا ہوں۔ تیل چٹے سرسرانے لگتے ہیں۔ کوئی پڑوس والے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑ پیٹ رہا ہے۔ کسی کی مرغیاں ڈر کر پھڑ پھڑا رہی ہیں اور چیخ رہی ہیں۔ کسی کا دروازہ چر چراتا ہے۔ قصاب کی بیوی کی بطخ جیسی آواز سنائی دیتی ہے۔ "کیوں بڑے میاں کیا تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہے۔ ہائے ہائے کیڑے رنگتے رنگتے اب تو تم اپنا دل بھی رنگنے لگے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ بڑے چھما چھم حاجی بنے پھرتے ہو، اور آتی جاتی بہو بیٹیوں کو پٹا پٹ تاکتے ہو اور اوپر سے کھانستے ہو۔

حاجی رنگریز کی ہکلاتی ہوئی آواز سنائی دیتی...... "لیکن سنو تو، سنو تو...... بی مرادن، تم تو جامے سے باہر ہوئی جاتی ہو......" بطخ کی آواز اور تیز ہوتی جاتی ہے۔ "جامے سے باہر ہوتی ہو گی تمہاری ہوتی سوتی...... کان کھول کر سن لو، میں تمہاری داڑھی نوچ لوں گی جو کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھا ہے کلثوم کو...... چھجے جیسی داڑھی لیے پھرتے ہو اور چھجے پر جا کے نہاتی لڑکیوں کو...... لعنت ہو تم پر، توبہ توبہ...... کیسے کیڑے رینگ رہے ہیں اس مکان میں......" اور زینے پر چڑھتی ہوئی اوپر چلی جاتی ہے۔

میرے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں وہی بمبیا حاجی ہے۔ میں دروازہ کھولنا نہیں چاہتا مگر کھولتا ہوں۔ حاجی کھڑا ہے۔ اس کے منہ سے عجیب سی بساند آ رہی ہے۔ "سنا تم نے۔ کتنی بدذات عورت ہے۔ ایسی زبان دراز عورت دیکھی نہیں میں نے۔ میں خوب جانتا ہوں اس کی کارستانیاں، بیس برس ہو گئے اس مکان میں اس الو کے پٹھے قصاب کو دین دنیا کی کچھ خبر تو ہے نہیں۔ وہ تو روپے کی تین اٹھنیاں بھنانے میں لگا رہتا ہے۔ یہاں دونوں ہاتھوں سے جوانی لٹائی اور اب میرے جیسے بے گناہ پر...... تم جانتے ہو بھائی...... روزہ نماز اور عاقبت کے آگے دنیا ہیچ ہے......"

اندھیرے میں اس کی آنکھ چمکتی ہے۔ دوسری پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ اس پردے پر مکڑی جالا بنا رہی ہے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں دروازہ بند کر دیتا ہوں اور اندھیرے میں غرق ہو جاتا ہوں۔ میں پھر اپنے بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔ کھٹمل میرے جسم سے خون چوس رہے ہیں۔ جب کافی خون نہیں ملتا تو اور زور سے کاٹتے ہیں۔ میں خون کہاں سے لاؤں۔ میں زرد پڑ گیا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ یہ کھٹمل میرے جسم سے باہر بھی ہیں اور اندر بھی۔ میں خون کہاں سے لاؤں۔

اندھیرے میں اور بھی بہت سے زرد چہرے ابھر رہے ہیں۔ میرے بینک کا شیشہ چمک رہا ہے اور شیشے کی باریک دیواروں کے پیچھے بہت سے زرد چہرے موٹے موٹے کھاتوں پر جھکے ہوئے ہیں۔ نیلے خانوں میں کالے کالے ہند سے مکھیوں کی طرح رینگ رہے ہیں، بھنبھنا رہے ہیں۔ کسی کی آنکھوں پر عینک ہے، کسی کی آنکھیں کھلی بھی ہیں تو بند معلوم ہوتی ہیں۔ میں ان چہروں کو دیکھتا ہوں اور میرا خون خشک ہو جاتا ہے۔ مجھے جھرجھری سی آتی ہے۔ ان کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ پہاڑہ پڑھ رہے ہیں یا منتر۔ سب مجھے اجنبی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ "یہ کنوارا فرشتہ سیدھا بہشت میں جائے گا۔" کوئی بڑی شرارت سے مسکراتا ہے، کنکھیوں سے میری طرف دیکھتا ہے اور گرہ پر گرہ لگاتا ہے۔ "کہتے ہیں یسوع مسیح کی ماں مریم بھی کنواری تھیں۔" پھندا پڑتا ہے...... "کنواری ماں تو ہو سکتی ہے مگر......" کوئی مجھ سے اور کوئی بات نہیں کرتا۔ مجھے ایسا لگتا ہے یہ سب ہوا کے جھونکے ہیں اور میں بوڑھا درخت ہوں۔ یہ جھونکے مجھ سے کھیلتے ہیں اور آگے نکل جاتے ہیں اور جب میں بینک کی دیواروں سے نکلتا ہوں تو یہی جھونکے مجھے اٹھاتے ہیں اور شور اور ہجوم کے دریاؤں کے اوپر اوپر لیے پھرتے ہیں یہاں تک کہ میں اپنے کمرے میں پہنچ جاتا ہوں۔ میں اس کی سیلن اور اندھیرے میں پناہ لیتا ہوں۔ یہ جو لوگ کام کرتے ہیں میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں......ان کی بیویاں ہیں، بچے ہیں، مائیں ہیں......ان کی بیویاں گہنے پہنتی ہیں، چھم چھم چلتی ہیں، کھانا پکاتی ہیں اور چھٹی کے دن بچوں کی انگلیاں پکڑ کر اپنے

شوہروں کے ساتھ پارک اور دریا کے کنارے جاتی ہیں اور نہ جانے کیسی روشنی اور خوشی بٹور لاتی ہیں۔

یکا یک مجھے لگتا ہے کہ میں اندھیرے کنویں میں جھانک کر دیکھ رہا ہوں جس کی گہرائی اتھاہ ہے۔ گہرائی سے آواز آتی ہے، نہ جانے کیسے بھیانک سائے ناچ رہے ہیں اور گا رہے ہیں۔ میں آوازوں کے بھنور میں پھنس گیا ہوں۔ ناچ رہا ہوں۔ رمضانی کوچوان کی کھرجدار آواز آرہی ہے...... "ابے جا بڑا آیا کہیں کا لارڈ صاحب...... اپن تو ایسوں کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں...... ہا ہا ہا!"

میرے منہ سے اچانک قہقہہ نکلتا ہے اور میں خود اپنے قہقہے سے ڈر جاتا ہوں۔

میں اٹھتا ہوں اور روشنی جلاتا ہوں۔ ہر طرف جالے سے تیرتے نظر آتے ہیں۔ دور گھوڑے ہنہنا رہے ہیں۔ کبھی کبھی کتے بھی بھونکتے ہیں۔ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔ کوئی مجھے ٹھوکے لگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔ "کچھ کر بیٹھو!" میں کمرے کی چیزیں الٹنے پلٹنے لگتا ہوں۔ یہ کیسے کاغذ ہیں۔ ٹین کے نہ جانے کتنے خالی ڈبے نیچے اوپر رکھے ہیں۔ ایک ٹین سے ایک ننھی سی چوہیا پھدک کر بھاگتی ہے۔ اس چھوٹی سی چیز میں زندگی کی یہ بجلی دیکھ کر میں حیران رہ جاتا ہوں۔ اگر یہی بجلی...... ٹین سے کاغذ کیسے نکلے چلے آرہے ہیں...... وقت نے انہیں کتنا میلا، کتنا زرد کر دیا ہے۔ وقت کی چھری...... وقت کا پھندا...... وقت کی دھارا...... میرے ہاتھ کانپ کیوں رہے ہیں...... اس سے پہلے مگر یہ خط میں نے نہیں پڑھے تھے، شاید پڑھے ہوں، یاد نہیں آتا......

"......اس دن جب ماں نے آپ کے سر پر کوڑا انڈیل دیا تھا تو مجھے بڑی شرم آئی۔ لیکن آج جب بابا نے آپ کو کھلے بندوں گالیاں دیں تو زمین میں گڑ کے رہ گئی۔ میری ماں تو جاہل ہیں، لڑاکن ہیں...... بابا ایسے نہیں ہیں، لیکن نہ جانے آپ سے اللہ واسطے...... آپ اپنی کھڑکی بند کیوں رکھتے ہیں...... اس کے بعد کی سطریں پڑھی نہیں گئیں۔ میں آپ کی عزت کرتی ہوں اور ان سب کی طرف سے معافی مانگتی ہوں۔

ہاں یہ خط پھاڑ دیجئے۔ سلام...... ساتویں منزل والی...... مجھے پسینہ آرہا ہے۔ میں

تیرتے ہوئے جالوں میں پھنستا جارہا ہوں۔ میری کنپٹیاں جل رہی ہیں۔ نیند آرہی ہے لیکن میں دوسرا کاغذ کھولتا ہوں۔

"...... میری کھڑکی آج بھی بند تھی۔ آپ اتنی دیر سے کیوں آتے ہیں۔ آتے بھی ہیں تو روشنی کیوں نہیں جلاتے۔ کیا تیل چٹے اور چوہے آپ کو بہت بھاتے ہیں! میں ایک دن آپ کے کمرے میں آنا چاہتی ہوں۔ مجھے آپ بہت شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ سبھی یہی کہتے ہیں...... بڑا شریف سا بدھو سا آدمی ہے...... آجاؤں؟ میں آپ سے کتابیں لینا چاہتی ہوں۔ میں ڈوب رہی ہوں۔ مجھے تنکوں کا سہارا چاہئے......"

میں اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوئے جارہے ہیں۔ میں کلثوم کو دیکھ رہا ہوں۔ پندرہ سولہ برس کی لڑکی۔ لٹھے کی شلوار، دھانی دوپٹہ، چاندنی میں دُھلا ہوا رنگ، ہونٹ کھلے ہوئے، آنکھیں کھلتی اور بند ہوتی ہوئی۔ وہ اسی طرح ساتویں منزل کے اوپر چھت پر تین سال کھڑی رہتی ہے۔ پھر میراثنیں آتی ہیں، گیت گونجتے ہیں، پلاؤ اور قورمے کی خوشبو اڑتی ہے، چاند چھپ جاتا ہے۔ سناٹا چھا جاتا ہے۔ دو سال بعد کلثوم بیوہ ہو جاتی ہے۔ اب اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے ہیں، آنکھیں حیران اور خوف زدہ، گردن میں اجلا دوپٹہ پڑا ہوا، بال کچھ سنورے ہوئے، کچھ پریشان، پھر کوئی آتا ہے اور کلثوم کو لے جاتا ہے۔ سات سال بعد پھر وہ لوٹ آتی ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے، ہونٹوں پر پان کی رنگت سوکھی ہوئی، سانس رک رک کر چلتی ہوئی، جسم میں اب ہرن والی چستی نہیں ہے، اب بھی اس میں وہی چھریرا پن ہے، مگر وہ رم آہو والی بات نہیں...... قدم اٹھائے نہیں اٹھتے، دل کی دنیا ٹھہر گئی ہے۔ مگر اب بھی جب وہ میری کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے تو جانے پیروں کے نیچے زمین کیوں جل اٹھتی ہے...... کہتے ہیں شوہر نے چھوڑ دیا ہے۔ اس کا باپ اور بھی چڑچڑا ہو گیا ہے۔ کرم کلے جیسے چہرے والی بڑھیا ماں اس کے بے وفا شوہر کو کوستی رہتی ہے، ساتھ ہی اپنے شوہر کو بھی۔ یہاں تک کہ پاس پڑوس والوں کو بھی نہیں بخشتی......

میری سانس چلنے لگتی ہے اور میری مٹھی میں ایک اور کاغذ چرمراتا ہے۔ یہ کاغذ

اتنا زرد نہیں پڑا ہے۔

"...... آپ انسان ہیں یا پتھر؟ جب آپ اس گھر میں آئے تھے تو میں پندرہ سولہ برس کی تھی۔ تیس کی منزل جانے کہاں پیچھے رہ گئی۔ ماں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہیں۔ بابا مرغیاں بیچ بیچ کر تھک گئے اور رات دن پیٹ میں درد، گردے میں درد پکارتے رہتے ہیں۔ کتنے لوگ مر کھپ گئے۔ دنیا کتنی بدل گئی اور آپ ہیں کہ اسی کھڑکی کو تاکا کرتے ہیں جسے چھوڑ کر کالی بلی بھی جا چکی ہے۔ جن بھوت بھی ایک ہی طرف تکتے تکتے تھک جاتے ہیں۔ آپ کیسے بھوت ہیں کہ......"

میں رکتا ہوں کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں۔ جھیل کے کنارے درختوں کے اوپر چاند آہستہ آہستہ نکل رہا ہے۔ یہ چاند ہے یا عورت کا چہرہ...... مجھے پسینہ آرہا ہے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے ہوا چاہئے، روشنی چاہئے، روشنی کہاں ہے، ہوا کہاں ہے۔ بیس سال سے میں روشنی اور ہوا کے بغیر کیسے جی رہا ہوں۔ باہر پت جھڑ کی ہوا ٹھنڈی سانس لے رہی ہے۔ میں پھر اس کاغذ کی طرف دیکھتا ہوں جو مجھے چاند سے بھی زیادہ روشن معلوم ہو رہا ہے۔

"...... کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں تلوار بن جاؤں اور تمہارے بند دروازے کو چیرتی ہوئی تمہارے پاس آؤں اور تمہاری گردن پر گر جاؤں۔ مگر تم کہاں ہو۔ تم تو پتھر کی سل ہو......"

میں سوچ رہا ہوں پھر تلوار میری گردن پر گرتی کیوں نہیں؟ اب وہ نہیں آئے گی۔ نہ جانے میں نے پہلے یہ خط پڑھے تھے یا نہیں۔ وقت گزرتا ہے تو الفاظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ صبح ہوتی ہے تو پھول کھلتے ہیں اور شام ہوتی ہے...... اور یہ شام نہیں تو اور کیا ہے! بیس سال بہت ہوتے ہیں...... چالیس سال، زندگی کے چالیس سال، یوں ہی بیت گئے۔ کلثوم اور وہ عورت جس کا میں نام بھی نہیں جانتا، کہاں ہیں؟

دروازہ کھلتا ہے۔ ایک بجلی سی کوندتی ہے اور کمرے کی روشنی بجھ جاتی ہے۔ پھر اندھیرے میں چاندنی کا غبار ابھرتا ہے اور میں ایک عورت کے سائے کو دیکھتا ہوں۔

میرے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ جاتا ہے۔

سایہ میرے پاس آتا ہے۔ میرا دل تڑپ کے میرے ہونٹوں پر آجاتا ہے۔

"بڑا انتظار کرایا تم نے......"

سایہ اور قریب آتا ہے۔

"اور تم نے؟......" یہ آواز ہے یا جلتے ہوئے ہونٹ میری آنکھوں پر جھکے آرہے ہیں۔

میں نڈھال ہو کر فرش پر لیٹ جاتا ہوں اور پرچھائیں بھی میرے سینے پر سر رکھ کر لیٹ جاتی ہے۔

"تمہارا خط مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ بیس برس سہار لے گئی میں یہ طوفان۔ اب جھیلا نہ گیا۔ سو میں چلی آئی۔"

"تم پہلے کیوں نہ آئیں؟ اب تو بہت دیر ہو گئی۔" میں اپنے جلتے پپوٹوں پر انگلیاں پھیرتا ہوں جن پر ہونٹوں اور آنسوؤں کی نمی اب بھی موجود ہے۔ آواز میرے گلے میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے۔

پرچھائیں اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیتی ہے اور میرے ہونٹوں کے سارے کانٹے چن لیتی ہے۔ میرا منہ اپنے آنسوؤں سے دھو دیتی ہے۔

"وقت کوئی چیز نہیں ہے میری جان۔ وقت کوئی چیز نہیں۔" "میں اب مٹ رہا ہوں۔ پھول صبح کو کھلتے ہیں۔ سورج شام کو ڈوبتا ہے۔ دیکھو شام ہو چلی۔ اندھیرا بڑھ رہا ہے۔"

"تم نے مجھے بلایا کیوں نہیں۔ میں تو کب سے اپنے جھروکے میں بیٹھی رہی۔ تمہاری آواز کا انتظار کرتی رہی۔ کبھی بلاتے تو، پکارتے تو......"

"اور کیا میں نے تمہیں بلایا ہی نہیں، پکارا ہی نہیں؟"

رویاں رویاں پکارا۔ تمہاری ایک ایک آہٹ پر، تمہاری ایک ایک جھلک پر دل میرا شعلے کی طرح لپکا۔ پر کچھ جلنے جلانے کو ملا ہی نہیں......"

"ہائے تمہاری صورت نے، تمہاری آنکھوں نے تمہارے دل کی چغلی کھائی ہی نہیں۔ میں تو سر کے بل آتی اور تمہارے قدموں میں......"

میری سانس رک رہی ہے۔ کنپٹیوں کی رگیں دکھ رہی ہیں۔

کب کب کی باتیں یاد آرہی ہیں! کیسے کیسے ڈھکے چھپے زخم ہرے ہو رہے ہیں! میں کس طرح جیا کہ دنیا مجھے لاش سمجھتی رہی، مجھ سے کترا کر نکلتی رہی۔ تم سسکیاں لے رہی ہو۔ مگر اب ان سسکیوں سے کیا ہو گا۔ اب تو پیاس بھی جاتی رہی۔ تمہاری آنکھیں کتنی حسین ہیں، تمہارے بال مہکتے ہیں، تمہارے ہونٹوں سے کیسے پھول جھڑتے ہیں......اور وہ دن...... کل کی بات لگتی ہے۔ تم چھت پر نہا کر ٹہل رہی ہو۔ تمہارے بال بھیگے ہوئے ہیں۔ تمہارے بالوں سے دھوپ کھیل رہی ہے۔ میں ہوٹل میں بیٹھا ہوا ہوں جہاں دن کے وقت بھی اندھیرا ہے، دھواں ہے، مرچ مسالے کی بو ہے۔ جب بھی تم سر جھٹک کے نیچے دیکھتی ہو تو لگتا ہے کہ ہوٹل میں بھی روشنی ہو گئی ہے۔ پھر وہ دن...... تم بیوگی کے لباس میں گھر آئی ہو۔ تمہاری ماں بین کر رہی ہیں۔ تم خاموش ہو۔ کلائیاں چوڑیوں سے خالی ہیں۔ ناک سے کیل غائب ہے۔ بالوں میں جانے کب سے کنگھا نہیں ہوا۔ تمہارے ہونٹ اب بھی دہک رہے ہیں۔ سب بین کر رہے ہیں اور تم خاموش ہو اور چاروں طرف پنجرے میں بند پرندے کی طرح دیکھ رہی ہو۔ پھر وہ دن جب ہمیشہ کے لیے یہاں آگئی ہو۔ حیران اور خوف زدہ۔ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں اور میں بھی حیران اور خوف زدہ ہوں اور پھر وہ صبح جب ایک لاش سامنے والی کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے لٹک رہی ہے۔ میں رو رہا ہوں اور تم مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی ہو۔ تم کتنی دل شکستہ، کتنی دکھی اور زرد نظر آرہی ہو! میں تمہارے چہرے کو بھولا نہیں ہوں اور نہ تمہاری نظر کو۔ میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں اور میری آنکھوں میں ایک عورت کا ننگا جسم...... میں نے آج تک اپنی اندھیری زندگی میں اس سے زیادہ پاک اور دل آویز چیز نہیں دیکھی۔ اور تم...... تمہاری باہیں کتنا خوبصورت سہارا ہیں، تمہارے لمس میں کتنی گرمی اور اپنا پن ہے، جیسے یہ میری اپنی

باہیں ہوں۔ رمضانی کہاں ہے۔ یہ اسی کی آواز ہے نا...... "بلا سے جان جائے گی تماشا ہم بھی دیکھیں گے......" "لو دیکھو تماشا۔ اس کی داڑھی ہل رہی ہے، وہ اپنے گھوڑے کو پیار کر رہا ہے اور اس کی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے میلے میلے آنسو بہہ رہے ہیں اور میں تمہیں بھینچ رہا ہوں۔ اس طرح تو میں نے کسی کو بھی بازوؤں میں نہیں لیا تھا۔ اس طرح تو کسی کی آغوش کبھی وا نہ ہوئی تھی میرے لیے...... یہ کیا ہو رہا ہے...... میں گر رہا ہوں۔ اندھیرے کی چٹان پر اور روشنیوں کی لہروں میں...... یہ ضد ہے اور اچانک اندھیرا کیوں۔ لو وہ چاند بھی چھپ گیا جو کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔ اور وہ جھیل۔ لو وہ بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اور تم...... تمہاری باہیں کہاں گئیں۔ تمہاری زلفیں، تمہارے ہونٹ،...... سب کچھ پگھلا کیوں جا رہا ہے......ان کے بغیر اب میں زندہ کیسے رہوں گا۔ کیا کہا......زندہ رہنے کی ضرورت کیا ہے۔

میں ڈوب رہا ہوں۔ اندھیرے میں ڈوب رہا ہوں، کوڑا کرکٹ میں، بدبو میں، گمنامی میں، حسرتوں میں ڈوب رہا ہوں۔

وہ بھی خواب ہے جو دیکھ رہا ہوں، وہ بھی خواب ہے جو دیکھا ہی نہیں۔ سات منزلہ مکان لرز رہا ہے۔ موت اسے آغوش میں سمیٹ کر زمین میں دھنس رہی ہے۔ میرا دل میری آنکھوں میں لرز رہا ہے۔ اور یہ چراغ بھی بجھا چاہتا ہے۔ میں صرف تمہاری آواز سن رہا ہوں۔ تم ہنس رہی ہو۔ سارا مکان ہنس رہا ہے۔ میں اور کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ اندھیرے میں پھر چاند نکل رہا ہے۔ ہائے چاند کتنا حسین ہے۔ یہ چاند ہے پھانسی کے پھندے میں یا میری موت، میں خود کو پانے سے پہلے ہی خود کو کھو بیٹھا۔ آؤ، ایک بار، آخری بار، میرے ٹھنڈے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دو۔ میرے ہونٹوں پر، جس کی لاش پر چوہے دوڑ رہے ہیں، جس کی انگلیوں کو تیل چٹے چاٹ رہے ہیں، جس کے سرہانے جھینگر بول رہے ہیں، جسے چاند حیرت سے دیکھ رہا ہے اور ڈر کر جھپٹتے ہوئے بادلوں کی طرف بھاگ رہا ہے۔

OO

کاک ٹیل

۱۰

اب جو سب اپنے اپنے کمرے میں بند ہوگئے ہیں تو چین پڑ گیا ہے۔ تم بھی بھیا چین کی بنسی بجاؤ۔ بنسی بجاؤں یا تیرا سر۔ ابے یہ سارے برتن کون دھوئے گا۔ برتن کیا پہاڑ کے پہاڑ۔ چھوٹے صاحب کے کمرے میں تو ابھی روشنی اتنی ہی تیز ہے؟ اور وہ اپنی دنیا میں کھوئے وہی کلاسی سنگیت سنے جا رہے ہیں۔ ابے کلاسی نہیں کلاسیکل۔ اب کوئی مجھے بتائے کلاسی کیا ہووے ہے اور کلاسیکل کیا۔ اپن تو اتنا جانے ہیں کہ کلاسی وہ ہووے ہے جس میں لگے ہے ہوا کہیں جنگل میں دور، درختوں میں پھنسی، کبھی سائیں سائیں کرے ہے، کبھی رووے ہے۔ چڑیوں کی طرح۔ چڑیاں کم بخت دکھائی نہ دیوے ہیں۔ پر آواز میں دل ہے کہ ٹپکا چلا آوے ہے۔

ابے تو برتن کیوں پٹک رہا ہے بھائی۔ آدھی رات گئے۔ میوزک سننا بھی دوبھر۔ ابے ذرا دھیرے دھیرے چل۔ یہ کوئی دھما چوکڑی کا وقت ہے۔ میری آنکھ لگ رہی تھی جو تو نے جگا دیا۔ کیا برتن دن کو نہیں دھل سکتے۔ دھل سکتے ہیں صاحب، دھل سکتے ہیں۔ پر دن کو پانی کہاں چڑھے ہے اوپر کو۔ میں کہوں ہوں صاحب پانی نہ چڑھے ہے اوپر کو تو تم بھلا کیوں چڑھ کے بیٹھ جاؤ ہو اوپر کو، کیوں؟ پر عجیب جھمیلا ہے، نہ چت چین، نہ پٹ چین۔ برتن رات کو نہ دھلیں تو پو پھٹے منہ کیسے دھلیں، منہ اندھیرے چمکتی میز کیسے سجے برتنوں سے...... کوئی بتاوے ذرا۔ ہونہہ! مزے میں سب چائے پئیں گے اور اپنی اپنی راہ سدھار جائیں گے۔

اب لو میاں کاٹو پہاڑ سا دن۔

ہاں بے تو ادھر بیٹھ جا۔ میں پہاڑ سا دن کاٹوں اور تو پیاز کاٹ۔ بے چارا پیاز کاٹ رہا ہے اور میں دن کاٹ رہا ہوں۔ اور کیا، میں بھی بہت پیاز کاٹ چکا ہوں۔ اے بے تو ادھر کیا دیکھ رہا ہے۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے۔ اس کم بخت پیاز کی جھانس ہی ایسی ہووے ہے۔ پٹاپٹ آنسو ٹپکیں ہیں۔ نہ جانے کتنا آنسو ٹپکا چکا ہوں۔ ارے بھیا سر پر ہاتھ کیوں پھیرتے ہو میرے۔ میں چھوٹا ہوں تو کیا ہوا۔ بات یہ نہیں ہے۔ تیرا سر گھٹا ہوا ہے۔ تیل میں چپڑا ہوا۔ اس پر مکھی بیٹھے ہے اور تیل پیوے ہے۔ اور تو جانتا ہے سرسوں کا تیل کتنا مہنگا ہو رہا ہے۔ اور صاحب لوگ ہیں کہ ایک ایک بوند کا حساب مانگے ہیں۔ اب بال سفید ہونے کو آئے۔

میرے خون کی ایک ایک بوند کا حساب کون دیوے ہے مجھے۔

اب اسی ہاتھ سے ناک صاف کرے گا اور اسی سے پیاز کاٹے گا۔ اوپر سے اٹنگ پاجامہ پہنے گا اور روئے گا۔ نہیں یہ سب نہیں چلے گا۔ صاحب لوگ تو کہتے تھے، میں بوڑھا ہو رہا ہوں، سو میرا ہاتھ بٹانے کو تجھے رکھا ہے۔ تو کیا ہاتھ بٹائے گا۔ دودھ کے دانت تو ٹوٹے نہیں تیرے۔ پر ایک بات یاد رکھیو بیٹا......اور جو میری بیڑی چرائی، دو چھتی سے، تو میں یہ ساری بتیسی جھاڑ دوں گا ایک ہی تھپڑ میں۔ ہاں! چل چھوڑ پیاز اور برتن دھو۔ میں ریڈیو لگا تا ہوں۔ تو بھی سن۔ سچ بتاؤں......ریڈیو بج رہا ہو اور گانا ہو رہا ہے تو برتن دھونا آسان ہو جاوے ہے۔ جیسے چلچلاتی دھوپ میں چلنا آسان ہو جاوے ہے جو راستے میں گھنے پیڑ لگے ہوں۔ اب تو کیا سمجھے گا یہ باتیں۔ کبھی صاحب لوگ کی باتیں سنا کر کھانے کی میز پر۔ میں تو بیس برس سے سن رہا ہوں۔ وہ کھانا کھاوے ہیں اور میں باتیں۔ کتابیں تو میں نے پڑھیں نہیں۔ اسکول مدرسہ میں گیا نہیں۔ اللہ کا نام اور محمد کا کلمہ۔ بس، کھانا پکاتے، برتن دھوتے، دودھ لاتے، دیکھ بال سفید ہو گئے۔ اور جواب تو آیا ہے۔ تو تیرا بھی یہی حال ہو گا۔ سوں سوں مت کر ہاں۔ سوں سوں سے بیٹا بڑا ہی جی جلے ہے ہاں۔ لالا۔ بہت ہو گیا۔ اب تو ذرا چین سے بیٹھ۔ رو مت۔ تو میرا ہاتھ کیا بٹائے گا الو کی دم۔

دوپہریا آگئی۔ پردے کھینچ۔ ارے ارے تو پردے کھینچ رہا ہے یا آسمان ڈھارہا ہے۔ پوری کھڑکی آن پڑے گی یاں کو، ہاں۔ ابے تجھے یاں کس نے بھیج دیا۔ مرغا کہیں کا۔ وہیں کہیں اذان دیتا مزے میں۔ منہ اٹھایا اور شہر میں آن مرا۔ اچھا دیکھ۔ یوں کھینچتے ہیں پردہ۔ میں جب آیا تھا ناگاؤں سے کوئی بیس برس ہو گئے، تو مجھے بھی تب کے باورچی نے پردہ کھینچا سکھایا تھا۔ شہر میں لوگ پردے کھینچ کھینچ کر رہے ہیں...... کبوتر خانوں میں۔ غٹر غوں، غٹر غوں۔ اتنا پاس پاس تو گھر ہیں۔ پردہ نہ کھینچیں تو دیکھنے والوں کی آنکھیں گھس جائیں پاجامے کے اندر۔ ہاں اب ٹھیک ہے۔

چل بے سب ٹھیک ہے۔ برتن دھل گئے۔ پیاز کٹ گئی۔ برتن بج گئے۔ پردے کھنچ گئے۔ تھوڑی دیر کمر سیدھی کرلیں۔ ارے وہاں نہیں۔ فرش پر۔ یاں۔ صوفہ تو صاحب لوگوں کے لیے ہے۔ سورج ڈوبتے سب آجائیں گے۔ پھر تو دیکھنا ہوا ایسی چلے گی کہ ہم پھرکیوں کی طرح ناچیں گے۔ چائے لاؤ، کافی لاؤ۔ کسی کا فون آیا تھا؟ کوئی خط؟ شام کو تین لوگ آئیں گے۔ سوڈا لے آنا۔ یہی دس بوتلیں۔ اور کچھ نمکین۔ کھانا بھی کھائیں گے۔ نو ڈارلنگ نو۔ بزنس کے لوگ ہیں۔ باہر سے آئے ہیں ان کو انٹرٹین کرنا بہت ضروری ہے۔ سینئر لوگ ہیں۔ نہیں ڈارلنگ اس پارٹی میں تم چلی جانا۔ میری طرف سے کہہ دینا سوری۔ ان کے یہاں تو پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں۔ نہیں میں کوئی موٹیو نہیں اٹیچ کر رہا ہوں۔ ہاں ان سے ہل اسٹیشن کی بات کرلیں گے۔ بنگلہ تو مل ہی جائے گا۔ خاصا اوپر۔ سیٹی نہ بجاؤں تو کیا کروں۔ سیٹی بجانے سے دوسروں کو پتہ چل جاتا ہے کہ میں ورنہ......ورنہ کیا؟ ورنہ کچھ نہیں۔ ابے ابھی تو تو جمائیاں لے رہا تھا اور اب سو بھی گیا۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ میں اپنی کہتے کہتے سو جاؤں اور سننے والا جاگتا رہے اور میری جان کو کوستا رہے۔ اچھا تو جاگ رہا ہے اور سوتا بن رہا ہے۔ وہ ہاتھ دوں گا کہ...... کولر کو ہاتھ مت لگانا۔ اور ہاں باتھ روم میں صاحب کے صابن کو ہاتھ مت لگانا۔ نہ جانے صاحب کو کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ پھر سوال جواب۔ سو میں تجھے شروع ہی میں سب بتائے دوں ہوں۔ گرہ سے باندھ کے رکھ لیجیو۔ ورنہ سیدھے سولی پر چڑھا دیا جاوے گا۔

پھر نہ کہیو میں نے نہیں کہا۔ ہاں!

ابے یوں کیوں دیکھے چلا جا رہا ہے، ٹکر ٹکر۔ جیسے بھلا آدمی کبھی دیکھا نہ ہو۔ دیکھ میں نے یہاں بیس برس بتا دیئے۔ برتن دھونے میں اور کھانا پکانے میں۔ میرے آگے کے چھوکرے اس گھر میں اونچے اونچے عہدوں پر پہنچ گئے اور میں آج بھی برتن دھوئے چلا جا رہا ہوں۔ چلا جا رہا ہوں۔ ابے تو دانت کیا نکال رہا ہے۔ میں بھی جب آیا تھا یاں کو تو ایسے ہی دانت نکالا کروں۔ لے دیکھ لے۔ اب آگے کے دانت جاتے رہے اور بن گیا دلی گیٹ۔ ایک وخت آوے گا جب تیرے دانت جاتے رہیں گے اور منہ تیرا دلی گیٹ بن جاوے گا۔ تب میں پوچھوں گا۔ اب دیکھ آستین میں منہ چھپا کر مت ہنس۔ اور کون جنے تو رو رہا ہو۔ رووے گا تو پچھتاوے گا۔ اور ہنسے گا تو کٹ جائے گی یہ زندگی ہنستے کھیلتے۔ وہ تو خیر سے میں ہوں...... ورنہ وہ تو نوچے ہیں یہاں باولے کتوں کی طرح۔

اوہو، اچھا سن، ایک بات بتا، تو گیا تھا کبھی میرے گاؤں۔ پڑوس میں تو ہے۔ کھیتوں سے نکلے، نالہ پار کیا ٹیلے سے اترے، جامن کے پیڑوں کے پاس، چھہ بچے سے پرے، وہی جس میں بگلے ایک ٹانگ پر کھڑے مچھلی کی تاک میں رہے ہیں۔ ہاں بس، وہاں سے کون سا دور ہے میرا گاؤں۔ اچھا شادی میں گیا تھا تو۔ دھوم دھام کی برات رہی ہوگی! ابے میراثی کون تھے؟ وہی پرانے خیراتی میاں۔ ارے وہ تو کب کے مر کھپ گئے ہوں گے۔ جب میں وہاں تھا تب ہی وہ پوپلے ہو چکے تھے اور منہ ان کا بھانتی کی طریوں چلتا تھا...... مگر اللہ قسم کیا شہنائی بجاتے تھے۔ مور تو مور کوے تک ناچ اٹھتے تھے، اللہ قسم۔ اچھا یہ بتا مسجد کے آگے جو املی کا پیڑ ہے، کیا وہ اپنی جگہ پر ہے، ابے وہی جہاں تلیا میں مرغابیاں تیرے ہیں۔ چاہے سورج ڈوبے یا چاند نکلے، ان کو نہانے سے بھلا کون روکے گا! اچھا، میری ہر بات پر سر مت ہلا۔ سچ سچ بتا۔ جب شادی کا ہنڈا اجلا ہوگا تو تو نے دیکھا ہوگا مسجد کے پاس بائیں ہاتھ کو ایک کھڑکی ہے جس پر لال پردہ پڑا رہے ہے۔ کیا تو نے وہاں سے کسی کے کھلکھلانے کی آواز سنی تھی؟ ابے کیا تو بہرا ہے نرا۔ کیا تو نے میرے گاؤں کا مٹھا نہیں پیا تھا...... بڑے بڑے بہرے مٹھا پی کر

ٹھیک ہو جاوے ہیں واں تو۔ مر چیں لال لال ایسا تیرے ہیں اوپر اوپر کہ بڑے بڑے بہرے دل کی بات تک سننے لگے ہیں اور تو ہے کہ بس ٹکر ٹکر دیکھے چلا جارہا ہے۔ تو سچ بتا...... تو نے نہیں سنی وہ ہنسی...... تو پھر تو نے سنا کیا ہے۔ تو پھر تیرے پیدا ہونے سے فائدہ کیا ہے۔ اچھا سن، میں نے سنی ہے وہ ہنسی۔ جیسے چاند پر ستارے سے ٹپک رہے ہوں۔ چھن چھن، چھن چھن۔ لگتا ہے سب خواب تھا، سب خواب ہے۔

ابے اٹھ، اٹھ! سنتا نہیں ہے...... صاحب کی گاڑی آگئی۔ جلدی کر۔ دفان ہو ڈرائنگ روم سے۔ سن نہیں رہا ہے جوتوں کی چاپ زینے پر۔ بھاگ۔ میں چٹائی لپیٹتا ہوں، تو بھاگ کر جا۔ دروازہ کھول۔ میں نکل جاؤں گا پچھلے دروازے سے۔ سن نہیں رہا ہے دروازے کی گھنٹی؟

بہت دیر کردی دروازہ کھولنے میں۔ پہلے ایک تھے تو جھٹ سے کھول دیتے تھے دروازہ۔ اور اب دو ہو تو جگ بیت جاتا ہے دو قدم چلنے میں؟ میں نے تم سے کیا کہا تھا ڈارلنگ۔ کوئی خط آیا تھا؟ ہاں صاحب آپ کی میز پر ہے۔ کوئی ٹیلیفون؟ ہاں صاحب آیا تھا۔ کس کا تھا۔ جانوروں کے ہسپتال سے آیا تھا۔ کیا کہا۔ ٹائیگر تو ٹھیک ہے نا؟ نہیں صاحب وہ مر گیا۔ مر گیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو بالکل ٹھیک تھا۔ کہتے تھے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا صاحب۔ وہ کیسے؟ وہ اپنی آواز سے ڈر گیا صاحب۔ نہیں یہ ناممکن ہے۔ ارے صاحب، آپ کو کیا ہو گیا صاحب۔ ارے آپ تو چکرا رہے ہیں۔ ابے منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ ادھر آ۔ صاحب کو اٹھا۔ وہاں صوفے پر لے چل۔ بے چارے ٹائیگر پر جان چھڑکتے تھے۔

ڈارلنگ، مجھے ہوش آگیا ہے۔ مہمانوں کو ٹیلیفون کردو۔ آج کاک ٹیل کینسل!

○○

جب بھیگی رات

۱۱

آخری سگریٹ بھی جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ میں نے راکھ دانوں سے سگریٹوں کے کچھ ٹکڑے نکالے۔ دو دو چار چار کش کے لیے کافی تھے۔ رات بھی بس اتنی ہی باقی تھی۔ باہر درختوں پر چڑیاں پھڑ پھڑانے لگی تھیں۔ مگر، شاید، یہ وقت سے پہلے تھا۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ لیکن میں تو اس وقت سے اس کرسی میں دھنسا ہوا ہوں جب رات بھیگنی شروع ہوئی تھی۔

اب کیا کیا جائے۔ رات تو کٹ جائے گی۔ پھر کیا ہوگا؟ پھر کیا ہوگا، کون جانتا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ جب یہ معلوم نہ ہو کہ کیا ہونے والا ہے تو پھر جو کچھ ہونے والا ہے اس سے اتنا ڈر کیوں لگتا ہے۔ یہ سوال تمہارا ہے اور یہاں تمہارا سوال سننے والا کون ہے۔ پھر خود ہی سوال کرو، خود ہی جواب دو۔ باقی سب لوگ سو رہے ہیں۔ وہ تو چڑیوں کے اڑ جانے کے بعد اٹھیں گے۔ اور اگر یہاں اتنا سناٹا ہے، اور شہر کی روشنیاں اتنی دور ہیں، تو اس میں ان بے چاروں کا کیا قصور ہے، اور اگر ابھی رات کا پچھلا پہر ہے اور ان کی نیند گہری ہے تو بھی اس میں ان بے چاروں کا کیا قصور ہے۔ تم نے خود ہی اپنے کاروبار کا سارا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈال دیا ہے۔ نہیں نہیں، ان کے کندھے کمزور نہیں ہیں۔ پر بوجھ کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔ تھک جاتے ہیں بے چارے۔ آدھی رات گئے تو لوٹتے ہیں۔ جب تک لیٹتے ہیں ان کے کمروں کی بجلیاں گل ہوتی ہیں تم اپنی ساری سگریٹ پھونک چکے ہوتے ہو۔

مگر وہ لوگ یہاں آئے کیوں نہیں۔ اتنا ہی پوچھ لیتے، اولڈ مین، جی رہے ہو یا

مر چکے۔ کہاناکہ ان کو فرصت نہیں۔ اور وہ قصوروار نہیں۔ آخر کاروبار کو اتنا پھیلانے کی ضرورت کیا تھی؟ یہی تو میں بھی پوچھتا ہوں۔ جانتے ہو تم کو نیند کیوں نہیں آتی۔ تم ایک لڑائی لڑ رہے ہو۔ اپنے آپ سے۔ چھوڑو یار، پھر تم نے چھیڑ دیا وہی راگ۔ راگ تو چھڑے گا۔ تم جان بوجھ کر ان کے آنے سے پہلے اپنے کمرے کا لیمپ بجھا دیتے ہو۔ اور اس کرسی میں دھنس جاتے ہو اور کھڑکی سے اس گھر کو دیکھتے رہتے ہو جو تم نے اتنی دور جنگل میں بنوایا ہے، جھیل کے کنارے اور سڈول درختوں کے سائے میں۔

دیکھو چاند کیسا آکر کھلا ہے درختوں کی دھندلی پھنگوں میں۔ شام کو اس کنارے پر تھا اور اب اس کنارے پر ہے۔ چاند جب سفر کرتا ہے تو آسمان کے کنارے بدلتے رہتے ہیں۔ چاند اڑتا رہتا ہے۔ اور میں کرسی میں دھنسا رہتا ہوں۔ لیکن ایک بات بتاؤ، یہ لوگ بچوں کو میرے پاس کیوں نہیں آنے دیتے؟ بچے کیسے آئیں۔ تمہارے دروازے پر اتنا بڑا تالا پڑا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ان لوگوں نے اتنا بڑا تالا کیوں ڈال دیا ہے میرے دروازے پر۔ کیا یہ لوگ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ وہ آتے ہیں اور اس چھوٹی کھڑکی سے میری ضرورت کی چیزیں، دن بھر کا راشن، چپکے سے سن مائیکا کی کارنس پر رکھ جاتے ہیں۔ انہوں نے کسی چیز کا اسٹینڈرڈ گرایا نہیں ہے۔ ان کو معلوم ہے میں کون سی سگریٹ پیتا ہوں۔ اور کتنی۔ انہوں نے مجھے کسی چیز سے محروم نہیں کیا ہے۔ لیکن وہ خود کیوں غائب ہیں؟

میرے جھریوں بھرے پپوٹوں پر آہستہ آہستہ گرم گرم سا بوجھ پڑ رہا ہے۔ نہیں نہیں۔ یہ کسی کی انگلیاں نہیں ہیں۔ لیکن سچ پوچھو تو میں ان انگلیوں کو مس کرتا ہوں جن کی شبنم جھریوں میں بھر جاتی تھی لبالب، اور میری صبح ہو جاتی تھی۔ اب تو صبح ہوتی ہی نہیں۔ سورج نکلے گا، گلابی دھوپ درختوں پر پر سکھائے گی، رات بھر کی بھیگی دھوپ، اور میں سو جاؤں گا۔ کیا سورج ٹرنکولائزر ہے؟ یا کوئی مرہم ہے؟ اور جاگے ہوئے دن کا سارا شور مجھ پر سے سمندر کی موجوں کی طرح گزر جائے گا اور میں بھیگا پڑا رہوں گا۔ ساحل کی ریت کی طرح۔ نان سینس!

کیوں نہ ٹی وی آن کروں۔ یہ کوئی ٹی وی پروگرام کا وقت ہے؟ یو آر میڈ! اویس......! لیکن ریڈیو تو سنا ہی جاسکتا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی جاگ رہا ہوگا۔ گا رہا ہوگا۔ میوزک! میوزک! لیکن یہ نہیں۔ یہ نہیں۔ یہ میوزک نہیں۔ یہ کچھ اور ہے۔ اتنا شور۔ اتنا شور۔ نو نو! بند کرو۔ اب تو راکھ دانوں میں سگریٹ کے ٹکڑے بھی نہیں رہے۔ کیا میں ان لوگوں سے ٹیلیفون پر بات کروں۔ اتنی کم سگریٹیں کیوں بھجواتے ہو بھئی؟ اگر اب تک کینسر نہیں ہوا تو اب کیا ہوگا۔ اگر ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے یا تم لوگوں کو؟ لیکن نہیں، نہیں۔ صبر۔ صبر۔ دل کا پیمانہ بہت بڑا ہے۔ وہ تو چھلکتا ہی نہیں؟

گہری نیند آتی ہے یاروں کو۔ دور سے بھاری سانسوں کے سوا اور کوئی آواز نہیں آتی۔ اب تو اور بھی صاف سنائی دیتی ہیں آوازیں...... یہاں جہاں میں کھڑا ہوں کھڑکی کے پاس، جس کا پردہ میں نے ہٹادیا ہے؟ جھیل میں تلاطم تو ہوتا نہیں کہ ایسی آواز ابھرے۔ آوازیں آہستہ آہستہ کمروں کے دریچوں سے نکلتی ہیں اور درختوں میں سرسراتی ہیں اور اوس کے بوجھ سے نیچے اتر جاتی ہیں، جھیل کے جھلملاتے شیشے پر۔

اور دور چوکیدار جاگ رہا ہے، کمبل میں لپٹا ہوا بل ڈاگ کے ساتھ کھڑا ہے۔ اس کے کان کھڑے ہیں۔ لیکن میں اپنے کان کیوں چھو رہا ہوں۔ لونڈا تھا بالکل، جب پہاڑوں سے آیا تھا۔ اور اب نہ جانے کتنے بچوں کا باپ ہے۔ اس کا بڑا بچہ تو بل ڈاگ کے ساتھ ہی پیدا ہوا تھا۔ اب نام ہی نہیں یاد آرہا ہے اس کا۔ کیا نام ہے بھلا سا۔ نہیں نہیں بل ڈاگ کا نام تو یاد ہے۔ ہیرو! اب ہیرو بھی بوڑھا ہو رہا ہے۔ مگر ہے ویسا ہی چوکس کا چوکس۔

درختوں کے جال سے پانی لگتا ہے چھن رہا ہے۔ لیکن ٹھنڈا، ٹھہرا ہوا پانی، اتنا بے چین کیوں ہے۔ وہاں کوئی سائیکلون تو نہیں۔ لیکن ہوا تو نرم ہے۔ سرگوشی صاف سنائی دے رہی ہے۔ یہ سب کون ہیں، جو دکھائی نہیں دیتے لیکن جن کی آوازیں جانی پہچانی لگتی ہیں۔ میں نے کمپاؤنڈ میں بڑے بڑے لوہے کے گیٹ لگوائے تھے، چہار دیواریوں پر کانٹے دار تار تھے جن کو بیلوں نے اپنی باڑھ میں چھپالیا تھا۔ پھر جبھی تو چوکیدار اور بل

ڈاگ اور گھر کے سب لوگ گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ پھر بھی جھیل کا پانی اسی طرف آرہا ہے۔ پھر اتنی ساری آوازیں، جو وقت کی گرد میں کہیں کھو گئی تھیں۔

کیا کہا، تم کون ہو بھئی۔ دروازے پر میرے محافظوں نے، میرے گھر کے لوگوں نے اتنا بڑا تالا ڈال دیا ہے۔ پھر تم لوگ اندر کیسے آگئے ہو! اور ایسا کیوں ہے کہ میں تمہاری آوازیں سن سکتا ہوں، تمہیں دیکھ نہیں سکتا۔

نہیں میں نے کبھی کسی کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونکی۔ لیکن یہ تو کوئی جرم نہیں ہے۔ مقابلے میں یہی ہوتا ہے۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ جو کچھ تھا سامنے کا سودا تھا۔ لیکن اگر تم لوگ خود جال میں آگئے تو میں کیا کروں۔ میں نے کبھی کسی کی دولت پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں سلیقے کا آدمی تھا۔ میں اونچ نیچ جانتا تھا۔ بھئی زندگی بھی شطرنج کا کھیل ہے۔ بس اتنا ہوا کہ تم مات کھا گئے اور میں بازی جیت گیا۔ وہ بھی ہو سکتا تھا جو نہیں ہوا۔ تب تم یہاں ہوتے جہاں میں ہوں اور تم صرف میری آواز سنتے اور اس آواز میں گزرے وقتوں کی فریاد ہوتی۔

زندگی کی دوڑ لمبی ہی کتنی ہوتی ہے۔ پلک جھپکتے میں گزر جاتی ہے۔ دیکھو نا جن کے لیے میں نے یہ سب کیا وہ سب سو رہے ہیں۔ چوکیدار پہرہ دے رہا ہے اور بل ڈاگ جو بوڑھا ہو چکا ہے اس کے پاس کھڑا ہے۔ میں اس کو دیکھ سکتا ہوں لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ اور میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کو ترس گیا ہوں۔

ایسا لگتا ہے کہ صبح ہو رہی ہے اور میرے سونے کا وقت آگیا ہے۔

کوئی آہستہ آہستہ تالا کھول رہا ہے۔ اور کمرے میں ایک ایک کر کے بہت سے لوگ آگئے ہیں۔ بچے بھی۔ سب حسرت سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ سب رو رہے ہیں۔ بل ڈاگ بھی رو رہا ہے۔ چمکتی ہوئی ٹرے سن مائیکا کی کارنس پر پڑی ہے اور سگریٹ کے ڈبے ایک مینار کی طرح کھڑے نظر آرہے ہیں۔ کسی نے بڑھ کر میری آنکھیں بند کر دی ہیں۔ اور میں آخری بار سوچ رہا ہوں کیا میں کسی اور طرح بھی جی سکتا تھا...... شاید۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب میں سرگوشیاں بھی نہیں سن سکتا۔

آوازیں بھی شعلوں کی طرح جھلملا کر سو گئی ہیں۔

OO

رگِ سنگ

۱۲

منصور نے بڑے گیٹ پر پہنچ کر اپنی سائیکل آہستہ کر لی۔ اندر کوٹھی میں نیلی اور لال روشنیاں ایک پراسرار خاموشی کے ساتھ کھڑکیوں اور دروازوں پر ہلتے ہوئے پردوں سے جھانک رہی تھیں۔ دو تین کاریں بھی باہر کھڑی تھیں۔ اب بھی اسے کچھ یاد نہ آیا۔ اس نے دسمبر کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے ڈبل برسٹ کوٹ کے کالر اوپر اٹھائے اور سائیکل سے اتر کر گیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔

ان کاروں کے ڈرائیور برساتی میں کھڑے، سردی سے ٹھٹھر رہے تھے، اور بیڑی اور سگریٹ کے دھوئیں میں جاڑے کا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"آداب عرض ہے ماسٹر صاحب۔" ان میں سے ایک ڈرائیور نے اس کا خیر مقدم کیا۔

"آداب بھائی...... کیا بات ہے۔ کیا جھمیلا ہے؟"

"اوہ ماسٹر صاحب آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔؟ وہ اپنی نجمی رانی کی سالگرہ ہے نا!"

"منصور خاموش سر جھکائے، اپنے کالروں کو دبوچے ہوئے، سائیکل گھسیٹتا ہوا کوٹھی کے بائیں پہلو کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس نے کالروں کو اور زور سے دبوچ لیا۔ جیسے اسے اُن خرگوشوں کے بھاگ جانے کا خطرہ ہو۔

مالی اور ڈرائیور کے کمروں سے بھی ذرا آگے اس کا کمرہ تھا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ البتہ خانساماں اور بیروں کی کوٹھریوں کے پاس روشنی اور چہل پہل تھی۔ برتنوں کے

بجنے اور دبے دبے قہقہوں کی آواز سے اسے اندازہ ہوا کہ سالگرہ میں آئے ہوئے مہمان کچھ کھانے پینے کے دور چلا رہے تھے۔

اس نے اپنے کمرے کا سوئچ دبایا مگر کمرے میں اندھیرا ہی رہا۔

"دل دماغ سے لے کر بلب تک ہر چیز کا فیوز اڑا رہتا ہے!" وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بیٹھ کر کچھ ضروری کام کرے۔ لیکن اب روشنی غائب تھی۔ دوسری طرف کوٹھی سے لوگوں کے قہقہوں کے پٹاخوں کے پھٹنے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ اندھیرے میں ویسے ہی لیٹ گیا۔ اندھیرے میں اس کے تکیے سے بو نکل کر اس کی ناک میں گھسنے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ ٹھیک اس کے سرہانے کوئی مرا ہوا چوہا سڑا پڑا ہے۔ اس کی طبیعت متلائی اور اس نے اٹھ کر دوسری طرف کی کھڑکی کھول دی۔ اس طرف دھوبیوں کے خاندان الاؤ تاپ رہے تھے۔ ان کا اکلوتا گدھا، اپنے دونوں کان سمیٹے ہوئے ان کی دکھ درد کی کہانی بڑے غور سے سن رہا تھا۔

"میں تو کہتا ہوں بابو جی ٹائپ کے لوگ کچھ دنوں میں ننگے ہی دپھتر جایا کریں گے۔" دھوبی نے اپنا حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ اس کے گھر والے ہنسنے لگے۔ بوڑھا دھوبی سنجیدہ ہو گیا۔ "یہ کوئی مسکھری کی بات نہیں ہے اجرا۔ گاہک کے پاس جتنے کپڑے کم ہوں اپنا اتنا ہی دیوالہ نکلتا ہے!" گدھے نے قہقہہ لگا کر داد دی۔ بوڑھے دھوبی نے اس کے قہقہے کا برا مانتے ہوئے اور اس کی گستاخی پر ایک ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔ "سالے تجھے بھی مستی چڑھی ہے...... پت جھڑ میں جب پیڑ ننگا ہووے ہے۔ تو اس کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں کے سر سے سایہ اٹھے ہے......"

منصور کے ہونٹ اندھیرے میں پھیل گئے۔ اس نے کھڑکی سے ہٹ کر ایک بار پھر روشنی کا بٹن دبایا۔ لیکن بٹن دبانے سے اندھیرا جیسے اور بڑھ گیا۔ اپنے خاندان میں بیٹھ کر، اپنے بال بچوں کو اپنے پروں کے اندر چھپا کر گپ ہانکنے میں کتنا لطف آتا ہوگا"

وہ پھر لیٹ گیا۔ کھڑکی میں کھڑے ہونے کی وجہ سے اس کے کان ٹھنڈے

ہو گئے تھے۔ لیکن اس کی پیشانی سے آنچ نکل رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اسے اپنے سینے کے اندر درد کی کسک بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے کروٹ بدلی اور ساکت ہو گیا۔ جب کبھی اس کے سینے میں درد کی ہلکی سی لہر اٹھتی تھی اس کا خون جمنے لگتا تھا۔ اور وہ اس کے دل کی دھڑکن گھونسوں میں بدل جاتی تھی۔ اس وقت بھی گھونسوں کی دھمک سے اس کا پورا وجود مٹی کی دیوار کی طرح دھنستا چلا رہا تھا۔ اس نے اسی بدبودار تکیے کو اپنے سینے کے نیچے دبالیا۔

اس کے منہ سے انجانے میں ایک دوبار کراہ نکل گئی۔ اور اس کے بعد اس کے حلق سے ایک عجیب قسم کی خرخراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ اس پر غنودگی طاری ہو گئی اور تھوڑی دیر کو اس کے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ قبر کا سناٹا۔

کوٹھی میں محفل کافی گرم ہو چکی تھی۔

مہمان کھانا کھا چکے تھے۔ اور اب کافی کا دور چل رہا تھا۔ سبھوں کے ہاتھوں میں نیلی پیالیاں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی، کھلونوں کی طرح، جیسے گڑیوں کے ہونٹوں کے چھونے کے لیے بنائی گئی ہوں۔ صوفے کے تین سیٹ اس طرح رکھے گئے تھے کہ کمرہ کا تکونہ احاطہ سا بن گیا تھا۔ چوتھی طرف بڑا دروازہ تھا۔ جو بالکنی میں کھلتا تھا۔ دروازے پر پڑا ہوا نیلا مخملیں پردہ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ جس پر دور قاصائیں اجنتائی کولہوں کو ایک طرف پوری وحشت سے لچکاتی ہوئی، اور اپنی بانہوں کی پرواز میں ترنم کی پینگ پیدا کرتی ہوئی فضا میں آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھیں۔

پروفیسر قدوس نے اپنی اونٹ کی سی گردن ذرا اٹھائی، اپنی ٹائی کو دو تین بار سہلایا اور آنکھوں میں للچاہٹ کی آگ کو پلکوں سے چھپاتے ہوئے اپنے خاص معشوقانہ انداز میں نجمی رانی کو دیکھا، جو ایک سیاہ ساری میں لپٹی ہوئی اپنے سڈول جسم کے پیچ و خم کا اشتہار بانٹتی، رانا صاحب کے پاس صوفے پر بیٹھی پوچھ رہی تھی۔ "کیوں رانا صاحب کافی کا دوسرا دور چلے گا یا نہیں؟"

رانا صاحب نے فوراً اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا جو بلب کے نیچے کدو کی طرح

چمک رہا تھا۔ ''بھئی تم کہو تو...... رات بھر کافی کیا زہر کا دور چلتا رہے۔''

رانا صاحب اپنی ادھیڑ عمر کا غم اس قسم کے جملوں سے غلط کر کے ''پبلک'' کی نظر میں اپنا بھرم رکھنے کی کوشش موقع بے موقع کرتے رہتے تھے۔ نجمی رانا صاحب کی جوہر شناسی اور قدر دانی کی قدر کرتی تھی۔ اور اپنی ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے ان کا دل رکھنے کی کوشش ہمیشہ کیا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت پروفیسر قدوس کپتان زیدی، ڈاکٹر کیلاش اور پروفیسر نجیب (جن کو لوگ ان کے نسلی گڈمڈ پر طنز کرنے کے لیے نجیب الطرفین کے نام سے یاد کیا کرتے تھے) کی موجودگی میں رانا صاحب کا یہ جملہ نجمی کو برا لگا اور اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ رانا صاحب کو اپنے بے سرے پن کا احساس فوراً ہوا۔

اور انہوں نے تلافی کے لیے کہا۔

''بھئی قدوس تم پردے کی تصویروں کو کیوں کھائے جا رہے ہو۔ اور بھی دلکش چیزیں ہیں یہاں۔''

''رانا صاحب میں تو نجمی کو دیکھ رہا ہوں۔''

''تیر نشانے پر نہیں بیٹھا۔''

اوروں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ نجمی بدمزہ ہو گئی۔ ''یہ لوگ کتنے چھچھورے اور بے وقوف ہیں۔'' اس نے اپنے گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

''نجمی تمہارے بال تو آج خوب بنے ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کے پیچ و خم مصنوعی ہیں۔''

ایک اور زخم لگا۔ نجمی ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے سوا محفل کی خدمت میں اور کچھ پیش نہ کر سکی۔

نجمی اٹھی اور رانا صاحب کی بہن سریتا کے پاس بیٹھ گئی۔

مہمانوں نے اپنی ننھی منی پیالیوں میں دوبارہ، نکل کے چمکدار پرکیولیٹر سے، کافی انڈیلی اور اپنی اپنی نشستیں بدل کر اور نئے نئے حلقے بنا کر بیٹھ گئے۔

پروفیسر قدوس بھی سریتا اور نجمی کے پاس آبیٹھا۔

سریتا نے اپنی آنکھوں کے پٹ فی منٹ ایک ہزار بار کی رفتار سے کھولے اور بند کئے، اور معنی خیز نظروں سے نجمی کے پریشان اور اداس چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی:

"کیوں قدوس صاحب ان دنوں آپ ہماری طرف نہیں آتے۔ لگتا ہے آپ کی شاموں کا بھاؤ بہت بڑھ گیا ہے۔"

پروفیسر قدوس نے اپنا ہاتھ سریتا کے دپ دپ کرتے ہوئے شانے پر رکھ دیا، اور اس کی لمبی لمبی انگلیاں سیاہ بلاؤز کے گلے سے ذرا اوپر سنہری جلد پر آہستہ آہستہ تھرکنے لگیں۔ سریتا کا جسم کانپ گیا اور اس کی نظریں جھک گئیں۔

نجمی کا نچلا ہونٹ اپنے پتلے پن کے باوجود لٹک آیا۔ اور لپ اسٹک کی لیپ چمکنے لگی۔ "سریتا کا عشق ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ بے وقوف! پروفیسر قدوس کو نہیں پہچانتی۔"

"بھئی تم جانتی ہو۔ نجمی کی ذرا مدد ہو جائے تو وہ یونیورسٹی میں ٹاپ کر سکتی ہے۔ میں تعلیم میں اس کی مدد کرنے چلا آتا ہوں۔"

"ٹاپ تو میں بھی کر سکتی ہوں۔" سریتا نے اپنی کافی کی پیالی منہ سے لگاتے ہوئے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"تو تمہیں پڑھایا نہیں میں نے گھر پر...... لیکن جب تمہاری ماتاجی......" وہ رک کر سیٹی بجانے لگا۔ پھر نجمی کی گردن پر سنہری بالوں کے گچھے پر ایک جماہی بھری نظر ڈالتے ہوئے بولا: "نجمی! یہ کیا تک ہے تم نے آج کوئی غزل نہیں سنائی۔"

نجمی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اور بڑے کلاک کو گھورنے لگی جو گیارہ بجا رہا تھا۔ رانا صاحب نے نجمی کو کلاک کی طرف اس طرح گھورتے ہوئے دیکھ کر دل میں بڑی گدگدی محسوس کی۔ پچھلے سال اس نے سالگرہ کے موقع پر یہ تحفہ دیا تھا۔ اس رات سب سے آخر میں رانا صاحب رخصت ہوئے تھے۔ سریتا پروفیسر قدوس کے ساتھ جاچکی تھی۔ اور جب زینے کے پاس نجمی نے الوداع کہتے ہوئے اپنا نرم ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا تو وہ سردی کے باوجود ایک کبوتر کی طرح گرم محسوس ہوا تھا۔ وہ

خلاف قاعدہ دیر تک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے رہا تھا۔ اور وہ صرف یہ کہہ سکی تھی:
"رانا صاحب ذرا جاڑ چاندنی کو دیکھئے۔ جاڑے میں چاندنی پر کیسی بیوگی چھا جاتی ہے۔"

اور اس رات گھر جا کر رانا صاحب نے وہسکی کا گلاس خالی کرتے ہوئے تقریباً زور سے نعرہ لگایا تھا۔ "کاش میں ادھیڑ نہ ہوتا، ورنہ چاندنی کی بیوگی مہکتے مہکتے سہاگ میں بدل جاتی۔ اب کے میرا تحفہ سب سے زور دار رہا۔ ہی ہی ہی۔" اس کے پیٹ میں شراب اتر رہی تھی۔ اور اس کی خوشی کا پانی اس کے سر کے اوپر سے بہہ رہا تھا۔ آج کتنی دیر تک اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیئے کھڑی رہی۔ "چاندنی کھلی ہو اور تحفہ قیمتی ہو۔ تو جنت اتر آتی ہے زمین پر۔ ہی ہی ہی۔"

اور اس وقت جب نجمی کو بار بار کلاک کی طرف گھورتے ہوئے دیکھا تو چہک کر بولے۔

"نجمی گھڑی وقت تو ٹھیک دیتی ہے نا۔"

"جی...... جبھی تو گیارہ بجا رہی ہے۔"

سب نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس اشارے کو صاف گول کر گئے۔ جب سریتا نے دیکھا کہ پروفیسر قدوس اپنی اونٹ کی سی گردن کو ہلا ہلا کر نجمی پر نچھاور ہوئے جا رہے ہیں۔ تو وہ اٹھ کر کپتان زیدی کے پاس چلی گئی۔ انہوں نے فوراً بندۂ بے دام کے سے انداز میں اپنا سنہرا دانت جھلکاتے ہوئے اپنا سگریٹ کیس کھول کر اس کے سامنے پیش کیا۔ سریتا نے ایک سگریٹ نکالتے ہوئے سگریٹ کیس کے اندرونی پلیٹ پر ایک عورت کی ایسی ہیجانی تصویر دیکھی کہ اس کے رخساروں پر رنگ آگیا۔ اور جاڑے کی رات میں بھی اس کی پیشانی نم ہو گئی۔

"آپ کی نئی کار ڈوج ہے نا؟ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اور دھوئیں کی تلخی سے ایک آنکھ میچتے ہوئے کپتان زیدی کی سنہری مونچھوں کی باریکی پر حیران نگاہیں دوڑائیں۔

"تم غضب کرتی ہو میں نے تو......" ٹھیک اسی وقت رانا صاحب کو ایک زور دار چھینک آئی۔ اور محفل میں جو مختلف ٹولیاں بن گئی تھیں اپنے خول سے باہر نکل آئیں،

اور سب نے بڑھ کر ان کی چھینک کی داد دی۔

ایک دو بار بیرے آئے اور ''اور کچھ چاہئے حضور۔'' کی رٹ لگا کر جس پردے کے پیچھے سے طلوع ہوئے تھے۔ اسی پردے کے پیچھے غروب ہو گئے۔

''نجمی کل کلاس آؤ گی؟''

''شاید...... شاید آؤں گی...... کچھ کہہ نہیں سکتی۔'' پروفیسر قدوس نجمی سے بہت قریب ہو گیا تھا۔ اور اس کے دل میں اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسے موقعے پر اس کا چہرہ کلاسیکل احمقوں کا سا ہو جاتا تھا اور اس کے ہونٹوں پر، جو ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں کی حد تک پتلے تھے، خزاں کی خشکی چھانے لگتی تھی۔ ایسے وقت یہ خزاں اس کے ہونٹوں پر، آنکھوں میں اور اس کی باتوں میں ہوتی تھی۔ جتنی یہ خزاں تیز ہوتی اتنی ہی اس کی آنکھوں میں جرم کی لو تیز ہو جاتی۔ وہ بڑی شکل سے اپنے خون کی آگ پر پانی ڈال پاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی گندمی اور مریضانہ رنگت میں وہی جلن پیدا ہو گئی تھی۔

کپتان زیدی نے جماہی لی۔ اور ان کے ساتھ سریتا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنا سبز مخملیں کوٹ پہنا اور بائیں بازو کے قد آدم آئینے میں اپنی ایک جھلک دیکھی۔ کپتان زیدی اپنی توند پر پل اور کو کھینچ کر برابر کر رہا تھا۔ سریتا کے پاس کھڑا وہ کتنا گھٹنا سا لگ رہا تھا۔ اس کے نقوش کتنے بھدے تھے۔ اور وہ کتنا کند ذہن...... لیکن خیر...... اس کی احمقانہ باتیں، ٹھنڈی سانس اور عشقیہ شعر (وہ بھی غلط سلط) سننے میں بڑا مزا آئے گا۔ سریتا پہلے نکلی اور اس کے پیچھے...... ''اے۔ میڈ ڈرائیور۔'' نجیب اس خیال سے لڑکھڑا گیا۔

کپتان زیدی کے جانے کے بعد اور لوگ بھی چلے گئے۔ صرف رانا صاحب اور پروفیسر قدوس بیٹھے سگریٹ کے کش اڑا رہے تھے۔ اور نجمی تقریباً اونگھ رہی تھی۔

''نجمی تمہیں ابھی سے نیند آنے لگی؟''

''ہاں بھئی چلنا چاہئے۔''

لیکن دونوں اسی طرح جمے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد نجمی نے آنکھیں بند

کر لیں۔ رانا صاحب کو ہی غیرت نے مجبور کیا اور دل میں پروفیسر قدوس کو کوستے ہوئے اٹھے۔ "یہ کم بخت گوند کی طرح چپک جاتا ہے...... سریتا بے وقوف بھی خواہ مخواہ کپتان زیدی کے ساتھ چل دی۔ اس نے اپنا چسٹر اٹھایا اور بولا: "اچھا بھئی نجمی میں چل دیا۔ تو کل آنا چائے پر......"

"نہیں بھئی کل نہیں پھر کبھی۔" اس نے آنکھیں ذرا سی کھولیں اور مسکرائی۔

"پھر کبھی! تو اچھا پھر کبھی۔"

پردہ اٹھا اور وہ بھی غائب۔

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ کلاک کی آواز کمرے کا دل بنی ہوئی تھی۔

"ارے اب تو ساڑھے گیارہ بج گئے۔" نجمی نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں نجمی آج تم اتنی اداس کیوں رہیں۔ تم اتنی کھوئی ہوئی کیوں رہتی ہو۔ مجھ سے کہو میں تمہارا بے لوث دوست ہوں۔ استاد ہوں۔ میں تمہارے لیے سب کچھ کروں گا۔" اور اس نے نجمی کا ہاتھ اپنے لمبے بے ڈھنگے ہاتھوں میں لے لیا۔

نجمی پر گویا بے ہوشی طاری تھی۔ اس کی پلکوں پر آنسو چمک رہے تھے اور ہونٹوں کے کونے تھرتھرا رہے تھے۔ پروفیسر قدوس کو اپنی ٹائی پھانسی کے پھندے کی طرح کسی ہوئی معلوم ہوئی۔ گلا سوکھ گیا۔ اور دل الٹنے لگا۔

"آخر تم بولتیں کیوں نہیں۔ تم رو کیوں رہی ہو۔ میں تمہارا استاد ہوں، اور استاد سے زیادہ تمہارا دوست۔ بے غرض، بے لوث، صرف دوست!" وہ آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ کو سہلانے لگا، جس کے ناخنوں کی سرخی لو دے رہی تھی۔

نجمی کی رگوں میں جیسے بجلی دوڑ گئی ہو۔ سگار سگریٹ، کافی اور قسم قسم کے سنٹ کی خوشبو ایک بار پھر اس پر حملہ آور ہوئی۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور آنکھوں میں انتہائی حیرت، برہمی اور طنز بھر کر پروفیسر قدوس کو گھورنے لگی۔ وہ پھر مسکرایا......

اور ایک بار پھر حسب عادت نجمی کے ہاتھ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"قدوس صاحب آپ کی دوستی بے لوث ہے نا؟"

"بھئی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟" وہ ایک بار پھر نجمی پر جھک گیا۔

"آپ یونیورسٹی کی کتنی لڑکیوں سے روز یہی بات کہتے ہیں۔"

وہ تتلانے لگا۔ اسے بجلی لگ گئی تھی۔ "نجمی...... نجمی......ن،ن۔ اچھا تو میں چلا۔ لیکن تم نہیں جانتیں تمہارے لیے میرے جذبات کیا ہیں۔ میں سمجھتا تھا تم جانتی ہو۔ اچھا...... آخر تم کسی نہ کسی بے وقوف کا انتخاب تو کرو گی نا......"

"لیکن وہ بیوقوف آپ نہیں ہوں گے۔" وہ کھڑی ہو گئی اور دروازے کی طرف انگلی اٹھا کر اس کو باہر نکلنے کا اشارہ کرنے لگی۔

جب وہ دروازے سے باہر نکل رہا تھا تو نجمی کو ایسا لگا کہ پروفیسر قدوس کی ٹانگیں بھاپ بن کر اڑ گئیں ہیں۔ اور اس کی پتلون چل رہی ہے۔

ہر طرف خاموشی برس رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر اسی طرح کھڑی رہی۔ اندر کے حصے سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ کمرے کا پردہ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا اور اجنتائی رقاصائیں اسی طرح ناچ رہی تھیں۔ وہ بڑا سا ہاتھی کارنس پر......اور اس کے سفید دانت جو دو بانہوں کی طرح کوئی بوجھ اٹھانے کے لیے نیچے جھکے ہوئے تھے۔ کتابیں، کشمیر کے مناظر کے فریم، بنگالی مصوروں کی تصویریں، ریڈیو کی میز......یہ ساری چیزیں اسے گھور رہی تھیں......اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

جب وہ اندر گئی اور آہستہ آہستہ اپنی ماں کے کمرے میں پہنچی تو وہ جائے نماز پر سجدہ میں پڑی تھیں۔ کونے کے کشمیری لیمپ سے مدھم مدھم روشنی نکل رہی تھی۔

نجمی نے اپنی ماں کا سر چھوا۔ ان کے سن سفید بال کتنے نرم تھے۔ وہ بھی وہیں پاس بیٹھ گئی۔

"بیٹی یہ کیا کرتی ہو۔ یہاں نہ بیٹھو، کتنی کڑاکے کی سردی ہے۔"

"اماں!" ماں کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو گر رہے تھے، جو ان کی جھریوں پر سے تیرتے ہوئے ٹھوڑی سے ٹپک رہے تھے۔

"گھبرائیے نہیں اماں، کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی! سچ......"

"میری بیٹی...... مجھے کیوں بہلاتی ہے۔" وہ پھر اپنی ناک صاف کر کے تسبیح کے دانے کھٹکھٹانے لگیں۔ وہ کچھ پڑھتی جا رہی تھیں اور نجمی کے بھنچے ہوئے ہونٹوں کو دیکھتی جا رہی تھیں۔

نجمی وہاں سے اٹھی اور اپنی بہن منیرہ کے کمرے میں دبے پاؤں گھسی۔ اس کے آہٹ پاتے ہی وہ سوتی سی بن گئی۔

"شریر!...... تو سو رہی ہے۔ تو پھر یہ روشنی کیوں ہو رہی ہے؟"

منیرہ نے منہ بنا کر کروٹ بدل لی۔ اس کی دونوں چوٹیاں اس کی گردن میں لپٹ گئی تھیں۔

"باجی مجھے تنگ نہ کرو۔"

"نہیں میں تنگ نہیں کروں گی۔ پر بتا آج باہر کیوں نہیں آئی تو۔ میری سالگرہ کی پارٹی میں۔"

"پارٹی میں جاتی میری بلا۔"

"کیوں بتا...... میری پیاری منیرہ......"

"وہاں میرا کون تھا۔ میں بیگانوں میں بیٹھ کر الو کیوں بنوں۔ تم تو اپنے دوستوں کو بلاتی ہو۔"

"لیکن تیری سالگرہ پر بھی تو......"

"ہونہہ اس میں بھی تمہارے پروفیسر قدوس دھنس مرے تھے یاد ہے۔"

نجمی خاموش ہو گئی۔ منیرہ نے ساٹن کے لحاف میں اپنا منہ گھسا لیا۔ اس کے سرہانے ایک کتاب رکھی تھی۔ "ٹرو رومانس۔" اس نے دوسری طرف کونے میں دیکھا۔ کالی موٹی، بلی پلیٹ سے دودھ پی چکی تھی اور اب پلیٹ کو آہستہ آہستہ چاٹ رہی تھی۔ اسے لگا کہ پروفیسر قدوس بھی اسی طرح اس کے جسم کو چاٹ رہا ہے۔ اس کا خون سرد پڑ گیا۔

وہ تھکی ہوئی اٹھی اور دبے پاؤں پچھلے حصے میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

اس نے تھوڑی دیر تک بٹن نہیں دبایا۔ اسے اپنے کمرے میں گھٹن محسوس ہوئی اور اس نے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ باہر درختوں، مکانوں، پھولوں اور سڑک پر چاندنی سوئی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ منصور کا کمرہ خلاف معمول تاریک اور خاموش ہے۔ نہ وہ کھانس رہا ہے، نہ غالب کی غزل گا رہا ہے، نہ کوئی اخبار زور زور سے تقریر کے انداز میں پڑھ رہا ہے۔ دھوبی کی کوٹھری بھی خاموش تھی اور دوسری طرف بیرے بھی کھاپی کر خاموش ہو چکے تھے۔

یہ منصور بھی عجیب آدمی ہے اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ آخر وہ اتنا اکڑا اکڑا کیوں رہتا ہے۔ آج وہ میری سالگرہ میں بھی شریک نہیں ہوا، اپنی شاگرد منیرہ کی طرح! صبح منیرہ کو پڑھاتا ہے اور پھر اسکول چلا جاتا ہے۔ رات کو آتا ہے۔ دھوبی سے، بیروں سے، ادھر ادھر کے لوگوں سے گپیں ہانکتا ہے۔ اخبار پڑھتا ہے، کچھ لکھتا ہے۔ غزلیں گاتا ہے یا پھر سو رہتا ہے۔ اسے تین مہینے سے منیرہ کو پڑھانے کی تنخواہ نہیں ملی تھی۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ کبھی میں ہی بات کرلوں تو چھوٹے منہ بات کر لیتا ہے ورنہ سمجھتا ہے جیسے میں کوئی ہوں ہی نہیں۔ جیسے میں اگزسٹ ہی نہیں کرتی۔ منیرہ کے دماغ میں عجیب عجیب اوٹ پٹانگ باتیں ٹھونستا رہتا ہے۔ ابھی اس دن کہنے لگی۔

"میک اپ تو وہ لوگ کرتے ہیں جن کو اپنے حسن پر بھروسہ نہیں ہوتا۔" یہ بات منیرہ کے دماغ میں آہی نہیں سکتی۔ ہو نہ ہو اسی منصور نے اس کے دل میں یہ بات بٹھائی ہے۔ وہ ہمیشہ اس کا مذاق اڑانا چاہتا ہے۔ بڑا افلاطون سمجھتا ہے خود کو۔ دنیا میں یہ ہو رہا ہے، دنیا میں یہ نہیں ہو رہا ہے۔ دنیا میں یہ ہونا چاہئے۔ گویا دنیا کا سارا کارخانہ آپ کے حکم سے چلنا چاہئے۔ پچھلے سال سالگرہ میں کیا سین کریئٹ کیا تھا اس آدمی نے۔ اچھی خاصی سالگرہ کی محفل جمی ہوئی تھی، رانا صاحب نے کہیں پوچھ لیا:

"ماسٹر صاحب آپ کا تحفہ کہاں ہے۔"

"آپ بجائے خود ایک تحفہ ہیں۔" پروفیسر قدوس نے پھبتی کسی تھی۔ "کیوں نجمی؟"...... وہ خاموشی سے اٹھا تھا۔ نظر بھر کر سب کو دیکھا تھا۔ "آپ کے ان تحفوں

کے پیچھے جو جذبات کام کر رہے ہیں۔ ان سے میرا دل میری جیب کی طرح خالی ہے۔"...... اس نے کتنی نفرت اور حقارت سے یہ بات کہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ منصور ابھی تک لوٹا نہیں ہے، آؤ ذرا دیکھیں اس کے کمرے میں......

وہ آہستہ آہستہ پچھلے زینے سے اتری اور منصور کے کمرے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ کوئی سانس لے رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں پھر واپس چلی آئی۔ سانس کی خرخراہٹ سے اس کا دل ڈر گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے بٹن دبایا۔ الماری کے قد آدم آئینے میں اس نے اپنے چہرے پر برستی ہوئی وحشت کا اندازہ لگایا۔ اس کے لپ اسٹک کا رنگ اوپر اور نیچے لبوں کی سرحد سے باہر پھیل رہا تھا۔ اور آنکھوں کا کاجل آنسوؤں سے ڈھل کر ناک کی دیوار تک چلا آیا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔ اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

جب اس نے کپڑے اتارے تو اسے بڑی ٹھنڈ محسوس ہوئی۔ وہ جلدی سے شب خوابی کا لباس پہن کر اپنے لحاف میں گھس گئی۔ اس نے سونے کی بہت کوشش کی مگر آنکھیں بند ہی نہیں ہو سکیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی کمرے کا اندھیرا دور ہو جاتا اور اس کی ماں کی جھریاں آنسوؤں سے تر نظر آتیں، منیرہ کا روٹھا ہوا چہرہ ٹرورومانس کے پاس، اور پلیٹ چاٹتی ہوئی بلی اور اس کے بدن کو چاٹتا ہوا پروفیسر قدوس...... اور وہ اٹھ بیٹھتی۔ وہ پھر لیٹ جاتی۔ تھوڑی دیر تک لیٹی رہتی اور پھر اٹھ بیٹھتی۔

منصور کی آنکھ کھلی تو وہ مارے سردی کے کانپ رہا تھا۔ اس کی گردن جل رہی تھی اور منہ میں کوئی تلخ اور جلی ہوئی چیز پگھل رہی تھی۔ وہ اٹھا اور اس نے ادھر ادھر ٹٹول کر ماچس کی ڈبیا ڈھونڈ نکالی۔ ماچس جلا کر اس نے نہ جانے کب کی جلی ہوئی موم بتی کا ایک ٹکڑا بھی تلاش کر لیا۔ موم بتی کی مریل سی روشنی میں اس کے کمرے کی ہر چیز اپنا سایہ معلوم ہوتی تھی۔ دھندلی دھندلی۔ اس کا کھانا کوئی رکھ گیا تھا۔ چھوٹی سی میز پر۔ جس کے نیچے اس کے ٹوٹے ہوئے جوتے منہ کھولے پڑے تھے۔ اس کا کھانا جم چکا تھا۔ اور سالن کے پیالے میں ڈالڈا کے جمے ہوئے ٹکڑے برف کے تودوں کی مانند

ایک ہی جھٹکے میں تیر نے لگے تھے...... بحیرۂ منجمد...... قطب شمالی...... واہ!''

کھانا کھالوں؟ بخار سالگ رہا ہے۔ سینے میں درد بھی ہے لیکن بھوک بھی لگ رہی ہے۔ صبح ناشتے کے بعد شام کے ٹیوشن پر صرف ایک پیالی چائے ملی وہ بھی دھوئیں میں پکی ہوئی اور ٹھنڈی۔ اس نے روٹی توڑی اور جمے ہوئے سالن کے ساتھ ایک لقمہ منہ میں رکھا لیکن کھانا اسے اتنا بدمزہ معلوم ہوا کہ اس کا جی چاہا سب کچھ تھوک دے۔ لیکن اس سے پہلے ہی لقمہ اس کے پیٹ میں پہنچ چکا تھا۔

لحاف میں لیٹ کر اس نے وقت کا اندازہ لگانا چاہا۔ موم بتی تیزی سے پگھلتی جارہی تھی۔ اس نے پھونک مار کر موم بتی کو بجھادیا۔ دروازے سے تیز ہوا آرہی تھی۔ اور کوٹھی کا وہ حصہ جہاں پر نجمی کا کمرہ تھا چاندنی میں اونگھتا ہوا نظر آرہا تھا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کے سینے کا درد کم محسوس ہوا۔

وہ سویرے سویرے اوپر پہنچ گیا۔ زینے پر ٹائگر سویا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے بھی ایک جماہی لی اور پھر دراز ہو گیا۔ واقعی بڑی ٹھنڈک تھی۔ وہ جاکر مطالعہ کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ گلدان میں باسی پھول سر جھکائے ہوئے تھے اور ٹیگور کی اداس آنکھیں ان پھولوں پر ترس کھا رہی تھیں۔

صبح کا اخبار الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد جب منیرہ کے آنے میں خلاف معمول دیر ہوئی تو اس نے دروازے پر دستک دی۔ بڑی بی آئیں۔ ان کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ اور ان کے ہونٹوں پر پان کی پیک خشک ہو رہی تھی۔ بولیں...... ''ذرا ٹھہریئے ماسٹر صاحب منیرہ بی تیار ہو رہی ہیں۔''

منصور کرسی پر بیٹھ گیا۔ بڑی سی کھڑکی پر رات بھر کی اوس جمی ہوئی تھی۔ اور آگے ساری عمارتیں اور درخت کہرے میں چھپے ہوئے بہت دھندلے نظر آرہے تھے۔

کتنی دھند ہے، کتنی ٹھنڈک،...... کیا میں اسی دھند اور ٹھنڈک میں لیٹا کراہتا رہوں گا۔

منیرہ آگئی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اور پپوٹے سوج رہے تھے۔

"کیا تم رات بھر سوئی نہیں؟" منصور نے اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ماسٹر صاحب آج پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔"

وہ اٹھی اور فوراً چل دی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ کہ نجمی اپنے ڈریسنگ گاؤن میں پہنچ گئی۔ اس نے دس دس کے نو نوٹ، اس کے ہاتھ میں دیئے .... معاف کیجئے گا...... تین مہینے کی تاخیر ہو گئی۔ کہیے آپ کی اماں کا فالج کیسا ہے؟

"ادھر کوئی خط نہیں آیا۔ اچھی ہی ہوں گی۔"

وہ لوٹ گئی۔

وہ سوچنے لگا آخر کیا بات ہے نجمی اتنی اداس کیوں ہے۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا میک اپ نہیں تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور انگوٹھیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اور اس کی آنکھوں سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ سوئی نہیں ہے رات بھر۔

جب اسکول جانے کے لیے وہ سائیکل پر بیٹھ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ نجمی بالکونی میں کھڑی تمام ملازمین کو ہدایات دے رہی ہے۔ وہ سب اس طرح کھڑے تھے جیسے عدالت میں کھڑے ہو کر اپنے کسی مقدمے کا فیصلہ سن رہے ہوں۔ کالا پانی، عمر قید......

"یہ لڑکی نجمی! کبھی رنگ و نور کا طوفان بن جاتی اور کبھی ٹنڈ منڈ پیڑ!"

وہ ایک زمانے سے اسی گھر میں تھا اور منیرہ کو پڑھاتا تھا۔ وہ جس اسکول میں ملازم تھا وہاں سے کبھی تنخواہ ملتی تھی کبھی نہیں۔ کبھی کبھی چھ مہینے کے بعد قطرہ قطرہ کر کے تنخواہ وصول ہوتی تھی۔ وہ ایک اور ٹیوشن کرتا تھا۔ اور جو کچھ پیسے مہینے میں مل جاتے تھے۔ اس میں سے بڑا حصہ وہ اپنی ماں کو بھیج دیتا تھا۔ اسکول کے ساٹھ روپوں کا کوئی بھروسہ ہی نہیں تھا۔ اس وقت نوے روپے اس کی جیب میں تھے اور وہ اسکول جانے سے پہلے ڈاک خانے جا کر اپنی ماں کو منی آرڈر بھیجنا چاہتا تھا...... راستے میں بار بار اسے نجمی کا خیال آیا۔

کبھی تو وہ اتنی مغرور ہو جاتی کہ اس کے سلام کا کوئی نوٹس نہ لیتی اور جب جواباً وہ اسے سلام کرنا اور اس کا نوٹس لینا چھوڑ دیتا تو ایک دن اچانک اسے آ پکڑتی...... ماسٹر صاحب آپ تو بالکل اجنبی کی طرح آتے ہیں گزر جاتے ہیں۔ آیئے کیرم کھیلیں۔

کیرم نہیں کھیلتے، تو پھر چلئے شطرنج کی ایک بازی ہو جائے۔"

وہ دوسروں پر بہت بھروسہ کرتی تھی۔ اپنے دوستوں پر۔ اپنے ملنے جلنے والوں پر۔ اب یہ نجیب الطرفین صاحب...... اس کے گھر کے ہر کام میں مداخلت ضرور کرتے تھے۔ بزرگ ہنستے تھے اور اپنی بزرگی کا اظہار نجمی کے گالوں کو چھو کر اور بات کرتے ہوئے اس کے کندھوں پر اپنا سارا بوجھ ڈال کر کرتے تھے۔ جیسے ان کے دونوں پاؤں کٹے ہوئے ہوں اور نجمی ان کی بیساکھی ہو۔

وہ جانتا تھا کہ بیرسٹر صاحب کی موت کے بعد گھر کا سارا دھندا زیورات کے بل بوتے پر اور اس کے بعد باغ بیچ کر، اور آخر میں اس کوٹھی کو رہن رکھ کر چلتا رہا تھا۔ یونیورسٹی میں نجمی پروفیسر قدوس کی دوستی کی بدولت ہر طرح کے اسکنڈل کا شکار تھی۔ لیکن وہ ان باتوں کو نفرت اور غصے سے ٹال دیتی تھی۔ وہ جانتی تھی پروفیسر قدوس اس کا مخلص دوست ہے۔ منصور یہ ساری باتیں جانتا تھا اور خاموش تماشائی کی طرح اپنا کام کرتا رہتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی وہ اسے حد درجہ اداس دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ اس دن وہ میک اپ نہ کرتی۔ اپنے یہاں آنے والوں سے ملنے سے انکار کر دیتی۔ یہاں تک کہ ایسے وقت پر پروفیسر قدوس بھی اپنی معشوقانہ شہادت کا پوز بناتے ہوئے واپس ہو جاتے۔

لیکن رات کی چہل پہل اور رنگارنگی کے بعد صبح منصور نے جو کچھ دیکھا تھا وہ کچھ عجیب معلوم ہوتا تھا۔ اس نے نجمی کو اتنا غم زدہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔

شام کو جب منصور اپنے پنکچر سائیکل کو گھسیٹتا ہوا اسکول سے واپس آ رہا تھا تو اس کے دماغ میں صرف ایک خیال تھا۔

ہیڈ ماسٹر نے اس سے کہا تھا "ڈاکٹر کی رپورٹ کے بعد یہ ضروری ہو گیا ہے کہ آپ اپنے علاج کے لیے ایک لمبی چھٹی لے لیجیے۔ لڑکوں کے لیے آپ کی موجودگی خطرناک ہے۔ خدا کے لیے اب سائیکل پر چڑھنا چھوڑ دیجیے۔"

"سائیکل پر چڑھنا چھوڑ دیجیے۔ میرے پاس بھی کوئی کار ہے کیا؟"

اس کے جسم پر پسینہ تیرنے لگ گیا تھا۔ اور اس دن پان کی دوکان پر جب وہ

سگریٹ خرید رہا تھا تو اس کو اپنا چہرہ ہلدی کی طرح زرد نظر آیا تھا۔
کبھی کبھی کوئی اولہ اس کی سائیکل پر گرتا اور اس کی ٹکر سے ہلکی سی آواز پیدا ہوتی۔ جیسے خالی گلاس میں چمچہ ٹکڑا رہا ہو۔ اس کا گرم کوٹ بھیگ گیا تھا۔ بال بھیگ کر آگے لٹک آئے تھے۔ اور اس کے کابلی سینڈل سے چھینٹیں اڑ اڑ کر اس کی پتلون پر گل بوٹے بنا رہی تھیں۔

جب وہ گیٹ کے قریب پہنچا تو ہانپ رہا تھا۔ اور اس کا چہرہ اتنا زرد معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے منہ پر ابٹن مل دیا گیا ہو۔ پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ اور ایک بڑا سا ٹرک الماریوں، کرسیوں اور مختلف قسم کے سامان سے بھرا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ وہ ٹھٹھرتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا۔ اس کے میلے گندے تکیے پر ایک لفافہ رکھا تھا۔ لفافے کے اوپر ہی لکھا تھا۔
"ماسٹر صاحب پہلی فرصت میں مجھ سے مل جایئے۔"
آخر بات کیا ہے نجمی مجھے کیوں بلا رہی ہے۔ ایک زمانے سے وہ ان لوگوں کے ساتھ رہتا آ رہا تھا، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کبھی کوئی کام ہوا بھی تو ملازم سے بلوالیا۔ ایک بار منصور کو یہ بات بری بھی معلوم ہوئی تھی۔ اور اس نے اچھی خاصی جھاڑ بتادی تھی۔
"نجمی صاحبہ آخر آپ میرے جیسے لوگوں کو سمجھتی کیا ہیں۔ اب اس وقت میں صرف اس لیے شہر جاؤں کہ ممکن ہے کہ صبح تک بلاؤز کا وہ ٹکڑا بک جائے جو آپ کو دوکان میں پسند نہیں آیا۔ لیکن جب آپ گھر پہنچیں تو...... یہ بھی کوئی تک ہے؟ معاف کیجئے گا...... میں اس وقت اپنا کام کر رہا ہوں۔"
وہ آنکھیں کھولے ہوئے اس کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کی انگلی لب پر چپک گئی تھی۔ اور بغیر کچھ کہے وہ گھر کے اندر چلی گئی تھی۔ وہ دن اور آج کا دن اس نے کبھی کسی کام کے لیے اس سے نہیں کہا تھا۔ ایک بار وہ بیمار بھی پڑی اور اچھی بھی ہوئی لیکن اس سے ایک بار کسی کام کے لیے نہیں کہا گیا۔ لیکن اس وقت بات دوسری تھی۔ پروفیسر قدوس اپنا دل ہتھیلی پر لیے ہر وقت کھڑا رہتا تھا۔
بارش تیز ہوگئی تھی اور اولوں کی پٹر پٹر بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا

تھا۔ اس نے زور سے سانس لے کر باہر کی طرف دیکھا۔ پھواروں کی چادر سے پرے نجمی کے کمرے کی کھڑکی کا قد آدم شیشہ جھلملا رہا تھا۔ شیشے پر ایک لڑکی کا سیاہ سایہ ابھرتا اور تیرتا ہوا نکل جاتا۔ زلفیں اڈی ہوئی اور منہ سے دھواں نکلتا ہوا...... نجمی ٹہل رہی ہے۔ دیکھوں کیا گل کھلے ہیں؟

پانی میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔

بوڑھا رمضانی اندر آیا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ ''کیوں ماسٹر صاحب اندھیرے میں کیوں بیٹھے ہو۔''

منصور نے کل کی بچی ہوئی موم بتی جلائی اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ رمضانی کو دیکھنے لگا۔ اس کی وحشت زدہ سہمی ہوئی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ''کیابات ہے رمضانی۔ کوئی نئی بات؟''

''بہت بڑی بات ہے ماسٹر صاحب۔ دیکھتے دیکھتے پل بھر میں سب کچھ کیا سے کیا ہو گیا۔''

''کیا ہوا بتاتے کیوں نہیں؟''

''سب لوگ اس کوٹھی سے اٹھ رہے ہیں۔ کہتے ہیں یہ کوٹھی بک گئی ہے۔''

''اچھا!'' اس نے بغیر کسی حیرانی کے کہا

''سب نوکروں کی چھٹی ہو گئی۔ میز، کرسی، برتن اور گملے وغیرہ بھی یہاں سے ڈھل گئے۔''

''بس؟''

رمضانی نے دو تین مرتبہ غور سے منصور کو دیکھا جو تولیہ سے اپنا سر پونچھ رہا تھا۔ اس کے دانت بج رہے تھے۔ اور آنکھیں کافی بڑی بڑی نکل آئی تھیں۔

رمضانی چائے لانے کے لیے جاتے جاتے غم زدہ آواز میں بولا۔

''ماسٹر صاحب جاڑا غضب کا ہے۔ آپ لحاف اوڑھ کر فوراً سو جائے۔ میں آپ کے لیے گرم چائے لے آؤں گا۔ کون جانے کل مجھے بھی چھٹی مل جائے۔'' وہ چلا گیا۔

منصور نے کمرے میں کپڑے تلاش کئے۔ لیکن اس کے پاس ایک جوڑا بھی دھلا ہوا نہ نکلا۔ اس نے چارپائی کے نیچے سے اپنا پاجامہ اور ایک پرانی قمیض نکالی جسے پچھلے ہفتے سے برابر وہ سوتے وقت پہن لیتا تھا۔ اس نے جلدی جلدی قمیض گردن میں ڈالی، اور اپنا خاندانی شال اوڑھ کر پچھلے زینے سے اوپر چڑھ گیا۔

اس نے دستک دی۔ بارش کی سنسناہٹ میں دستک کی آواز اولوں کی پٹر پٹر میں تبدیل ہو گئی۔

''آجایئے ماسٹر صاحب۔''

نجمی اسی ڈریسنگ گاؤن میں کھڑی تھی۔ اس کے بال کچھ اور الجھ گئے تھے۔ آنکھوں سے کاجل بالکل دھل گیا تھا۔ ہونٹ لپ اسٹک کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ اس وقت اپنی سادگی کی وجہ سے زرد اور بہت نازک لگ رہے تھے۔ وہ کتابوں، بوتلوں، جوتوں، کپڑوں، تصویروں اور دو تین مجسموں کے درمیان کھڑی تھی۔ اس نے منصور کو دیکھے بغیر کہا۔

''یہاں بیٹھ جایئے۔''

اس نے سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی ''سگریٹ پیجئے'' اس کی حرکتیں جتنی مشینی، تیز اور چست تھیں، اس کی آواز اتنی ہی تھکن اور بے اعتمادی سے بھری ہوئی تھی۔

''کہیے اس تماشے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔''

''کس تماشے کے متعلق؟'' پتہ نہیں کیوں منصور کو محسوس ہوا کہ کوئی اس کا گلا دبا رہا ہے۔

''یہی!''

''یہی...... لیکن میں سمجھا نہیں کچھ۔''

''سب کچھ تو جانتے ہیں آپ۔'' وہ بڑے اطمینان سے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''خیر چھوڑیئے...... کل سے یہ کوٹھی ہماری نہیں ہو گی۔ یوں تو اس وقت بھی یہ ہماری نہیں ہے۔ کسی اور کی ہو چکی ہے۔ یہاں سے بہت دور پرانے شہر میں ایک

بہت گندہ مکان ہے اپنا۔ کل سے ہم وہاں ہوں گے۔ کتنی رونق ہو جائے گی۔" وہ مسکرانے کے لیے رکی۔ اس نے اپنی انگوٹھی کو دو تین بار انگلی میں گھمایا جس کے سرخ پتھر سے شعاع نکل رہی تھی۔ اس وقت منصور نے دیکھا کہ وہ بے خیالی میں اپنے ناخن پر جمی ہوئی نیل پالش کو کھرچ رہی ہے۔ تیز تیز جیسے گنجا کتا اپنے سر کو نوچتا ہے۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

منصور نے صرف اپنا سر اٹھا دیا۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ "کہیے" نجمی نے اس کو اتنے غور سے دیکھا کہ اس کے پورے جسم پر برف کی طرح سرد لہر سی دوڑتی چلی گئی۔ وہ لرز اٹھا۔ حالانکہ یہ ٹھنڈک اس کے نم بنیان کی تھی۔ جو وہ بدل نہیں سکا تھا۔ اور اس وقت اس کے سینے میں درد کی کسک جاگنے لگی تھی۔

"آپ ٹھیک ٹھیک بتائیے مجھے آپ کیا سمجھتے ہیں۔" نجمی نے ڈھیرے سے ایک بڑا فریم اٹھا لیا۔ یہ مریم کی تصویر تھی۔ مقدس پاک اور ممتا سے سرشار!

منصور تصویر کا پچھلا حصہ دیکھتا رہا اور چپ سادھے سوال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"آپ کی کیا رائے ہے میرے متعلق؟" اس نے اسی طرح تصویر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔ اس کی آواز میں زیادہ کپکپاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

"میں سمجھا نہیں آپ کا مطلب۔"

نجمی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں چھوٹی ہوگئیں اور ہونٹ کانپنے لگے۔ "آپ نہیں سمجھے میرا مطلب...... میں جانتی ہوں۔ آپ مجھے ایک بے ہودہ اور فضول لڑکی سمجھتے ہیں۔"

منصور نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اب کے پھر کسی طاقت نے بڑھ کر اس کا گلا دبا دیا۔

اس نے ایک دوسری سگریٹ سلگائی۔

"میں آپ کی ہم خیال ہوں۔ میں وہی ہوں جو آپ سمجھتے ہیں۔"

"میں آپ کو بے ہودہ اور فضول لڑکی نہیں سمجھتا۔" منصور نے کہا اور خود اسے لگا یہ آواز بہت دور سے آ رہی ہے۔

اجنبی سی دبی دبی آواز جیسے کوئی چٹانوں کے نیچے دبے ہوئے کنویں کے اندر بول رہا ہو۔

"میں اپنے جاننے والوں میں صرف آپ کو ایک طاقتور اور ایماندار آدمی سمجھتی تھی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"نجمی صاحبہ میں طاقتور اور ایماندار آدمی ہوں یا نہیں۔ لیکن آپ ایک کمزور اور بے وقوف لڑکی ضرور ہیں۔" .... یہ آواز اس کے ہونٹوں تک نہ آسکی۔

کیا میں اس مرتی ہوئی گھٹتی ہوئی لڑکی پر حملہ کر دوں؟ میں ہمیشہ اس لڑکی سے بیزار رہا ہوں اور اس وقت اس پر کتنا رحم آرہا ہے۔ نجمی اس کے سامنے آکر رک گئی۔

"اچھا بتایئے میرے ملنے جلنے والوں سے آپ کو نفرت کیوں ہے؟"

"نجمی صاحبہ آپ کی طبیعت کافی خراب ہے۔ ان سوالوں سے کیا فائدہ؟"

"آپ جانتے ہیں اس کوٹھی کے ساتھ میرے ان دوستوں کی زنجیر بھی ٹوٹ جائے گی۔"

"کتنی جذباتی ہے یہ لڑکی!" منصور نے پہلی بار مسکرا کر سوچا اور اٹھتے ہوئے بولا: "آپ کے وہ دوست اب بھی آپ کے اس گھر میں آئیں گے اور کوئی آئے نہ آئے پروفیسر قدوس اور نجیب الطرفین ضرور آئیں گے۔ دونوں کو آپ کی ضرورت ہے۔"

"بکواس۔"

منصور نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ "تو میں اب جاؤں؟"

"منصور صاحب کیا آپ ہمارا ساتھ چھوڑ دیں گے؟"

"آپ کا مطلب؟"

"انسان اپنی پرانی دنیا سے بڑی محبت کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ میں چھوٹی سی تھی۔ یہیں اسی کمرے میں ایک کھلونے کے پیچھے بھاگتی بھاگتی ٹھوکر کھا کر گر پڑی تھی۔ بابا نے دوڑ کر مجھے اپنی گود میں اٹھا لیا تھا۔ اور اتنا پیار کیا تھا...... اتنا پیار کیا تھا......"

پھر وہ چپ ہو گئی۔

"تو میں جاؤں؟"

"آپ ہمارے ساتھ چلیں گے نا؟" نجمی کی آواز میں لغزش تھی۔

وہ مسکرایا۔ نجمی کے بال اس کے شانوں پر جھک آئے تھے۔ اور اس کی آنکھیں منصور پر جمی ہوئی تھیں۔ اور وہ نیل پالش کا رنگ اپنے ناخن سے کھرچ جارہی تھی۔ اس نے ایک بار نجمی اور کمرے کا جائزہ لیا۔ اور خاموشی سے اپنا شال سمیٹتا ہوا پچھلے زینے سے نیچے اتر آیا۔

موم بتی کی لو شرابی کی طرح جھوم رہی تھی۔

اس نے اپنے بکھرے ہوئے کاغذات اکٹھے کئے اور ان کو ٹن کے بکس میں رکھنا شروع کیا۔ نجمی......واقعی رات کے اندھیرے میں پوری زندگی کاٹنے کے بعد اجالے سے کتنا ڈر لگتا ہے۔ اس نے اپنی دوا کی شیشی اٹھائی اور کونے میں پھینک دی۔

صبح سات بجے گاڑی چل دیتی ہے۔ اماں کی آنکھوں میں کتنی چمک پیدا ہو جائے گی...... اگر انہیں فالج نہ ہوتا تو پتہ نہیں وہ کس طرح مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتیں......اُف کتنی ٹھنڈ ہے......"

موم بتی بجھ گئی اور وہ اپنے لحاف میں گھس گیا۔ نجمی کا سایہ کھڑکی کے شیشے پر ابھرتا تھا۔ اور غائب ہو جاتا تھا...... بے وقوف لڑکی، تنکے نے آج تک کنارے تک پہنچایا ہے کسی کو۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور کھانسی تیز ہو گئی۔ باہر بارش اور اولوں کا شور بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہزاروں دروازوں کی زنجیریں ایک ساتھ بج رہی ہوں۔ ○○

لابوہیم

۱۴

فرانسیسی کونیاک ہو یا شمپین، حسینہ ہو یا زبان، دریائے سین پر کھیلتی ہوئی ہوائیں ہوں یا درختوں پر جھکے ہوئے بادل، ہر چیز میں ایک جادو ہے، مانا۔ ایسا ہوتا تو میرا نام لابوہیم کاہے کو پڑتا، یہی دیکھئے نا کہ میری کونسی ادالابوہیم والی ہے، لیکن ہوں میں لابوہیم۔ پلا، بڑھا یہیں کے سرد و گرم اور غبار میں، مگر نام اکسپورٹ ہوا سات سمندر پار سے، اب تو خیر سے برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن ہے، اور جوانی کی راتیں ہیں، جوانی کے دن! لیکن جب میں پیدا نہیں ہوا تھا تو صرف کھنڈر تھا...... کچھ ٹوٹی ہوئی دیواریں، اونٹ کے کوہان جیسے بھورے سرمئی ملبے کے ڈھیر اور بس، اس کھنڈر کا ناتا میرے پچھلے جنم سے ہے۔ کوئی مجھ سے عمر پوچھے تو میں یہی کہوں گا ناکہ بس ہندوستان کی تقسیم کے بعد کی پیداوار ہوں، یعنی نئی نسل ہوں۔ لیکن مجھ میں نہ غصہ ہے نہ نفرت ہے نہ بیزاری، نہ میرے بال اور ناخن بڑھے ہوئے ہیں اور نہ دیکھنے میں لڑکی یا عورت نظر آتا ہوں۔ کوئی یہ نہیں دیکھے گا کہ اس چمکتی دمکتی عمر سے ادھر بھی میں زندہ تھا۔ کھنڈر ہی سہی، مگر تھا۔ انسان کی طرح میری عمر بھی کوئی دس بیس پچاس سال تو ہو نہیں سکتی۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جس طرح انسان کی عمر دس بیس پچاس سال نہیں ہو سکتی، اسی طرح میری عمر کا اندازہ صرف صدیوں میں لگایا جاسکتا ہے۔ ایک عمر میں کئی کئی عمریں ہوتی ہیں اور ایک زندگی میں کئی کئی زندگیاں۔

جی چاہتا ہے کوئی سنے اور میں سناؤں اپنی داستان، اپنے وجود کی تاریخ!۔

جب میں کھنڈر تھا، درختوں میں گھرا ہوا، ویران، اداس اور خوف زدہ تو میرے مٹے ہوئے در و دیوار پر دوب اگ رہی تھی، جسے بکریاں چر جایا کرتی تھیں۔ دن کو میرے پاس کوئی پھٹکتا تک نہ تھا۔ البتہ رات کو میری قسمت جاگتی تھی۔ جب ستارے جاگتے تو، چور اچکے میرے دل کے اندھیرے میں بیٹھ کر سبز باغ دیکھتے اور دکھاتے تھے ...... کبھی کبھی زمانے کا ستایا ہوا کوئی عاشق تانگے پر اپنی معشوقہ کو لے کر آ جایا کرتا تھا اور میری پناہ میں زمانے کے ظلم و ستم کی ساری کسر اس جان جہاں سے نکالا کرتا تھا، جسے وہ بھینچتا بھی تھا اور گالیاں بھی دیتا تھا۔

کوئی سنے تو میں سناؤں......

اس بھیانک رات کی بات...... بڑے کالے بادل گھر آئے تھے اور یہاں، جہاں اب شہر کا سب سے ماڈرن ریستوران ہے، ایک عورت کا خون ہوا تھا۔ عورت ایک تھی اور مرد تین، سب نے دارو پی، کوئی کڑوی چیز تھی...... آگ جیسی جلتی ہوئی، ایک تیزابی دھواں سا اٹھتا تھا اور دماغ میں بھر جاتا تھا۔ عورت نے نہیں پی، وہ مٹھائی کھاتی رہی اور اندھیرے میں منہ بناتی رہی اور شوخی بھی دکھاتی رہی، چوڑیاں چھنکتی رہیں...... تھوڑی دیر میں فضا بدلنے لگی۔ تینوں عورت کو اپنی اپنی طرف کھینچنے لگے۔ تھوڑی دیر تو یہ کھینچا تانی رہی پھر تینوں آپس میں گتھ گئے۔ عورت بھاگی تینوں اپنی لڑائی بھول گئے اور عورت پر جھپٹے، جیسے باز گوریا پر جھپٹتا ہے، چھرے نکل آئے اور اس عورت کی تکا بوٹی ہو گئی، جسم کے ٹکڑے ہو گئے۔ (روح کا حال تو اوپر والا ہی جانتا ہے) عورت کی ہڈیاں یہیں دفن ہیں، جو مٹھائی کھا رہی تھی اور اندھیرے میں دارو پیتے ہوئے مردوں کی بھاری بھاری سانس کی آواز سن رہی تھی۔

ہاں بالکل یہیں جہاں چھوٹی سی میز کے نیچے سرخ قالین پر خوبصورت سردارنی کے سینڈل کی نوک کیل کی طرح ہل رہی ہے، اگر کوئی دو تین فٹ فرش کھودے تو وہ ہڈیاں مل جائیں گی۔ ننگی میلی ہڈیاں...... اور اب مجھے لگتا ہے وہی ہڈیاں زمین سے اگ آئی ہیں اور اس کرسی پر بیٹھ گئی ہیں جہاں سردار تیجا سنگھ، سمینٹ اور اینٹ کا ٹھیکیدار،

چار کورس کا کھانا کھا کر جماہیاں لے رہا ہے اور کمر پر بلٹ ڈھیلی کر رہا ہے۔ ہڈیوں پر گوشت چڑھ گیا ہے۔ ضرورت سے زیادہ گوشت دار جلد پر سنہرا رنگ پھیل گیا ہے......
ضرورت سے زیادہ سنہرا! آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں، ضرورت سے زیادہ سوجی ہوئی ٹھوڑی ڈبل ہو گئی ہے۔ موٹی موٹی بانہوں پر روئیں اگ آئے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ روئیں، ایک کلائی میں گھڑی چمک رہی ہے۔ فیروزی رنگ کا نائیلونی آنچل بار بار ڈھلک رہا ہے اور تنگ بلاوز ابلتے ہوئے سینوں کو یوں دبا رہا ہے کہ ہر شخص کی نظر اس کی موٹی تہہ دار کمر پر پڑ رہی ہے۔ سردارنی کے سینوں میں غضب کا تلاطم ہے، لیکن باقی جسم سرد ہے، رفری جریٹر میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح سرد۔ وہ چار کورس کھا کر بھی بھوکی ہے یہ بھوک اس کے پیٹ سے شروع ہوتی ہے اور ناف سے بھی۔ وہ چاروں طرف دیکھ رہی ہے اور ہونٹ چاٹ رہی ہے۔ ہونٹوں کی سرخی اتنی گہری ہے کہ اس کی لالچی پیاسی زبان بھی چاٹ چاٹ کر اسے پھیکا نہیں کر سکتی۔

چھت کتنی نیچی ہے، کالی پرچھائیاں جانور کی طرح لرز رہی ہیں۔ دیواروں پر رنگ دھبوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں، دھوپ چھاؤں کی طرح۔ ایسا ہے کہ عکس روشنی میں جذب ہو گیا ہے اور روشنی عکس میں، ہر چند میزوں کے بعد دیواریں شطرنج کے مہروں کی طرح کھڑی ہو گئی ہیں۔ روشنی اور پرچھائیوں سے ایسا جھٹپٹا ہو رہا ہے کہ میز اور کرسیاں جاگ رہی ہیں اور عورتیں، مرد لڑکے لڑکیاں سو رہے ہیں۔

نجو گنبا کنارے والی میز پر کونے میں بیٹھی ہے۔ سفید دوپٹہ گردن میں ہے کرتا گھٹنوں پر کسا ہوا ہے۔ شلوار خوبصورت ٹانگوں سے چپکی ہوئی ہے، اس کی سفید چپلیں اس کے پیروں کو چھوڑ چکی ہیں اور ایر کنڈیشنڈ ریستوران کے خنک نرم قالین پر رینگ رہی ہیں، ہوا اس کی تھکی ہوئی انگلیوں کو سہلا رہی ہے، اس کے پورے جسم میں گدگدی ہو رہی ہے۔ رنجیت اپنے بھورے کوٹ کے بٹن بند کرتا ہے اور کھولتا ہے، کھولتا ہے اور بند کرتا ہے اور کھولتا ہے، کھولتا ہے اور بند کرتا ہے اس کی جیب میں چار مینار سگریٹ کے دو پیکٹ ہیں لیکن میز پر گولڈ فلیک کا پیکٹ ہے۔ وہ پوری شام

تھر تھراتی ہوئی انگلیوں سے سگریٹ پر سگریٹ سلگا تا رہا ہے۔ وہ سوکھی ہوئی زبان اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پھیرتا ہے اور روہانسی آواز میں کہتا ہے۔

کبھی کبھی میرا جی تڑپ اٹھتا ہے۔

"I so madly want to kiss you!"

"Do you? What a crazy idea?"

"May be!"

یہ فضول ہے، ہر چیز فضول ہے Crazy!

پاس کی میز سے ایک ٹھیکیدار کی فلسفیانہ آواز آتی ہے۔

"How unfortunate!"

"تم نہیں سمجھیں...... میرا مطلب ہے...... میرے اندر جو ایک مرد ہے اور تمہارے اندر جو ایک عورت ہے۔" اس کی زبان سوکھنے لگتی ہے اور اس سے کچھ کہا نہیں جاتا۔

"میں سمجھ گئی" سنجوگتا نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا لیتی ہے۔ خنکی اس کے ننگے پیروں کو گدگدا رہی ہے، ہو گا بیوقوف!

"تسی کتھے جاندے او۔" دوسرے کونے سے آواز آتی ہے سردار جی اور سردارنی بل ادا کر چکے ہیں، خلال کر چکے ہیں، نیپ کین میز پر رکھ چکے ہیں۔ فنگر بال میں نیبو کا ٹکڑا تیر رہا ہے۔ انہیں اب جانا ہے، انہیں کسی کا انتظار نہیں ہے مگر بیٹھے ہیں اور نیم وا آنکھوں سے پورے لابوہیم کا، یعنی میرا، جائزہ لے رہے ہیں۔

لابوہیم کی چھت سے موسیقی کی پھواریں برس رہی ہیں۔ مشہور پینٹر رائے سب سے تاریک گوشے میں بیٹھ گیا ہے جہاں ہری بیل بہت سے پتوں کا بوجھ سنبھالے ہوئے چھت کی طرف بڑھ رہی ہے۔ "بڑا ابدمذاق شہر ہے یہ، بیہودہ، گنوار، بس ایک چھوٹا سا کونا ہے جہاں...... اگر میری پینٹنگ مہارانی نے خرید لی اور اگر نیویارک......"

میں یہ سب دیکھتا ہوں، محسوس کرتا ہوں، میں ان سب کے ساتھ جیتا اور مرتا

ہوں۔ دن میں سو سو بار...... یہ آتے ہیں، کچھ کھاتے ہیں، کچھ پیتے ہیں، چلے جاتے ہیں۔ مجھے بھول جاتے ہیں، لیکن میری روح آنکھوں کی روشنی کی طرح ان کے ساتھ جاتی ہے۔

اتم سنگھ جو میرا مالک ہے، بڑا روشن خیال آدمی ہے۔ وہ کہتا ہے ایسے ریستوران صرف پیرس میں ہوتے ہیں...... میں بھی یہی کہتا ہوں...... اور یہ لوگ بھی جو شاندار کپڑوں میں، بڑی بڑی خوبصورت کاروں میں آتے ہیں...... نوجوان لڑکے لڑکیاں جو ایک دوسرے سے چپکے ہوئے اسکوٹروں میں آتے ہیں، جن کے کپڑوں سے بڑی طرح داری، اور چلنے اور بولنے کے انداز سے بڑی بے نیازی ٹپکتی ہے...... سب یہی کہتے ہیں۔

"ہائے ABSTRACT PATTERN جو سب کچھ ہونے پر بھی کچھ نہیں، جو کچھ نہیں ہے، پھر بھی سب کچھ ہے۔ لڑکیاں خالی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی ہیں اور ان کی آنکھیں بھی بھیگ جاتی ہیں۔

میرے ناک نقشے میں وہ بات نہیں، جو عام ریستورانوں میں ہوتی ہے، میرا انداز بڑا تیکھا ہے۔ سب سے الگ، روشنی ہے تو ایسی کہ پرچھائیاں معلوم ہوں! میزیں، دیواریں، لکیریں، پردے، جھالر ہر چیز کا اپنا الگ ہی انداز ہے۔ ہر چیز آڑی ترچھی ہے۔ اب اس میز کو دیکھو کونے میں، جہاں اس چھوٹی سی دیوار کا سایہ پڑ رہا ہے جس پر پلاسٹر نہیں کیا گیا ہے۔ دیوار پر ایک سیاہ تختہ ہے، جس پر سرخ، ہرے اور پیلے رنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے ہیں اور بیچ بیچ میں سیپیاں اور درخت کی چھال کے ٹکڑے لگے ہوئے ہیں۔ میزوں کو الگ کرنے والی سیاہ اور سرخ دیواروں میں روزن بنے ہوئے ہیں، جن سے روشنی نہیں گزرتی لیکن نگاہیں گزرتی ہیں اور پراسرار پرچھائیوں کو دیکھتی ہیں جو ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں لیکن جو ایک دوسرے کی تلاش میں ہیں۔ ایک دوسرے میں جذب ہو جانے کو بیقرار۔

روزنوں کے دونوں طرف دھندلکوں میں کیسے کیسے ہونٹ ہل رہے ہیں، کیسی

کیسی آنکھیں کھل رہی ہیں اور خوابوں کے بوجھ سے بند ہوتی جارہی ہیں...... کیسی کیسی باہیں ہیں، ٹھنڈی، دبلی، بھری بھری اور گندمی باہیں روشنی کی طرح تیرتی ہوئی، مڑتی ہوئی باہیں اور گردنیں، جھکی ہوئی بھی...... بکھری ہوئی بھی، گھٹاؤں کی طرح اٹڈی ہوئی بھی، جو ذرا ذرا سی جنبش پر رات کی طرح پھیل جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں، نہ جانے نگاہوں اور دلوں کے کن کن اجالوں پر چھا جاتی ہیں۔

کونے میں باتھ روم کے پاس، جہاں ہری بھری بیلیں لٹک رہی ہیں جہاں سرخ میز کو تین طرف سے چھوٹی چھوٹی دیواروں نے آن گھیرا ہے جہاں دھندلکے کو اندھیرے نے دبادیا ہے، ذرا ادھر بھی دیکھو...... یہ ہونٹ ہیں ہونٹ، ان کا رنگ یاقوتی ہے، لیکن کالے لگ رہے ہیں۔

"نہیں ڈارلنگ نہیں، ایسا نہیں ہے، تم بڑے ریشنل آدمی ہو، سمجھو۔ اب میں اس زندگی سے تھک گئی ہوں۔ آگ بجھ رہی ہے۔ آگ بجھنا ہی ہے تو بھرے بازار میں کیوں بجھے...... کسی جنگل میں...... کسی غار میں، کسی......"

ہونٹ ہل رہے ہیں، لگتا ہے دو باریک پتھر ٹکرا رہے ہیں اور چنگاریاں بکھر رہی ہیں۔ "میں اکیلا کیا کروں گا...... دس سال کا ساتھ کم نہیں ہوتا۔ میری جان...... دس سال میں تو انسان......"

ہونٹ مسکراتے ہیں۔ لپ اسٹک سے بھیگے ہوئے اداس ہونٹ

تم SENTIMENTAL بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ٹہنی چیخ گئی ہے، پتے جھڑ چکے ہیں۔

"پتے...... پتے...... تاش کے پتے۔"

"ڈارلنگ وعدہ کرو۔ تم مجھے بھول جاؤ گے، تم اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ خوش رہو گے۔ ڈارلنگ اب تم اڑتالیس کے ہو گئے۔ شام کو پنچھی گھونسلے میں لوٹ جاتے ہیں۔"

اب تم سنٹی منٹل ہو رہی ہو۔ دراصل تم اس جٹادھاری ٹھیکیدار کا گھر بسانا چاہتی

ہو، جو عورت اور سنترے میں کوئی فرق نہیں سمجھتا...... جو سمجھتا ہے کہ......"

"لیکن وہ اچھا آدمی ہے ڈارلنگ......اس نے اڑتالیس سال زندگی کے تنہائی میں گزار دیئے۔ اس کے نہ کوئی بیوی ہے اور نہ بچے۔"

"لیکن اس کے پاس سرکاری ٹھیکے کتنے ہیں......؟ جانتی ہو اس کا بینک بیلنس؟"

"ڈارلنگ وہ بڑا بد قسمت انسان ہے۔"

"لیکن میں اس سے زیادہ بد قسمت ہوں۔"

ہونٹ مسکرا رہے ہیں، ہونٹ لرز رہے ہیں...... گہرے دھندلکے میں ہونٹوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

"تم بڑے سویٹ ہو۔"

"سویٹ...... سویٹ...... بتاؤ پڈنگ کھاؤ گی یا کسٹرڈ؟"

"پڈنگ...... اور تم؟"

"میں بھی...... ویٹر!"

چٹکیاں بجتی ہیں، ٹھنڈے ہونٹ...... ٹھنڈے ہونٹوں کو چھو کر لرز جاتے ہیں۔ مرد اور عورت، دونوں کے جسموں میں جھرجھری دوڑ جاتی ہے۔

ہری بیلوں سے آگے، اینٹوں کی سرخ دیوار کے پاس، جہاں سائے اتنے گہرے ہو گئے ہیں کہ آدمی کی صورت پہچانی نہیں جاتی، سرخ دروازہ کھلتا ہے جس کے بیچوں بیچ زرد الو کی گول آنکھیں دھندلکے میں کبھی پھیلتی اور کبھی بند ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مغربی ایٹی کیٹ کا پتلہ، سیاہ سوٹ میں ملبوس کھڑا اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پنسل دوڑا رہا ہے۔ وہ دروازے میں داخل ہونے والے ہر شخص کو جھک کر "ویل کم" کرتا ہے اور مختلف کونوں میں میزوں کی طرف بڑھنے کا اشارہ کرتا ہے، ہیولے داخل ہوتے ہیں اور مختلف کونوں میں بکھر جاتے ہیں۔ موسیقی کی طرح، دھندلکے کی طرح۔

دروازہ کھلتا ہے، زرد الو کی آنکھ پھیل جاتی ہے۔ دھوپ کی شفاف سیل دروازے میں چمکتی ہے، میری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ دھوپ کی

شفاف سیل کو چیر کر ایک بڑا سا ہیولا میرے دل میں داخل ہوتا ہے اور اس کے پیچھے چند اور ہیولے داخل ہوتے ہیں۔ مغربی ایٹی کیٹ کا پتلہ اس گروہ کو اس کونے کی طرف لے جاتا ہے جہاں ایک سیاہ تختی پر موٹی موٹی سرخ لکیروں اور ٹوٹے زاویوں سے ایک عورت کے نقوش ابھارے گئے ہیں۔ ان نقوش کے بارے میں اکثر رائیں ٹکراتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ عورت نہیں ہے، بکری ہے۔ کوئی کہتا ہے، یہ نہ عورت ہے اور نہ بکری...... یہ تو اسٹل لائف ہے اس کے بغل کے بال دیکھو، ناف کے نیچے دیکھو...... یہ کیا ہے عقل کے اندھے کیا بلیرڈ ٹیبل ایسی ہوتی ہے؟

یہ شخص جو ابھی، اپنے قافلے کے ساتھ آکر بیٹھا ہے، بڑا انٹر نیشنل آدمی ہے، ایر انڈیا انٹر نیشنل کے مہاراجہ کی طرح، مونچھیں نہیں ہیں تو کیا ہوا، بڑا نام ہے اس کا، بڑا لیکھک ہے۔ اس کا سگار دیکھو اس کی عینک دیکھو، اس کا سر دیکھو۔ شیشم جیسا جسم دیکھو، اس کی ذہین آنکھیں دیکھو، اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی محبت اور حلم دیکھو۔ بڑی دراز قد گدے دار شخصیت ہے۔ یہاں بہت سے آتے ہیں۔ میں جانتا ہوں وہ کتنے پانی میں ہیں لیکن اس کی تھاہ تو میں بھی نہیں پاسکا۔ اپنے دشمن کو بھی گلاب کی کلی کی طرح شاخ سے توڑ کر اپنے کالر کے کاج میں سجا لیتا ہے۔ بہت ہی گہرا آدمی ہے۔ بہت ہی گہرا۔ اپنے بانکے اور دبلے جسم کے ساتھ لندن اور پیرس کے ڈانس فلور پر ناچ چکا ہے۔ بڑا تجربہ کار آدمی ہے۔

گہرا آدمی میز کی دوسری طرف بیٹھے ہوئے دوسرے گہرے آدمی سے کہتا ہے۔ ”نمائش بڑی کامیاب رہی، میں پچھلے سال نمائش کے موسم میں پیرس میں تھا، اتنی اچھی نمائش تو میں نے وہاں بھی نہیں دیکھی۔“

دوسرا گہرا آدمی پہلے گہرے آدمی کی طرح گہرائی جانتا ہے۔ وہ اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے، پھر اپنے پائپ کا پورا کش اپنے سینے میں اتار لیتا ہے، جیسے اس کے پائپ میں بہترین ولایتی تمباکو نہیں بلکہ سامنے بیٹھے ہوئے مسکراتے ہوئے پر سکون انسان کا دماغ بھرا ہوا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ منہ سے دھواں اگلتا......

"ایک کنیوس بھی اور یجنل نہیں تھا!" دوسرا گہرا آدمی طنزیہ کہتا ہے۔
"TRY TO UNDERSTAND" وہ پھر لڑکی کے شانے پر ہاتھ پھیرتا ہے اور اس کی کافی کے گلاس میں آئیس کریم پگھلتے ہوئے دیکھتا ہے۔

پہلا گہرا آدمی اسی طرح مسکراتا ہے۔ اس کے ذہن میں اب تک پریس کلب کی باتیں گونج رہی ہیں، آنکھوں میں بیئر کی بوتلیں تیر رہی ہیں...... "امریکی سالے وہاں سے پٹ کر نکلیں گے۔"

"چینی بڑے بہادر ہیں تو تائیوان پر قبضہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

"میں ہی نہیں ساری دنیا اس کولڈ وار سے اکتا کر خودکشی کر لے گی۔"

"AND THEN YOU WILL SEE!"

"THERE WILL BE NOTHING TO SEE!"

"نہیں نہیں سب یونہی چلتا رہے گا۔ بم بھی گرتے رہیں گے اور امن اور دوستی کی باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔"

گہرے آدمی کی نگاہیں، لڑکی کے دھندلے نقوش کو چوم رہی ہیں، اس کے دانت سگار کو دبائے ہوئے ہیں اور اس کی آواز سگار سے پھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

"میں کہتا ہوں رجنی کا فن اور یجنل ہے۔ اس کی نمائش ہونی چاہیے۔"

دوسرا گہرا آدمی لڑکی کے شانوں پر ہاتھ پھیرتا ہے اور میز کے نیچے اس کے پیر لڑکی کے پیروں کو تلاش کرتے ہیں اور پہلے گہرے آدمی کے بڑے بڑے جوتوں سے ٹکرا جاتے ہیں، گہرا آدمی مسکراتا ہے۔ "فن میں اور یجنلٹی کیا ہوتی ہے بھائی...... اور اگر اس ترازو میں تمہارے ناول کو تولا جائے تو۔"

"یہ بڑا بھونڈا اکسپریشن ہے۔ ناول کو ترازو میں تولنا۔"

"ہاہاہا۔"

لڑکی کی آنکھیں اٹھتی ہیں۔

پہلے گہرے آدمی کی نگاہیں بھنوروں کی ڈھونڈتی رہ جاتی ہیں۔

"تم ہمیشہ ایٹرنل ویلوزاور اور یجنلٹی کی باتیں کرتے ہو لیکن......"

"میں تمہاری طرح مارکس وادی نہیں ہوں۔ میں کنول کا پھول ہوں جو پانی میں رہ کر بھی پانی کے اوپر رہتا ہے۔"

لڑکی مسکراتی ہے، آئس کریم کھاتی ہے اور اس نوجوان کی طرف دیکھتی ہے جسے اپنے ڈیلی پیپر میں نائٹ ڈیوٹی کے لیے بھاگنا ہے۔ لیکن وہ لڑکی کو ان دو گھبرے آدمیوں کے پاس چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹ کھلتے ہیں۔

"رجنی میں تمہیں گھر چھوڑتا ہوا پریس چلا جاؤں گا۔"

"تم جاؤ...... ہم ابھی رجنی سے "ون مین شو" کے بارے میں باتیں کریں گے۔"

دوسرا گھبرا آدمی پائپ چوستے ہوئے سوچتا ہے:

"اگلے ناول میں رجنی کا بوہمین کیرکٹر ابھاروں گا۔ عورتیں تو میں نے بہت دیکھی ہیں...... مگر یہ عورت، یہ عورت،...... یہ عورت......"

وہ اس کے شانے پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ بوہمین لڑکی اس کے پائپ کو نفرت سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے:

"مسٹر سنتوش آپ کا ہاتھ بہت بھاری ہے۔"

"یہی بات تمہارے پیروں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔" گھبرا آدمی ہنستا ہے۔

دنیا کے تمام بڑے بڑے آرٹسٹ صحت کے معاملے میں۔ یہ تو صرف بھوکے ہندوستان میں "YOU HAVE SENSE OF HUMOUR, REALLY!"

وہ اپنے بھاری ہاتھ سے لڑکی کے شانے کو سہلاتا ہے۔ پہلا گھبرا آدمی جس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے جماہی لیتا ہے اور دوسرے گھبرے آدمی کی انگلیوں کو دیکھتا ہے جو بوہمین لڑکی کے سانولے شانے پر تیر رہی ہیں۔

"میں کہتا ہوں ہندوستانی میوزک کبھی آرکسٹرا کی سطح پر...... نہیں نہیں میں چلتی ہوئی دھنوں کی بات نہیں کر رہا ہوں...... پیانو ہندوستانی موسیقی کا ساتھ نہیں

دے سکتا۔ لیکن پیانو پر دوڑتی ہوئی انگلیاں...... "شانے پر دوڑتی ہوئی انگلیاں رک جاتی ہیں۔ میز کے نیچے ناول نگار کے پیر اپنے اگلے ناول کا پلاٹ تلاش کرتے رہتے ہیں اور پہلا گہرا آدمی اپنے سگار سمیت مسکراتا ہے۔ اچانک اس کا چہرہ پراسرار ہو جاتا ہے جیسے پادری کا چہرہ جو منبر پر کھڑا ہو......

"کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں بہت بڑا فراڈ ہوں۔"

لڑکی کی آنکھیں اس کی طرف اٹھتی ہیں۔ نشے میں آدمی کتنا سچا ہو جاتا ہے......

"رتن بھائی" لڑکی کی آنکھیں کھلتی ہیں، بھنورے اڑ جاتے ہیں۔

"ہاں میں سچ کہتا ہوں، پچھلے تیس سال میں کیا لکھا ہے میں نے؟ لندن اور پیرس کی گپ ہانکنے کے سوا...... میں بڑا فراڈ ہوں......"

تم شراب پی کر آئیں بائیں شائیں بکنے لگتے ہو۔ تم نے نئے ہندوستان کے نئے کلچر کو ایک ڈائریکشن دیا ہے۔ میرا مطلب ہے...... سمت...... افق......"

"Rot! I am a fraud!"

"رجنی، میں تو رتن بھائی کے اسی بھولے پن پر جان دیتا ہوں۔"

"میں بھی۔" بوہمین لڑکی کہتی ہے، جسکے بال کانوں اور پیشانی پر جھک آئے ہیں۔

"I like this good old guy!"

ایک کونے میں تین چار مغربی ڈپلومیٹ دو تین سرکاری افسروں اور ٹھیکیداروں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ ایک امریکی عورت جو کسی پریس ایجنسی کی نمائندہ ہے، اپنے پرس سے ہاتھی دانت کا سگریٹ ہولڈر نکالتی ہے اور سگریٹ سلگاتی ہے۔

فرانسیسی ڈپلومیٹ عجیب و غریب لہجے میں انگریزی بولتا ہے اور سگریٹ ہولڈر کی تعریف کرتا ہے۔ پھر اپنا سگریٹ کیس نکالتا ہے جو اسے کسی "مہارانی" نے دیا ہے۔ ڈپلومیٹ کے دانت سگریٹ نوشی کی وجہ سے پیلے پڑ گئے ہیں۔ اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ لیکن آنکھوں کے گرد جھریاں پڑ گئی ہیں۔ جن سے چھن کر مسکراہٹ کی چمک آنکھوں میں تیرتی ہے۔ وہ امریکی جرنلسٹ کا ہاتھ دباتا ہے اور مسکراتا ہے۔

”زندگی کے تجربے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔“ وہ کہتا ہے اور عورت کی چالاک آنکھوں میں جھانکتا ہے جن کی پلکوں کو میک اپ نے بہت بوجھل بنادیا ہے۔ عورت کی پیشانی پر بل پڑجاتے ہیں، لیکن دہکتے ہوئے سرخ ہونٹ ہنستے رہتے ہیں۔

یہ ڈپلومیٹ، جو دنیا کے بڑے بڑے نائٹ کلبوں سے آتے ہیں، مجھ پر جان دیتے ہیں، کیونکہ یہاں انہیں پیرس کی خوش مذاقی بھی ملتی ہے اور ایشیائی تہذیب کا اسرار بھی نظر آتا ہے۔

انہیں ہمارے یہاں کا کھانا بہت پسند ہے کیوں کہ ہمارا باورچی ہنگیرئن ہے جو ۱۹۵۶ء میں بداپست سے وِئنا بھاگ گیا تھا۔ یہ من چلا ہنگیرئن وئنا سے برلن گیا۔ برلن سے پیرس اور پیرس سے یہاں آگیا۔ انسان بھی عجیب تنکا ہے ہوا میں اڑ کر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس کا پکایا ہوا چکن گولاش اتنا مزیدار ہوتا ہے کہ یہ ڈپلومیٹ اپنے گھٹنوں پر نیپ کن بچھاتے ہی منہ سے رال ٹپکانے لگتا ہے۔

یہ ڈپلومیٹ کتنی بے نیازی سے، کتنی گہری اور خطرناک باتیں کرتے ہیں۔ کالی عینک والا شخص جو دو تین لفظ میں ہر سوال کا جواب دے رہا ہے اور جس کی گردن کی رگیں منہ کھولتے ہی جونکوں کی طرح پھول جاتی ہیں، سوپ پیتے پیتے نیپ کن سے ہونٹ خشک کرتا ہے۔ اور میز پر گھونسہ مارتا ہے...... کمیونسٹ...... گیس...... بم...... عورت...... بچے...... ویت نام۔

"Let them die, let them..........The food is delicious........

میز پر ایک رسالہ کھلا پڑا ہے۔ جس کی تصویر میں ننھا سا بچہ ایک مردہ ویت نامی ماں کے سینے کو ٹٹول رہا ہے......!

ہمارا ہنگیرئن باورچی یہ باتیں نہیں سنتا...... وہ اپنا سوپ اور گولاش پکانے میں لگا رہتا ہے۔ اس کا چہرہ گول ہے۔ ٹماٹر کی طرح سرخ۔ جب وہ چمچے میں گرم سوپ نکال کر چکھتا ہے تو اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو جاتی ہیں۔ اس کے سر پر ترچھی سفید ٹوپی کبھی ایک طرف جھکتی ہے، کبھی دوسری طرف...... اور جب رات گہری ہو جاتی ہے، سب

یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ ایر کنڈیشننگ مشین بند ہو جاتی ہے اور ہر طرف سے کھانے کی گرم خوشبو جھپٹتی ہے تو وہ اپنا سفید اپرن اتار دیتا ہے اور صرف بنیان اور انڈر ویر میں اوپر چھجے پر چلا جاتا ہے اور آنکھیں میچ کر دور کی روشن کھڑکیوں کو اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے دیکھتا ہے۔ خود ہی سوال کرتا ہے اور خود ہی جواب دیتا ہے۔

"آزادی آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ آزادی نے مجھے باورچی بنا دیا ہے۔"

پھر وہ گنگناتا ہے...... "آزادی...... آزادی...... آزادی...... چکن گولاش پکانے کی آزادی...... چھجے پر سونے کی آزادی...... گانا گانے کی آزادی......"

وہ واقعی گانے لگتا ہے۔ اس کی آواز میں بڑا سوز ہے۔ جب میری دیواروں کو اس کی آواز چھوتی ہے تو مجھے لگتا ہے کہ میں ایک جیل ہوں...... رات مجھے تھپکیاں دے رہی ہے لیکن میں جاگ رہا ہوں۔ کیوں کہ پو پھٹنے سے پہلے میری دیواروں کے اس قیدی کو پھانسی کے پھندے میں لٹکا دیا جائے گا۔ رات، قیدی، پھانسی۔

اس کی آواز سن کر چھجے کے نیچے شوفر، بیرے، سنتری وغیرہ مچھروں کو اڑاتے ہیں اور دانت پیس کر رہتے ہیں۔

"سالہ پاگل ہے۔ نہ جانے یہ ہنگیرئن کا بچہ سوتا کیوں نہیں!"

"ماں یاد آتی ہو گی؟"

ہنگیرئن کو واقعی ماں یاد آتی ہے اور وہ گاتا ہے:

رات، دھند اور چاند......

میرا شہر، میری ماں...... خاموشی!

شہر کا دل، دریا، خاموش، رواں دواں

دل، دل کی زنجیر، جھنکار! دل، دل کی زنجیر، جھنکار!

برچ کے اجلے درخت، ہوا، دھند، چاند

ہونٹ، دھند، سانس، چاند...... ہنگری کا چاند!

آگ پگھلتی ہوئی

سانس میں
دھند، چاندنی اور پانی میں
گھلتی ہوئی
آگ!

بداپست کی ہواؤ
تم کہاں ہو؟

میں کہاں ہوں؟
میں بس اتنا جانتا ہوں
میں جہاں ہوں وہاں
نہ ماں ہے
اور نہ توکائی جیسی شراب
جس میں بسی ہوئی ہے
نہ جانے کیسے کیسے ہونٹوں کی گرمی
بالوں اور بانہوں کی خوشبو
رات، دھند، چاند!

ہنکیرئن سو جاتا ہے اور خواب میں بڑبڑاتا ہے ...... آج میں **چکن گولاش** پکاتا ہوں، کل میں سانپ اور بچھو کا گولاش پکاؤں گا۔ کیونکہ میں آزاد ہوں۔ اپنے دریا، اپنی ہوا، اپنے گھنے درختوں سے دور۔

"What a silly song..." میرے اندر صبح ہی سے شام ہے۔ لیکن اب تو باہر بھی شام ہو چلی ہے۔ اب دروازہ کھلتا ہے تو دھوپ کی سل نہیں چمکتی، اب سرمئی

دھندلکے میں چند سائے اندر آجاتے ہیں۔ تھکے تھکے بھی جولاں بھی...... جسم بھی آتے ہیں اور روحیں بھی۔ لچکتے ہوئے جسم، لڑکھڑاتے ہوئے جسم، مہکتی ہوئی روحیں، صراحی سے چھلکتی ہوئی، گھبراتی ہوئی، بکھرتی روحیں۔ ٹھنڈی فضا میں کیک، پیسٹری اور چائے کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ ٹرالی ٹرے، رنگین پلیٹیں، ہاٹ ڈاگ، مٹن ہمبرگر، سموسے، بیئر، اورنج اسکواش، کوکا کولا، گولڈن فوم۔

"میں اس کی ایسی کی تیسی کردوں گا۔ یہ کیا اسٹائل ہے بادشاہو۔ لائٹ دینے میں بھی جان جاتی ہے۔ لائٹ ہی نہیں ہے۔ جس دیش میں لائٹ ہی نہیں ہوگی......"
ہری کپور اپنی اندر کی جیب میں نوٹوں کی گڈی کو انگلیوں سے چھوتا ہے۔

"ان سالوں کا ایر کنڈیشنڈ بھی جعلی ہے۔"

ہری کپور کا سر بہت بڑا ہے اور بال کھڑے ہیں۔ اس کی ٹیری لین کی قمیص کے نیچے سے میلا بنیان جھانک رہا ہے۔ اس کے ہونٹ سیاہ ہیں اور آنکھیں بلوریں، جن میں ہوس کی چنگاریاں جل رہی ہیں۔

"میں کہتا ہوں سردار تیجا سنگھ پھر چرکا دے گیا۔ پارٹنر، ہم دیکھتے رہے اور چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اس کا سمنٹ راکھ ہے راکھ۔ اور سرکار اسی کو ٹھیکہ دیتی ہے۔" شرما منہ بگاڑ کر کہتا ہے اور اپنی موٹی ہتھیلیوں کو رگڑتا ہے۔

"اس بار نکل گیا بادشاہو۔ لیکن اگلے سال کہاں جائے گا بادشاہو۔ جتنا کھانڈ ڈالو گے لسی اتنی ہی میٹھی ہوگی۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے بادشاہو۔ ادھر دیکھو۔ اس کونے میں تمہارا لونڈا کیسا کھیل کھیل رہا ہے۔ اور پڑھاؤ اس کو کالج میں۔"

"بھیا ہم نے کم کی ہے ہیرا پھیری، اپنے زمانے میں۔" ہری کپور اس کونے کی طرف نہیں دیکھتا، جہاں اس کا بیٹا سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہے، لیکن اس کے ساتھی کی نظر اسی کونے پر جمی ہوئی ہے...... وہ سوچ رہا ہے۔ "باپ ہو یا بیٹا۔ مال اچھا پھانستے ہیں دونوں۔"

نوجوان کپور نے نہ تو اپنے باپ کو دیکھا ہے اور نہ اس کے پارٹنر کو...... وہ راگنی

کے گلے میں پڑے ہوئے سفید ہار کو دیکھ رہا ہے جو بلاؤز کے بڑے سے گریبان کو چھو رہا ہے۔ وہ بھی خاموش ہے اور راگنی بھی...... میز پر فرانسیسی مصنفہ دو بوا کی کتاب کھلی ہوئی رکھی ہے۔ ہر طرف روشنی مدھم ہے۔ اسپریسو کی مشین کھانستی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ ویٹر تیزی سے آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں...... موسیقی کی دھنیں بہت اداس ہیں۔ راگنی کتاب کے ٹائٹل کو دیکھ رہی ہے۔ جس پر ایک لڑکی کی ننگی تصویر ہے جس کے کٹے ہوئے بال شانوں پر جھول رہے ہیں۔ "میں نے آئینے میں اپنا ننگا جسم دیکھا ہے۔ میرا جسم ایسا نہیں ہے۔ کیا تمام فرانسیسی لڑکیوں کا جسم ایسا ہی ہوتا ہے۔ ترشے ہوئے چکنے کولہے، سڈول رانیں، دبلی مگر پیاسی بانہیں...... میرا جسم، نہ یہ خم نہ یہ ابھار...... بڑا بیمار سا...... بڑا اوٹ پٹانگ سا جسم ہوتا ہے ہندوستانی عورت کا...... وہ بات ہوتی ہی نہیں۔ کیوں ایلورا کے مجسموں میں اور وینس دی میلو میں کتنا بڑا فرق ہے۔ ہندوستانی سینے بہت بھاری ہوتے ہیں اور کولہے، ان میں یہ divinity یہ تراش، یہ خم، یہ ابھار، یہ نرمی نہیں ہوتی۔ ایک سینے وہ ہوتے ہیں جو اپنا سب کچھ ظاہر کر دیتے ہیں، ایک وہ ہوتے ہیں جو راز کو اور گہرا کر دیتے ہیں۔ میرا دماغ بہت سیکسی ہو گیا ہے اور میں بیمار ہوں frigid! میں نے کتابوں میں پڑھا ہے ایسی عورتیں...... کپور یونیورسٹی کا سب سے اچھا کھلاڑی ہے۔ اس کا جسم جتنا بھرا ہوا ہے، دماغ اتنا ہی خالی ہے۔ زندگی صرف سیکس نہیں ہے۔ زندگی کو کچھ اور بھی چاہیے۔ یہ ریکھا سے جلتا ہے، مجھے بھی سنا چکا ہے کہ یونیورسٹی کے لڑکے کہتے ہیں میں lesbian ہوں۔ لیکن یہ جھوٹ ہے۔ ریکھا میری دوست ہے اور وہ کپور پر مرتی ہے۔ وہ اس کے چہرے پر مرتی ہے۔ چہرہ تو واقعی اس کا "مارٹر" والا ہے۔ جب کبھی میں لابوہیم میں اسے دیکھتی ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں کسی ایسے فوجی کپتان کو دیکھ رہی ہوں جو سیدھا میدان جنگ سے بھاگا آ رہا ہے، جہاں اس کے سارے سپاہی کام آ چکے ہیں اور تمغے چھن گئے ہیں...... چہرہ ستا ہوا۔ بالوں میں خاک سی اڑتی ہوئی، اور آنکھوں میں غضب کی شکست اور انتقام کی ہوس۔ کس سے انتقام؟ کاہے کا انتقام۔" یہ میں اکثر اپنے آپ سے پوچھتا ہوں...... کپور چپ ہے۔ اور

وہ سوچ رہا ہے کہ میں اس کی ٹانگ کے لمس کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہوں۔ کڑھ رہا ہے۔ گدھا...... اب ریکھا آتی ہی ہو گی۔ کیسا خون کھولے گا اس کا نظر اٹھا کر بھی تو نہیں دیکھتا یہ اس کی طرف۔ آج میں کپور سے کہہ دوں گی، تمہارے لیے میرے پاس......

ریکھا سائے کی طرح آتی ہے۔ اس کی آواز کتنی بھاری اور سرگوشی سے بھری ہوئی ہے۔ قد، کتنا اونچا قد، لباس کتنا چست لباس، بال، کتنے گھنے بال، آزاد، شہد اس کی آنکھوں سے کیسا شہد ٹپک رہا ہے۔

یہ شہد کس کے لیے ہے۔ ہونٹوں کا یہ خم کس کے لیے ہے۔ جسم کا یہ تھما تھما سا تلاطم کس کے لیے ہے۔ کپور اٹھ کر میز کی دوسری طرف بیٹھ جاتا ہے۔ راگنی اس کی بھری بھری ران کو اپنی ران سے دباتی ہے۔

ریکھا اس کو حیرت سے دیکھتی ہے۔

"کپور آج خودکشی کرنے والا ہے۔" راگنی کہتی ہے۔

"کیوں......" ریکھا ہنس کر کہنیاں میز پر رکھ دیتی ہے اور کپور کی طرف جھکتی ہے۔

"سچ"......

کپور ہونٹ چبانے لگتا ہے...... "تم کیا پیو گی؟"

"وہسکی"

"ایسپریسو؟"

"لیس ایسپریسو وہسکی، نیٹ، بلیک!" ریکھا آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

خاموشی چھا جاتی ہے۔ راگنی اسپریسو مشین کی روشن رگوں اور آنکھوں کو دیکھ رہی ہے۔ اس کے ہونٹ بھنچ رہے ہیں۔ پاس ہی سرخ میز کے گرد نوجوانوں کی دوسری ٹولی ہے۔ میز کے کونے پر کافی کی پیالی سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ ایک پتلا دبلا چہرہ، جو درخت کی چھال کی طرح خشک ہے، عینک لگائے بھاپ کو گھور رہا ہے۔ اس کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے ہونٹ چوستا ہے۔ لیکن جب ہونٹ اپنی اصلی حالت پر آتے ہیں تو ان میں کوئی نمی پیدا نہیں ہوتی۔

زہریلے پھول کی کالی پنکھڑی کی طرح خشک ہونٹ تھرتھراتے ہیں۔
وہ پھر اپنے ہونٹ چوستا ہے۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔
''ہاہا، جینیئس لوگ ہمیشہ اسی زبان میں بات کرتے ہیں۔''
''میں کہتا ہوں تم لوگ غلط جگہ لے آئے ہو۔ اس ایر کنڈیشنڈ ریستوران میں تو طاعون پھیلنا چاہئے۔ یہ ریاکاری کا گھونسلہ ہے۔ ہر طرف سڑے ہوئے دل اور دماغ کی سڑانڈ اٹھ رہی ہے۔ تم لوگوں کو کولڈ اسٹور کی چیزیں پسند ہیں صرف اس لیے کہ یہ چیزیں ٹھنڈی ہیں۔''
وہ رکتا ہے۔ کافی کا ایک گھونٹ پیتا ہے۔
میں اس شخصیت سے نفرت کرتا ہوں کیوں کہ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ اس گدھے کو نہیں معلوم کہ کھوٹا سکہ گھوم گھام کر واپس آجاتا ہے۔
تم لوگ مجھ سے جلتے ہو کیوں کہ میں اس طرح لکھتا اور سوچتا ہوں جس طرح لوگ آج فرانس میں سوچ رہے ہیں۔ کیوں کہ میری کہانیاں .... میں چھپتی ہیں کیوں کہ میں تم سب کو مداری سمجھتا ہوں۔ اور صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ میں اکیلا پیدا ہوا ہوں، اکیلا جیوں گا اور اکیلا مروں گا۔''
موٹے گالوں والا نوجوان جو کسی ریستوران کے مالک کا داماد ہے اور اپنے آدم بیزار دوست کی ''محبت'' میں گرفتار ہے، سر اٹھاتا ہے، دانت سے ناخن کترتا ہے۔
''بیٹا، سمجھتے ہو بڑے اور جل اکیلے ہو اور سمجھتے ہو اکیلے صرف فرانس میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب غالب نے کہا تھا...... ''رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو...... تو کیا......''
''میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ میں تم نہیں ہوں اور تم......''
''خدا کی قسم اتنا بڑا انکشاف تو آج تک ہوا ہی نہیں تھا۔''
سب بھیڑیوں کی طرح سر جھکا کر ہنستے ہیں۔ بڑے بے رحم ہیں یہ لوگ...... یہ گروہ جب کبھی میری ٹھنڈی، گہری اور اندھیری آغوش میں آتا ہے میری روح لرز

جاتی ہے۔ کیوں کہ یہ سب مجھے اجنبی لگتے ہیں۔ یہاں اس قسم کی باتیں کرنے والے نہیں آتے۔ جو صرف باتیں کرتے ہوں اور اپنے دماغ و دل کا سارا زہر باتوں میں انڈیل دیتے ہوں۔ یہاں تو......

نوجوان کی آنکھیں اور پھیل جاتی ہیں، اور آواز رندھ جاتی ہے۔

دیکھو اپنے چاروں طرف دیکھو...... یہ لوگ جو میزوں کے گرد بیٹھے ہاٹ کافی، فریش لیموں یا جنجر پی رہے ہیں، ذرا ان سب کو دیکھو۔ ان میں کچھ اپنی بیویوں کے ساتھ ہیں۔ کچھ عاشق ہیں کچھ معشوق ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو سوچنے کی عادت نہیں پڑی ہے۔ یہ انسان کو اس دنیا کے دل و دماغ سے نہیں پہچانتے۔ اندھوں کی طرح ٹٹول کر دیکھتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کو محسوس نہیں کر رہے ہیں بلکہ ٹٹول رہے ہیں کیونکہ ان میں سے کسی نے بھی اپنے آپ کو تلاش نہیں کیا، اور جو لوگ......"

گروہ پر جو سکتے کا عالم طاری ہو گیا تھا، یکایک ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے کسی کو چھینک آتی ہے اور سب ڈر جاتے ہیں۔ جیسے ہتوڑے کی ضرب نے برف کی سل کے ٹکڑے کر دیئے ہوں۔

مجھے وہ چکنا چکنا سا ڈپلومیٹ اچھا لگتا ہے۔ جو ہمیشہ محفوظ کونے میں بیٹھتا ہے۔ اس شخص نے ہمیشہ زندگی میں محفوظ جگہ کی تلاش کی ہے۔ جب اس کے ملک میں خانہ جنگی پھیلی ہوئی تھی تو وہ لاطینی امریکہ کے دورے پر تھا۔ اور غیر ملکیوں کو یقین دلا رہا تھا کہ اس کے ہم وطن آزادی کی قیمت ادا کرنے کیلئے کس طرح خاک و خون ہو رہے ہیں، کس طرح بچوں کو سنگینوں پر اٹھایا جا رہا ہے اور عورتوں کے ساتھ عام شاہراہوں پر زنا کیا جا رہا ہے۔

اس کا چہرہ گول ہے، چکنا جیسے اس پر پہلے پالش کی گئی ہو اور س کے بعد استری، اس کی معشوقہ جو اپنے ہندوستانی روایتی گھر، تابڑ توڑ بچوں، وزارتی افسروں کی خوشامد میں دن رات لگے رہنے والے شوہر، دن رات سلیقے کا طعنہ دینے والی ساس اور گھر میں آنے والے ہر عاشق پر ڈورے ڈالنے والی نندوں سے بیزار ہے۔ اس وقت وہ سب کچھ

بھول کر میٹھی میٹھی ترچھی نظروں سے اس غیر ملکی ڈپلومیٹ کو دیکھ رہی ہے، جس کی بین الاقوامی سرگرمیوں میں ''اڈلٹری اور دیا چری'' ان مہروں کی حیثیت رکھتی ہے جس سے ''شہ اور مات'' کی بہت سی چالیں طے ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اس کا چہرہ سفید اسفنج کا بنا ہوا ہے، اور کوئی ان دیکھا ہاتھ اسے آہستہ آہستہ دبا رہا ہے اور اس کے مساموں سے مسکراہٹ ٹپک رہی ہے۔ اگر اس کے چہرے کے نیچے بالٹی رکھ دی جائے تو منٹوں میں مسکراہٹوں سے بھر جائے۔

''کبھی کبھی مجھے تمہارے شوہر پر بڑا رحم آتا ہے۔'' وہ زبان سے تالو کو سہلاتا ہے۔

"After all he is such a wonderful man."

سلمٰی ہنستی ہے۔ اور اپنے میک اپ کے بگڑنے کے اندیشے سے اپنی ہنسی کو ادھورا ہی چھوڑ دیتی ہے۔

"And you? You are so naughty"

یکایک اس کا چہرہ سنجیدہ ہو جاتا ہے...... جانتے ہو کبھی کبھی مجھے کیسا لگتا ہے؟ تم میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لو تو بتاؤں۔ ڈپلومیٹ۔ اس کا نرم، چھوٹا، اور حیرت زدہ ہاتھ اپنے معاملہ فہم ہاتھ میں لے لیتا ہے جو صبح سے امریکی، سیلونی، پاکستانی اور فرانسیسی ہاتھوں کے لمس سے بیزار ہو چکا ہے۔ یہ ہاتھ بھی کیا چیز ہوتے ہیں وہ اپنی آنکھوں کا نشہ چھلکاتے ہوئے کہتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ایک بہت بڑے ریگستان میں ہوں۔ اکیلی۔ ریت کے بڑے بڑے ٹیلے میرا راستہ گھیرے ہوئے ہیں۔ آسمان اندھیرا ہے...... دور کہیں ایک ستارہ چمک رہا ہے۔ میں اس ستارے کی طرف اُڑنا چاہتی ہوں۔ پیاس سے میری زبان سوکھی جا رہی ہے۔''

محفوظ کونے میں محفوظ ہاتھوں کے لمس سے بیقرار ہو کر ڈپلومیٹ ایک محفوظ سی نظر ان سایوں اور دھندلکوں پر دوڑاتا ہے جن کی آوازیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر پراسرار سرگوشی بن گئی ہیں۔ پھر اس کی عینک کے دبیز شیشے، جن کا رنگ ہلکا نیلا ہے، اس کے دوست کی بیوی کے ہونٹوں پر جم جاتے ہیں اور وہ دل ہی دل میں کہتا ہے۔

''بعض ہونٹ صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کو ہونٹوں سے نہیں بلکہ دانتوں سے چوما جائے۔ وہ اپنے سگریٹ کی راکھ راکھ دان میں جھاڑتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ ''یہاں سے ہوسٹل چلیں گے۔'' دوست کی بیوی اس کی ہتھیلی دباتی ہے اور ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سپردگی کے انداز میں کہتی ہے۔ ''بہت دیر ہو جائے گی، رات کو جب وہ گھر لوٹتے ہیں اور مجھے نہیں پاتے تو بہت excited ہو جاتے ہیں۔''

پھر ''نہیں نہیں'' اور ''ہاں ہاں'' کے ملے جلے انداز میں کہتی ہے۔ ''میں بس سین برداشت نہیں کر سکتی۔''

ڈپلومیٹ دوست کا گول چہرہ گرے ہوئے آئینے کی طرح ٹوٹ جاتا ہے اور وہ کچھ سوچ کر کہتا ہے۔

"All right, I will finish report to night"

نوجوانوں کی میز پر گفتگو کا چڑچڑاپن اسی طرح قائم ہے۔

سوکھے چہرے والا نوجوان ادھ جلی سگریٹ سے دوسری سگریٹ جلاتا ہے۔ اور اس گول چہرے والے ڈپلومیٹ کی طرف دیکھتا ہے۔ جو اپنے دوست کی بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈال رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

"Please for God's sake!"

"Bitch!" نوجوان جلدی جلدی سگریٹ کے کش لگاتا ہے۔ میرا دم گھٹتا ہے یہاں...... کیونکہ یہاں کی ہر چیز جھوٹی ہے...... یہ دھندلکا...... یہ پرچھائیاں، یہ آنکھیں، یہ ہونٹ اور باتیں، ٹھیکیداروں کی باتیں، ڈپلومیٹ کی باتیں، طالب علموں کی باتیں، ان کی باتوں میں کیا رکھا ہے۔ آج فرانس کے لوگ اس طرح باتیں نہیں کرتے۔ وہ چھپ کر کوئی کام نہیں کرتے۔ جس طرح وہ ڈپلومیٹ چھپ کر کسی عورت کی کمر میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔

"I hate his hand, I hate her waist."

اور وہ زور سے کش لیتا ہے۔

"تم پیاسے ہو۔ تمہارا دماغ اس قیدی کے دماغ کی طرح ہے جو کولھو میں جوت دیا گیا ہو۔ جب وہ پانی مانگتا ہے تو اس کے سامنے پانی کی ٹھنڈی صراحی لائی جاتی ہے۔ صراحی ٹوٹ گئی ہے۔ پانی بہہ رہا ہے اور تم چیخ رہے ہو۔ تم پیاسے ہو۔"

"پیاسا؟ کس چیز کا پیاسا ہوں میں گدھے؟"

"تم اس کمر کے پیاسے ہو، ان ہونٹوں کے، ان آنکھوں کے، ان سینوں......"

نوجوان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور وہ کافی کی پیالی اٹھالیتا ہے۔ کئی ہاتھ صلیبوں کی طرح اٹھتے ہیں اور اس کے ہاتھ کو تھام لیتے ہیں۔

"یہاں نہیں...... یہاں نہیں"

"نہیں...... میں تو توڑوں گا۔"

"نہیں یہ لابوہیم ہے۔ یہاں نہ پیالیاں توڑی جاتی ہیں، نہ دل، نہ سر۔"

ہڈیوں کا ڈھانچہ جسے اس کے ساتھی "سسی فس" کہتے ہیں پیچ و تاب کھاتا ہے، اٹھتا ہے، اور لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ دروازہ بند ہو جاتا ہے اور الو کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے چمکتی ہیں اور پھر دھندلکے میں کھو جاتی ہیں۔

نوجوان کے ساتھی میز پر سر جھکائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے۔

"نہ جانے یہ بھوت اپنی "میں" کی لاش کب تک اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرے گا۔

"دیکھ لینا...... یہ بھی اپنے دوسرے دوستوں کی طرح خودکشی کرے گا۔"

"نہیں وہ سچا آرٹسٹ ہے۔ سچے آرٹسٹ اتنے بے وقوف نہیں ہوتے۔"

میرا دل بھر آیا ہے۔ نہ جانے کتنی باتیں سنتا رہتا ہوں دن رات۔ اور وہ تمام باتیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ میرے دل میں دھڑک رہی ہیں۔ یہ سب اپنی اپنی "میں" کے کنویں میں بند ہیں اور اپنے آپ کو پکار رہے ہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ شاید ہی یہاں کبھی آتا ہے۔ وہ جب بھی یہاں آتا ہے زخمی ہو کر جاتا ہے۔ اس کے دوست بڑے بے رحم ہیں۔ اپنے بارے میں اس کا احساس کانچ کے کمرے کی طرح ہے۔ وہ اپنے کانچ کے کمرے میں بیٹھ کر دوسروں کے کمروں پر پتھر برساتا ہے اور جب

دوسرے پتھر برساتے ہیں تو بلبلا اٹھتا ہے۔ یہ زندگی کتنی عجیب ہے۔
"محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!"
نیچی دیوار کے پاس اونچی گردن والا یوکریٹس، بقراط، بیٹھا ہوا ہے اسے اور کسی چیز کی فکر نہیں ہے۔ وہ اپنا معاملہ پٹانے پر اتارو ہے۔ اور سب باتیں چھوڑ دیجئے۔ بس اتنا سمجھئے کہ آپ کے ملک میں کلچر کا قحط ہے۔ اور کلچر کا تعلق، گہرا تعلق، یعنی جتنا گہرا تعلق آپ سے میرا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تعلق کلچر کا اخبار سے ہے۔ اور میں نے اپنی زندگی اخبار کے لیے تج دی ہے۔ یہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ میں رہائن، سین، ٹیمس، والگا کے پانی کو گنگا کے پانی سے ملا دوں گا۔ اس کی اونچی گردن اور اونچی ہو گئی ہے، اور ہونٹوں سے الفاظ اور آواز کے ساتھ جھاگ کی سفید پھواریں بھی پھوٹ رہی ہیں۔ میں انٹرنیشنل آؤٹ لک کا آدمی ہوں۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ مولوی بھی انٹرنیشنل ہو سکتا ہے۔ میری نظر دنیا کے فلسفے پر ہے۔ میں قرآن پی گیا، مارکس ازم پی گیا، کانٹ اور نتیشے کا فلسفہ پی گیا۔ میں اقبال کا مرد مومن ہوں گم جس میں ہے آفاق...... کتنا شاندار لفظ ہے۔ ذرا اس کی گونج سنئے۔ میں زرتشت کی طرح ہوں جو چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔

"Behold! I am weary of wisdom like a bee that has gathered too much honey."

"اچھا تو اگر میں آپ کو دو ہزار روپے دے دوں تو کیا آپ اخبار نکالیں گے۔ منافع کب سے آنا شروع ہو جائے گا؟"
زرتشت کے چہرے پر تلخی کے بادل تیرتے ہیں۔ "اخبار اور منافع" وہ چبا چبا کر دہراتا ہے۔ پھر وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے زیر لب کہتا ہے:
"نیکی کر کنویں میں ڈال۔ اخبار نکالنا کچھ ایسا ہی دھندا ہے۔"
"جی؟"
"جی!"

دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ بقراط کی گردن کی اونچائی کم ہو جاتی ہے۔

کتنے لوگ ہیں جو یہاں صرف تھکن مٹانے آتے ہیں۔ کولڈ کافی پیتے ہیں۔ کچھ اسنیکس کھاتے ہیں، اور سب کچھ بھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر لوگ یہاں سودا کرنے آتے ہیں۔ یہ سودے طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ لاکھوں روپے پونڈ اور ڈالر کے سودے ہوتے ہیں۔ دلوں کے سودے ہوتے ہیں۔ حسن اور جوانی کے سودے ہوتے ہیں۔ اکثر خالی خولی امیدوں اور وعدوں کے سودے ہوتے ہیں۔ میرے اعصاب کے پرخچے اڑ جاتے ہیں جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ ایک دوسرے کے وعدوں کو شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتے ہیں۔ میرے پورے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔ جب کوئی عورت سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہے وہ جانتی ہے کہ کوئی لالچی یا چھچھورا چہرہ کیوں اس پر جھکا آرہا ہے۔ وہ جانتی ہے اگلی منزل کیا ہے۔ اور اس نازک لمحے میں وہ تمتماتے ہوئے چہرے کھسیاتے ہوئے احمقانہ چہرے سے پوچھتی ہے۔

"آپ کا بڑا بیٹا امتحان میں پاس ہو گیا نا......؟"

اگر یہ عورت اپنے عاشق پر یہی جتانا چاہتی ہے کہ میں ابھی جوان ہوں۔ بہت جوان اور تم ادھیڑ سے بھی گئے گزرے ہو، اور تمہاری گردن میں مضبوط پٹا پڑا ہوا ہے تو پھر اس کے ساتھ یہاں کولڈ ڈرنک پینے کیوں آتی ہے اور پھر یہی گھٹا ہوا کونا کیوں چنتی ہے، جہاں بوسوں اور ہاتھوں کے لمس کو ہری بیلیں اپنے خوابناک جال سے ڈھک لیتی ہیں۔

ان غیر ملکیوں کا قد اتنا اونچا ہے۔ سب اونٹ کی طرح اونچے، شانے ذرا جھکے ہوئے، گریبان بے پروائی سے چاک، چہرے پر بچکانہ بے فکری اور آنکھوں میں کھلنڈرا پن، سیاحوں والا تجسس، نہ اجنبیت نہ بوکھلاہٹ جیسے یہ سب کچھ ان کا اپنا ہے۔ یہ جھلملاہٹ، یہ فضا، یہ سرگوشیاں، آنکھوں کی گردش اور دل کی دھڑکن، ساری بیداری، ساری روشنی، سارا اندھیرا، ساری نیند...... جیسے یہ سب ان کا ہے۔ ان کو کچھ جاننا

نہیں۔ انہیں کچھ سیکھنا نہیں۔ ایسے لوگ کہاں سے آتے ہیں، جنہیں کوئی چیز حیرت میں نہیں ڈالتی، کوئی چیز چونکاتی نہیں، یہ لوگ غیر ملکی ٹورسٹ کہلاتے ہیں۔ بڑے بے تکلف لوگ ہیں۔ سات سمندر پار سے آئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں کیمرے ہیں۔ اسٹل کیمرے، مووی کیمرے اور دوربین۔ یہ لوگ کیا دیکھنے آتے ہیں۔ کتنی دور تک دیکھنے آتے ہیں۔ ان کی دوربین میں وہ بات نہیں جو میرے دل کی دوربین میں ہے اور یہی ایک بات ایسی ہے جس سے یہ بے خبر ہیں۔ اور مجھے ان کی یہ بے خبری پسند ہے۔ کیونکہ مجھے ہر وہ چیز پسند ہے جو اوروں کو احمق اور مجھے دور اندیش ثابت کرتی ہے۔

مجھے یہ جگہ صرف اس لیے پسند ہے کہ یہ دوسری جگہوں سے مختلف ہے۔ الگ، انوکھی اور پراسرار، کالی داڑھی اور کالے چہرے والا مصور، ہنگیرین باورچی کا پکایا ہوا مزیدار سوپ پیتے ہوئے کچھ فراری انداز میں کہتا ہے۔

''ہنگیرین باورچی کتنا اچھا سوپ پکاتے ہیں۔''

''اور گولاش، چکن گولاش؟'' ڈرامہ نگار دوست، جو کچھ ہی دنوں پہلے امریکہ کی سیاحی کر کے لوٹا ہے، اپنے دلکش چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اور پائپ سے ہتھیلی کو ٹھونکتے ہوئے کہتا ہے ''ہنگیرین معزز قوم ہے لیکن یہ امریکی...... مائی گاڈ، بدمذاقی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔''

''تم بڑے نمک حرام ہو، بیچاروں نے جانے کتنے ڈالر تم پر بہادیئے اور تم ہو کہ ......''

مصور رک جاتا ہے اور سوپ کا چمچا ہونٹوں سے لگالیتا ہے۔

''ایک بات سنو...... میں ایک بہت بڑی تھئیٹر تحریک چلانے والا ہوں۔''

''چلا بھی چکو۔''

''تم کیا پینٹ کر رہے ہو؟''

"Hollowness of man!" یعنی ''انسان کا کھوکھلا پن۔''

''تم سلف پورٹریٹ کے چکر سے کبھی نکلو گے بھی یا نہیں......؟''

"ہر Creative کام میں فنکار کا "سلف" موجود ہوتا ہے۔ کیا تمہارے ڈراموں میں سلف نہیں ہے۔"

میں مانتا ہوں۔ لیکن میں نے اب تک ڈرامہ لکھا کب ہے۔ میرا مطلب ہے real thing! اس کی آواز پراسرار ہو جاتی ہے۔

"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے، آ میرے یار، تب کہیں ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔"

"اقبال میں کامن سنس کی کمی تھی۔"

"اقبال کامن ویلتھ کا ممبر نہیں تھا۔"

"اچھا امریکہ میں اپنے تجربے کے بارے میں بتاؤ۔" مصور کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اس کے آگے سے سوپ کی گہری پلیٹ کھسکالی جاتی ہے۔ بیرا چمکتے ہوئے قاب سے چکن گولاش کے ٹکڑے نکال کر اس کی پلیٹ میں ڈالتا ہے۔ مصور سوچ رہا ہے۔ بڑا ایڈیٹ ہے۔ ابھی میں نے سوپ ختم نہیں کیا تھا اور پلیٹ اٹھالے گیا۔ وہ ڈرامہ نگار کو جھلائی ہوئی نظر سے دیکھتا ہے۔ "کچھ مزیدار باتیں سناؤ۔"

"مزیدار باتیں؟ تجربہ؟" ڈرامہ نگار دہراتا ہے۔ "میرے تجربے تمہارے تجربوں سے مختلف ہیں۔"

"انسان مختلف ہوں گے تو ظاہر ہے تجربے بھی مختلف ہوں گے۔" وہ آزاد افراد کا ملک ہے۔ وہ گولاش کا بڑا سا ٹکڑا کانٹے میں پھنساتا ہے اور کانٹے کو دھمکی کے انداز میں ہلاتا ہے۔

"میں ملک سے ملنے نہیں گیا تھا۔ میں بھی چند افراد سے مل کر چلا آیا۔"

"لیکن امریکی قوم......"

"امریکی قوم؟" یہ تم کیا کہہ رہے ہو بھائی...... قوم ہوتی ہی نہیں امریکہ میں۔ امریکہ تو آزاد افراد کا ملک ہے۔ عرب میں اونٹ نہیں ہوتا اور امریکہ میں قوم نہیں ہوتی۔ دونوں بڑے اچھے ہیں۔"

مصور کھسیانی ہنسی ہنستا ہے۔ ڈرامہ نگار کے جبڑے اور ابھرنے لگتے ہیں۔ آنکھوں سے عجیب سی بے اطمینانی جھانکنے لگتی ہے۔

وہ کھانا کھاتے کھاتے بڑی بے زاری کے ساتھ سر دھنتا ہے۔

''ایک لڑکی ملی تھی۔ آئرش نسل کی تھی۔ میرے ہی ہوٹل میں اس کا قیام تھا۔ خوبصورت تو خیر نہیں تھی۔ جوان تھی۔ جوانی میں تو کتیا بھی حسین لگتی ہے۔ میں اس کو تھئیٹر ویٹر لے گیا۔ ایک آدھ بار دریا کی سیر ساتھ کی۔ کافی فلرٹ کر چکا تو میں نے سوچا۔ آمدم بر سر مطلب۔ لیکن اس نے میرا مطلب سمجھنے سے انکار کر دیا۔ تم جانتے ہو۔ تمہاری طرح میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں لڑکیاں ایسے موقع پر مطلب سمجھنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ سو میں نے...... لیکن جانتے ہو وہ لڑکی اتنی بے وقوف تھی...... بلکہ بتاشہ مار کہ...... ہندوستانی لڑکیوں کی طرح رونے لگی۔ میں نے اس کو چاکلیٹ پیش کیا تب جا کر چپ ہوئی اور مسکرائی۔ میں نے ہندوستانی فلم والا نسخہ استعمال کیا۔ جھٹ اس کو اپنی بہن بنالیا اور جب میں نے اس کو بہن بنالیا تو وہ رات کو میرے کمرے میں آئی اور اس نے مجھے rape کیا۔ میرے ضمیر پر عجیب بوجھ ہے۔''

مصور قہقہے مارتا ہے اور نیپ کن سے منہ پونچھتا ہے۔

"Really!"

اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟

اتنے کامن پلیس تجربے کے لیے امریکہ جانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو یہاں آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ اس کے کندھے اچک رہے ہیں اور مارے ہنسی کے آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔

"I can imagine your face while being raped"

''یہ میرا چہرہ نہیں، تمہارا چہرہ ہے۔ تم سلف پورٹریٹ بناؤ۔ مانگے کے چہرے سے کام نہیں چلتا۔ ہر فنکار کے creative کام میں اس کا اپنا چہرہ ہوتا ہے۔

''چہرہ نہیں دل!''

"دل ایک پمپنگ مشین ہے جو پورے جسم میں خون دوڑاتی ہے۔"

"خفا نہ ہو...... تم جانتے ہو میں تم پر جان دیتا ہوں۔"

مصور کے کندھے پھر اچکنے لگتے ہیں۔ وہ پھر نیپکن منہ پر رکھ لیتا ہے۔

"میں تمہارا چہرہ دیکھ رہا ہوں۔ اور اس لڑکی کا بھی...... اس آئرش لڑکی کا......"

شٹ اپ...... اس قسم کی کوئی آئرش لڑکی نہیں تھی اور نہ اس قسم کا تجربہ ہوا۔ واحد یادگار تجربہ یہ ہے کہ مجھے ایک ریستوران سے صرف اس لیے نکال دیا گیا کہ میرا رنگ کالا ہے۔

"سانولا!"

"شٹ اپ...... مذاق نہیں ہے۔ ایک کالی قوم کی عزت کا سوال ہے۔"

میری آنکھوں میں نیند ہے۔ مجھے جماہی آرہی ہے۔ مغربی تہذیب کے خوش لباس پتلے بھی تھک گئے ہیں۔ جیسے جیسے رات بھیگتی ہے، تھکن گہری ہوتی جاتی ہے۔ ڈرامہ نگار اور مصور ایک دوسرے کی ٹانگ لے لے کر تھک جاتے ہیں۔ انہیں بل کا انتظار ہے۔ ڈرامہ نگار آنکھیں بند کئے کئے پوچھتا ہے۔

"بائی دی وے...... تمہاری معشوقہ کہاں ہے۔"

"کہیں ہوگی...... بائی دی وے۔"

سیاح خوش ہیں، انہیں کھانا اچھا ملا ہے۔ شراب وہ باہر سے پی آئے ہیں۔ انہیں بیروں کی وردی بہت اچھی لگتی ہے۔ جو راجپوتی سپاہیوں کا لباس ہے۔ اس لباس میں رانا پرتاپ نے اکبر کی فوجوں کے چھکے چھڑائے تھے۔

ان سیاحوں کا خیال یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنی روایتوں کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔ ان روایتوں میں مشرق کی روحانی طاقت چھپی ہوئی ہے۔ تیاگ اور سنیاس کا سارا فلسفہ...... اگر یہ ملک بھی امریکہ کی طرح صنعتی ملک بن گیا تو بیروں سے رانا پرتاپ کا یہ لباس بھی چھن جائے گا۔ عورتیں ساڑھی پہننا چھوڑ دیں گی۔ سیتا اور دروپدی کی پاکبازی کے افسانے بھلا دیئے جائیں گے۔ ان سے وقت کی یہ فراوانی چھن جائے گی۔ پھر گوتم

بدھ کا یہ ملک بھی ستیہ اور اہنسا کے کلچر اور بھائی چارے کے پرزے ایکسپورٹ کرنے لگے گا۔ پھر یہ امریکی اپنا اکسپورٹ مال لے کر کہاں کہاں مارے پھریں گے پھر وہ لوگوں کو جلیبیاں کھاتے اور بلم برچھے سے لیس ہو کر چکن گولاش پر دار کرتے دیکھیں گے۔

ٹھیک ہی کہتے ہیں یہ سیاح یہ جہانیاں جہاں گشت۔ مجھے نیند آرہی ہے اور یہ غیر ملکی ہیں کہ جا نہیں چکتے۔ دوسرے کونے میں شادی والی پارٹی جو ہے یہاں سے نکلنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ جی چاہتا ہے۔ ان کے کان پکڑوں اور مارواڑی نوجوان سے کہوں "بیٹا شادی کی راتیں لابوہیم میں بیٹھ کر گولڈ کنٹرول کے قانون پر فضول باتیں کرنے کے لیے نہیں ہوتیں۔ تم صرف پگھلی ہوئی آئس کریم دیکھ رہے ہو اور یہ نہیں جانتے کہ گھر میں جلتی ہوئی شمع کی لو کتنی تیز ہے۔ عورت بھی پگھلتی ہے بھائی...... عورت بھی...... مارواڑی نوجوان کے سونے کے دانت بھی آئس کریم کھاتے کھاتے ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے وقت کا احساس ہی نہیں۔ مدھم دھنیں درودیوار سے کہہ رہی ہیں۔ رات بھیگ رہی ہے۔ رات بھیگ رہی ہے۔

کچن میں اب بھی پتیلیوں سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ ہندوستانی باورچی جس کا سر گنجا ہے، لیکن جس کے بازوؤں، شانوں اور سینے پر گھنے بال ہیں اور پیشانی پر ان گنت شکنیں، گول ہرے پائے سے لگا، بھاپ کو مٹتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ ہنگیرین اس کی مچی ہوئی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔ اسے معلوم ہے ہندوستانی باورچی اس سے بیزار ہے۔ لیکن اس وقت ہندوستانی باورچی یہ سب کچھ نہیں سوچ رہا ہے وہ اپنے آپ سے اتنا پوچھ رہا ہے...... "کیا چکن گولاش، روغن جوش اور نرگسی کوفتوں سے زیادہ مزیدار ہوتا ہے؟ کیا میری پکائی ہوئی بٹیروں کا کوئی جواب ہے اس ہنگیرین کے پاس؟ عجیب زمانہ ہے سب ہی باہر کے مال پر جان دیتے ہیں۔ چکن گولاش ہو، فلم ہو یا لباس، ہر چیز باہر کی اچھی ہوتی ہے۔ بڑا نام ہے لابوہیم کا جو کھانا پکاتا ہے یہاں۔ میں چلا جاؤں گا۔ گے لارڈ یا پارک یا اشوکا میں۔ کچن ہر جگہ پچھواڑے میں ہوتا ہے۔ کہیں کچن ٹھنڈا نہیں رہتا۔ ہر جگہ وہی ہلدی، پیاز، وہی ادرک، دہی، دار چینی...... میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ہنگیرین کے بچے یہ

بو ہمیں تجھے مبارک...... یہ پرچھائیاں...... یہ تیرتے ہوئے خواب، بند ہوتی ہوئی آنکھیں، ریچھ کی طرح ہلتے ہوئے جسم...... یہ سب تجھے مبارک ہو۔"

میرا مالک اپنے خاص وقت پر آگیا ہے۔ اس کی آنکھیں نشے سے سوجی ہوئی ہیں۔ لمبے بال کانوں پر جھول رہے ہیں۔ ٹیری لین کا سوٹ اس کے گورے چہرے پر عجیب سی دمک پیدا کر رہا ہے۔ اس کا بدن دن بدن زیادہ بھاری ہوتا جاتا ہے۔ جب وہ پیرس سے آیا تھا اور اس نے مجھے نئی زندگی بخشی تھی تو اس کا بدن کتنا چھریرا تھا۔ آنکھوں میں کیسی ذہانت اور باتوں میں کیسی شوخی تھی۔

اب یہ سب کچھ نہیں ہے۔

یہ بڑا فکر مند آدمی ہے۔ بمبئی اور کلکتہ کی شاخوں کی فکر اسے گھن کی طرح کھائے جاتی ہے۔ اس کے دونوں بھائی اور پارٹنر بڑے عیاش نکلے۔ ایکٹرسوں کا چکر، فلمی دنیا کا چکر، اس طرح کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

بیوی بچوں کے لیے کتنا اچھا کمرہ ہے نئی کالونی میں۔ ان کے لیے زندگی کی تمام سہولتیں ہیں۔ ایک نہیں دو کاریں ہیں۔ بنگلے کے لان میں جھولے اور گلائیڈر ہیں۔ بیوی ایک نہیں، دو دو کلب کی ممبر ہے۔ گھر کا خیال پورے وقت وہ رکھتا ہے۔ اسے کہتے ہیں آئیڈیل وائف۔ شام...... ہاں شام کی بات اور ہے۔ وہ تو بزنس کا گر ہے۔ مجبوری ہے۔ شراب پیتا ہے۔ لیکن بہکتا نہیں۔ آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں، ہونٹ سوج جاتے ہیں اور آواز بھرا جاتی ہے، تو اس میں اس کا کیا قصور ہے اس کی زندگی کا بس ایک چھوٹا سا حصہ ہے جو اس کا اپنا ہے۔ ایسپریسو مشین ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ مارواڑی گروپ پبلک سیکٹر پر بحث کر کے کھسک چکا ہے۔ لیکن دو میزوں کے اوپر لٹکتے ہوئے پیلے اور سرخ شیڈ اب بھی روشن ہیں۔

میرا مالک پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اس کی کنپٹیاں سنسنا رہی ہیں۔ اب وہ لمحہ آگیا ہے جب میرا کردار بدل جاتا ہے۔ جب میں ہرجائی نہیں رہتا۔ جب میں اس کا ہو جاتا ہوں۔ اپنے مالک کا...... وہ ہوتا ہے اور اس کے پارٹنر کی بیوی ہوتی ہے۔ اس کا پارٹنر

کلکتے میں ہے لیکن اس کی بیوی میرے مالک کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ دونوں جب اوپر والے کمرے میں...... میرے دل کے سناٹے میں رات گئے ملتے ہیں تو دونوں ایک دوسرے سے ایک ہی سوال کرتے ہیں: ہم دونوں ایک دوسرے کو شروع ہی سے کیوں نہ مل گئے؟ تھوڑی دیر کے بعد مالک کو اپنی بیوی کی شروع شروع کی بات یاد آتی ہے ''اگر ہم ایک دوسرے کو نہ ملتے تو؟'' میرا مالک آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اپنے پارٹنر کی بیوی کے سینے میں منہ چھپالیتا ہے اور پوچھتا ہے۔

''یہ کب تک چلے گا؟ کب تک؟''

اس سوال کا جواب میرے پاس بھی نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب صرف وقت دے گا۔ وقت ہی واحد دانا ہے جس کی جھولی میں ہر سوال کا جواب ہے اور وقت خوب جانتا ہے کہ کس سوال کا جواب کب دینا چاہئے۔

میرا مالک کاؤنٹر کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی ٹانگیں لرزتی ہیں جس طرح طوفان میں درختوں کو جھرجھری آتی ہے۔

یہ کب جائیں گے؟ میجر کرسی سے اٹھ جاتا ہے۔

''کیا میں ان سے کہہ دوں۔ جایئے۔'' مالک کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ وہ دونوں کونوں کی طرف دیکھتا ہے۔ جہاں شیڈ روشن ہیں، اور تھکی ہوئی روشنی بکھیر رہے ہیں۔

ایک کونے میں سنجوگتا اور رنجیت ہیں۔ یہ دونوں آج تیسری بار آئے ہیں۔ میرے یہاں پناہ لینے۔ دوسری طرف نوجوان فوجی افسر ہے۔ وہ اپنی وردی میں بڑا بانکا اور سجیلا نظر آرہا ہے۔ اس کے بال گھنگھریالے ہیں۔ رنگ گندمی ہے۔ چہرے کے نقوش میں بڑا المناک سا تیکھا پن ہے۔

فوجی افسر تین گھنٹے سے بیٹھا لڑکی سے باتیں کر رہا ہے۔ لڑکی کا پتلا چہرہ رنگ بدل رہا ہے۔ اس دھند لکے میں اس کے چہرے کی تھکن دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک طرح کی شکست کا رنگ۔ سب کچھ کہہ بیٹھنے کی کیفیت۔ بڑی بڑی پیاسی اور خوفزدہ آنکھیں۔

پلکیں جتنی جلدی اٹھتی ہیں اتنی ہی جلدی جھک جاتی ہیں۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے ہیں۔ جسم میں بار بار جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔ میں اس لڑکی کے بھنچے ہوئے ہونٹوں اور اس نوجوان افسر کی بپھری ہوئی آنکھوں سے بہت ڈر رہا ہوں۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔نہ جانے......

دوسرے کونے میں شیڈ جلتا ہے۔ اور بجھتا ہے، بجھتا ہے اور جلتا ہے۔

"رنجیت بس بہت ہو گیا۔ یہ ڈرامہ ختم کرو۔ صبح سے تمہارے ساتھ ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے۔"

"تو کیا اب تم نہیں ملو گی؟" سنجوگتا کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔

وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتی ہے۔ "بھوکا! بیوقوف!" وہ پرس اٹھاتی ہے اور اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ چند قدم دروازے کی طرف بڑھتی ہے اور پلٹ کر دیکھتی ہے۔ رنجیت زندگی میں پہلی بار سنجیدگی سے فیصلہ کر رہا ہے۔ اس کا سر جھکا ہوا ہے۔ وہ فیصلہ کر چکا ہے۔ ایک ہی لمحے کے اندر خیالوں کے کئی ریلے اسے مخالف سمتوں میں بہالے جاتے ہیں۔ "یہ مجھ سے کھیل رہی ہے۔ بلی چوہے سے کھیل رہی ہے۔ میں چوہا ہوں۔ سچ مچ چوہا ہوں۔"

"Rat poison is the only way out."

وہ اٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ سنجوگتا کے پیچھے چلتا ہے۔ اب میں لابوہیم میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ سنجوگتا اور لابوہیم زندہ رہیں گے۔ لابوہیم وہی ہوگا۔ سنجوگتا وہی ہوگی۔ ہاں سنجوگتا کے ساتھ کوئی اور ہوگا۔ آس پاس بیٹھے ٹھیکیداروں کی بے ہودگیاں وہی ہوں گی۔ انٹلکچول اسی طرح اپنی بڑائی ہانکیں گے۔ ڈپلومیٹ اسی طرح اپنا اُلو سیدھا کرتے رہیں گے اور بین الاقوامی بیویوں کے کمر میں ہاتھ ڈالتے رہیں گے۔ نئی نئی فلموں پر بحثیں ہوں گی۔ کسی کی آنکھوں کی تعریف ہو گئی۔ کسی کے قدو قامت کا ذکر ہوگا۔ گلاس چھلکیں گے۔ آنکھیں چھلکیں گی۔ سب کچھ ہوگا۔ میں نہ ہوں گا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ کل میں نہ ہوں گا۔ چاند ہوگا اور میں نہ ہوں گا۔ ریٹ پوائزن کتنا

عجیب انجام۔" دروازہ کھلتا ہے اور الّو کی آنکھیں اب دکھائی نہیں دیتیں۔ کیونکہ اب صرف کاؤنٹر کے پاس منیجر کے سر پر روشنی کا ایک چھوٹا سا دائرہ ہے یا دور کونے میں، ہری بیلوں سے پرے، فوجی افسر کی میز پر روشنی برس رہی ہے۔

"تو کیا وہ سب جھوٹ تھا جو تم نے نینی تال میں کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا میں نے؟" لڑکی کی نرم آواز خود لڑکی کو خوفزدہ کر دیتی ہے۔

"دیکھو آج کی رات بڑی خطرناک رات ہے۔ فیصلے کی رات ہے۔ میں محاذ پر جا رہا ہوں۔ محاذ...... محاذ...... محاذ......"

"تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ جو کہو کہہ دوں؟"

"نہیں نہیں......وہ کہو جو تمہارا دل کہتا ہے۔"

"تو ایک بار پھر وہی دہراؤں جو میں تین گھنٹے سے کہتی آ رہی ہوں۔" لڑکی کی آنکھیں ستاروں بھرے آسمان کی طرح پھیل جاتی ہیں۔

"ہاں آخری بار......رات بڑی خطرناک ہے۔ یہ زندگی اور موت کی رات ہے۔ میں محاذ پر جا رہا ہوں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ موت سے نہیں۔ تمہاری باتیں سننے کے بعد میں زندگی سے ڈر رہا ہوں۔ زندگی سے، اپنے آپ سے۔"

فوجی افسر کا نوجوان چہرہ زرد ہے۔ اس کی آنکھیں بڑی خطرناک ہیں۔ خون کی پیاسی، محاذ پر جانے والی آنکھیں۔

"وہ جھوٹ نہیں تھا۔ لیکن فیلنگ بدل بھی سکتی ہے۔ یہ بات تم کیوں نہیں سمجھتے۔ میں تم کو خوش نہیں کر سکتی۔ میں نے کسی کو دھوکا نہیں دیا ہے۔ میں نے نینی تال میں سچ کہا تھا۔ اور اب اس وقت اس ریستوران میں بھی سچ کہہ رہی ہوں۔"

"مجھے یاد ہے۔ جھیل کے ستارے تیر رہے تھے۔ درختوں کے دھندلے سایے ہمیں بلا رہے تھے اور تم میرے کانوں میں کہہ رہی تھیں...... "اگر ہم دونوں اس وقت ستاروں بھری جھیل میں ڈوب جائیں تو......" میں نے تمہارے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور کہا تھا۔ ہم جئیں گے اسی جھیل کی طرح ستاروں کی چھاؤں میں! کتنی رومانی باتیں

تھیں۔ میں فوجی آدمی ہوں لیکن مجھے بھی لگ رہا تھا کہ میں شاعر ہوں۔ میں گنگنا سکتا ہوں۔ گا سکتا ہوں۔"

"لیکن وہ سب ختم ہو چکا ہے۔" لڑکی زخمی پرندے کی طرح چاروں طرف دیکھتی ہے۔

"بھول جاؤ۔ نئی زندگی شروع کرو۔"

"نئی زندگی؟" نوجوان افسر دانت پیس کر کہتا ہے "کیونکہ فیلنگ بدل گئی ہے۔" لڑکی سر ہلاتی ہے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں۔

دور کاؤنٹر کے پاس مالک بپھر رہا ہے۔ اس کا ڈرائیور پارٹنر کی بیوی کو لے کر نہیں لوٹا۔ وہ سر دھنتا ہے۔ فوجی افسر سے کہنا ہی پڑے گا۔ "ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔"

فوجی افسر اٹھتا ہے "اچھا چلیں۔" وہ کرسی ہٹاتا ہے لڑکی کے لیے جھک کر راستہ بناتا ہے۔ لڑکی خوفزدہ اور محبت بھری آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھتی ہے۔ کوئی طاقت اسے اٹھنے سے روک رہی ہے۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دھندلی پرچھائیوں کو دیکھتی ہے۔ "میں نہیں جانتی مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں اس سے نہیں تو کس سے محبت کرتی ہوں۔ یہ محاذ پر جا رہا ہے...... بیچارا، محبت کا مارا، شہید۔ کل میں ہوائی اڈے پر اس سے ملوں گی اور بتا دوں گی۔ سب بتا دوں گی۔ میں تیواری کے عشق میں گرفتار نہیں ہوں۔ میں لندن سے لوٹ کر آؤں گی۔ محاذ پر کچھ نہ ہو۔ کاش محاذ پر کچھ نہ ہو۔"

فوجی افسر اب بھی سر جھکائے اسے اٹھنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ لڑکی اٹھتی ہے۔ اس کا ترشا ہوا، گدرایا ہوا جسم دیکھ کر تو میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ فوجی افسر کے دل کو...... نینی تال کی جھیل اور ستاروں بھرے آسمان کو......

لڑکی فوجی افسر کے بازو کو چھوتے ہوئے اس سے آگے بڑھتی ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے آگے نکلتی ہے۔ فوجی افسر وہیں کھڑا ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے خول سے ریوالور نکالتا ہے، اور ایک، دو تین، تین گولیاں، لڑکی کی گردن، شانے اور کمر میں ٹھنڈی کر دیتا ہے، تڑاخ، تڑاخ، تڑاخ...... اور پھر سناٹا۔

میں خاموش ہوں۔ میں سب دیکھ رہا ہوں۔ لڑکی تلملاتی ہے۔ مرنا چاہتی ہے۔ لیکن چکرا کر اسی کرسی پر گرتی ہے جس پر دوپہر کو سردارنی بیٹھی چار کورس کا کھانا کھا رہی تھی۔ جس کے سینڈل کے نوک کے نیچے ایک عورت کی ہڈیاں دفن ہیں۔ بس چند فیٹ نیچے......

مالک پیچھے ہٹتا ہے۔ آگے بڑھتا ہے۔ چکراتا ہے۔ منیجر دروازہ کھول کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ سارے بیرے اور کچن والے ایسپریسو مشین کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہیں آتا تو ہنگیر ئن نہیں آتا۔ وہ ایسی تڑاخ تڑاخ بہت سن چکا ہے۔ یکایک مالک چیختا ہے۔

"روشنی! روشنی!"

کوئی سوئچ بورڈ کی طرف دوڑ رہا ہے۔

اور میں سکتے اور اضطراب کے اس ایک لمحے میں دیکھتا ہوں۔ نوجوان آہستہ آہستہ اپنا ریوالور اپنی کنپٹی پر رکھتا ہے۔

اس کی نال سے اب تک دھواں نکل رہا ہے۔ میرا دل پکارتا ہے اس دیوانے کو روکو لیکن میں جانتا ہوں۔ یہ ہو کر رہے گا۔ میں آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ تڑاخ۔!

میرا مالک اور سب اتنے خوف زدہ اور گھبرائے ہوئے ہیں کہ انہیں اس تڑاخ کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ سب لڑکی کی لاش پر جھکے ہوئے ہیں۔ لڑکی کی ہتھیلیاں کھلی ہوئی ہیں اور آنکھیں بھی۔ بالوں کے کانٹے فرش پر بکھر گئے ہیں۔ پرس مالک کے قدموں میں پڑا ہوا ہے۔ لڑکی کے ہونٹ مسکرا رہے ہیں۔ پوری شام میں پہلی بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی ہے۔ یہ میں جانتا ہوں اور کوئی نہیں جانتا۔

رات، پولیس، گواہیاں، لاشیں، خون!

آسمان پر صبح کے ستارے جھلملا رہے ہیں۔ بیک یارڈ میں سارے بیرے، ڈرائیور، مستری، کاریگر جاگ رہے ہیں۔

سب چپ ہیں، رات کی طرح۔

دروازے پر پولیس کا پہرہ ہے اور اندر مالک آسیب کی طرح فرش پر بھٹک رہا ہے۔

"صاحب میں سارے میں ڈھونڈ آیا۔ میم صاحب کہیں نہیں ہیں۔" ڈرائیور کانپ گیا۔

"What the hell!....."مالک پیر پٹکتا ہے۔

آسمان سے ستاروں کی راکھ برس رہی ہے۔اور چھجے پر ہنگیر ٹن گارہا ہے۔

میں نے بہت دیکھا ہے خون،

دلوں کا، محبتوں کا!

خوابوں کا خون!

○○

کھپریل

(۱۴)

زرد چاندنی آہستہ آہستہ سانس لینے لگی۔ سلیم خاں نے اپنے ہونٹ کھول دیئے اور اپنے سینے کے طلاطم کو دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ دور سے گوالوں کے برہاگانے کی آواز آئی۔

"کنکر چن چن محل بنیئے ہو او او"

اس کا دل غم کی چاندنی میں ڈوب گیا، جس کا رنگ قمرن کے اداس اور فریادی گول چہرے کی طرح زرد تھا۔

آخر گھبرا کر اس نے گنگناتا شروع کر دیا۔ لیکن بھلا آواز کے ان کمزور تنکوں میں غم اور محرومی کے چڑھے ہوئے دریا کو روکنے کی سکت کہاں تھی۔ اس نے کپکپاتے ہونٹ کو خشک زبان سے چومتے ہوئے کھپریل کی طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے ایک موٹی سی گالی نکلی۔ "سور کے بچے نے حرام خوروں کا پہرہ بٹھا رکھا ہوگا۔" لیکن یہ الّو کی پٹھی قمرن بھی واقعی الّو کی پٹھی ہے۔ خالی خولی محبت کو لے کر چاٹا کرو۔ اتنا نہیں جانتی خالی آگ سے کام نہیں چلتا۔ حقہ پینا ہے تو چلم میں تمباکو بھرنا پڑتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں قمرن کے باپ ملک رجب علی کی تصویر پھر گئی۔ جس کے آگے حقے کی چلم اس کے اپنے دل کی طرح دہک رہی تھی اور منہ سے پیچ در پیچ دھواں نکل رہا تھا۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ درختوں کے پتے جھڑ کر اس کے قدموں میں آرہے۔ برہا گانے والے مست گوالوں نے پھر ایک ہانک لگائی، اور اس کے ساتھ ہی خنکی

بڑھ، گئی قبرستان میں پختہ قبروں کا رنگ اور سفید ہو گیا اور ان کے کتبے کے پتھر اکڑوں بیٹھے بوڑھے فقیر نظر آنے لگے۔ سلیم خاں کو ایک جھرجھری سی آئی ہوا کے جھونکے اس کے سفید کرتے سے عطر حنائی اور بالوں سے آملا تیل کی خوشبو چرا لے گئے۔ اس کے اپنے بدن سے کافور کی بو آنے لگی اور جب اس نے قبرستان کی طرف دیکھا تو اس کا دل دہل گیا۔ ایک سیاہ بھوت جھومتا جھامتا اور خشک پتوں کو چرمراتا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

لحیم شحیم پیپل کے ٹہنے کے پاس آکر بھوت رک گیا۔ سلیم خاں کے پاؤں نو نو من کے ہو گئے اور وہ بھاگ نہ سکا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"سلیم خاں۔ میں تو بال بال بچی۔"

"قمرن کی بچی!" سلیم خاں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"باغ کی چار دیواری پھاند کر دوسری طرف سے قبرستان......" اس کی سانس پھول رہی تھی...... "تمہاری جان قسم کتا اتنا بھونکا اتنا بھونکا...... روٹھے تو نہیں؟ دیکھو ہرن کے کباب لائی ہوں۔"

سلیم خاں کباب کھانے لگا اور قمرن نے اپنا سر اس کے چوڑے چکلے سینے پر رکھ دیا۔ سلیم خاں نے جب قمرن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو مردہ سی زرد چاندنی میں جیسے دھکتی ہوئی سنہری رنگت کا خون دوڑ گیا۔ سلیم خاں کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے کباب کے روغن سے چپچپاتی ہوئی ہتھیلی کو کرتے کے دامن سے صاف کرتے ہوئے قمرن کے کان میں کہا "گوالوں کا گیت سن رہی ہو میں تو اپنی شادی پر ان گوالوں سے برہا گواؤں گا۔"

"پگلے...... بدھو" قمرن کا دل دھک سے رہ گیا۔ "قبرستان کی طرف سے کوئی آرہا ہے...... بھاگ جاؤ۔"

"نہیں میں نہیں بھاگتا۔"

"نہ بھاگو تو میرا مرا منہ دیکھو...... سلیم خدا کے لیے، میں بدنام"

سلیم خاں درختوں کی آڑ میں غائب ہو گیا۔ سوکھے پتوں کی چرمراہٹ ایک طرف دور ہوتی گئی اور دوسری طرف قریب۔

☆☆☆

لیکن یہ حادثہ پرانا ہو چکا تھا۔ کتنی مرتبہ چاندنی راتیں آئیں، جاڑا گیا، پت جھڑ کے بعد جھکڑ کا موسم آیا، گرد و غبار کا طوفان اٹھ گیا۔ اور اب تو آسمان میں بادلوں کا ڈیرا تھا اور گاؤں سے باہر ہر طرف جل تھل ہو رہا تھا۔ جھکے جھلے کھجور کے پیڑ اور آسمان سے باتیں کرتے ہوئے تاڑ تر و تازہ نظر آ رہے تھے اور ڈھلوان کی طرف برساتی نالے اچھلتے کودتے دوڑ رہے تھے۔

اکیلا سلیم خاں خاموش تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی آخری چاندنی رات بسی ہوئی تھی جب قمرن نے اس کے سینے پر سر رکھ کر مہندی بھرے ہاتھوں سے اس کو ہرن کے کباب کھلائے تھے۔

اب وہ لوگوں کے چھیڑنے پر گالیاں بھی نہیں بکتا تھا، البتہ اس کی آواز رندھ جاتی تھی اور اس کی آنکھوں سے ایسا ضرور معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی جلتا ہوا نوالہ گلے میں اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔

آگ کی گیند پہاڑوں کے پیچھے چھپتی چلی جا رہی تھی۔ روپن میں کھوئی ہوئی میلی کچیلی عورتوں کے ہاتھ رک گئے اور انہوں نے دن بھر کی تھکن کو اپنی پیشانی سے نچوڑ کر اپنی کمر سیدھی کی۔

ابھی سلیم خاں کی مٹھی میں نرم و نازک پنیریوں کی ایک گانٹھ موجود تھی۔ اس نے جھکے جھکے محسوس کیا کہ اس پاس کے ٹوپروں میں لوگوں کے ہاتھ رک گئے ہیں۔ درد بھرے گیت بھی خاموشی میں ڈوب گئے تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے دیر کی تو وہ سب سے پیچھے رہ جائے گا......اور اب کے دھان کی فصل گدرائی نہیں تو بڑی شامت آئے گی۔ اس کا نیلا نیکر مٹی کے رنگ کا ہو گیا تھا اور ٹانگیں پنڈلیوں تک مٹیالے پانی میں دھنسی ہوئی تھیں۔

آواز آئی "سورج چھپ گیا بھائی۔ سر نہوڑانے سے کا ہوئی ہے" گماشتے کی آواز میں حسب معمول تمسخر تھا "شہری بابو لوگ کھیتی کریں۔ ہوں۔ ایی بیل تو ضرور منڈھے چڑھے۔ ہوں۔"

سلیم خاں نے سنی ان سنی کردی اور تیزی سے پنیریوں کو کھیت کی مٹی میں پیوست کرنے لگا جیسے کوئی بڑی مشتاق عورت ریشمی کپڑے پر سوئی چلا رہی ہو۔ "ہوں بس چلے تو یہ سب مجھے کھا جائیں...... لیکن خیر......" دیکھتے دیکھتے پنیریوں کی گانٹھ غائب ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے دونوں ہاتھ گدلے پانی میں ڈالے رہا۔ اس کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں ٹپکیں اور بلبلا بنائے بغیر پانی کے اندر تحلیل ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا تو شام کا سرمئی رنگ گہرا ہو چکا تھا اور روپن کرنے والے مرد اور عورتیں کھیتوں سے نکل کر گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ وہ اسے بہت ہی خیالی اور دھندلے نظر آئے۔ مینڈک زور زور سے ٹرا رہے تھے اور دور درختوں پر چڑیوں کی چہچہاہٹ خاموشی میں تالیوں کی طرح گونج رہی تھی۔ ایک بیل گاڑی قریب ہی کیچڑ میں پھنس گئی تھی۔ تین چار آدمی اس کے پہیوں کو گھمانے کے لیے زور لگا رہے تھے اور جوش و خروش کے ساتھ "ہے مارا ہے مارا" کا نعرہ لگا رہے تھے۔

سلیم خاں کو یہ آواز شام کی گونجتی ہوئی تنہائی میں عجیب سی محسوس ہوئی اور وہ پانی سے نکل کر بوڑھے پیپل کے تنے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے، اور اس کے جالی دار بنیان سے اس کے سینے کے بھیگے ہوئے گھنے بال باہر جھانک رہے تھے۔ "میں اسی طرح اس گدلے پانی میں اپنا خون پسینہ ملا کر دھان اگاؤں گا اور دیکھوں گا یہ کھپریل کی اونچی ناک کب تک مجھے اپنی شیریں سے جدا رکھتی ہے! سالے الو کے پٹھے!" اندھیرا ہو چکا تھا اور گاؤں میں چراغ ٹمٹمانے لگے تھے۔ اس کے دل میں یادوں کے ان گنت چھوٹے چھوٹے چراغ جل اٹھے اور ان کی لہراتی ہوئی لویں اس کے دماغ کو گرمانے لگیں۔

بڑے پیر کے پچھلے عرس سے دو تین دن پہلے وہ کلکتے سے دو برس بعد واپس لوٹا تو گاؤں والوں نے بڑی سرد مہری سے اس کا خیر مقدم کیا۔ ”جب باپ مر گیا تو لونڈا اس کی ملکیت پر قبضہ جمانے آن دھمکا۔“ وہ خاموشی سے یہ سب سنتا رہا۔ ”گیڈر صاحب شہر گئے تھے۔ بھائیو حاجی گھر لوٹ آیا۔“ ”آخر میں تان ٹوٹتی“ باپ نے جو زمین چھوڑی ہے اس کو اونے پونے بیچ ڈالے گا۔ اور نکل جائے گا یہاں سے آوارگی کرنے۔“

لیکن وہ ان تمام تلخ اور بیزاری سے بھری ہوئی پیش گوئیوں سے بے پرواروز شام کے وقت اپنے باپ کی قبر پر جاتا، خاموش کھڑا رہتا اور رات گئے اپنے گھر واپس آجاتا۔ اس کی جوان بہنیں اس کا کھانا لاتیں اور لالٹین کی بتی تیز کرتیں۔ وہ جھنجھلاتا ”بھئی بتی تیز نہ کرو۔“ بتی پھر کم ہو جاتی۔ ”بھیا اتنی مدھم روشنی میں کھانا کیسے کھاؤ گے؟“ وہ رکابی سامنے رکھے کچھ سوچنے لگتا۔ اس کے باپ نے آخری بار اس کے بھاگنے سے پہلے کھانے کی رکابی اس کے آگے سے اٹھالی تھی: ”تو کھیت میں کام نہیں کرے گا تو کھائے گا بھی نہیں۔“

وہ غصے میں بھر کر کھڑا ہو گیا تھا: ”میں تو پڑھوں گا۔“

”چپ،! کھپریل کے چھوکروں نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ مڈل پاس ہو گیا۔ بس بہت ہو گیا۔ آسمان پر جائے گا تو اس زمین کا کیا ہو گا جو سات پشتوں سے ہمیں اپنا خون پلاتی رہی ہے۔“ اس دن رحیم خاں نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالیا تھا۔ ادھر رحیم خاں نے کھانسنا شروع کیا اور ادھر سلیم خاں گھر سے نکل راتوں رات اسٹیشن کی طرف چل دیا، جو وہاں سے کوسوں دور تھا۔

سلیم خاں ان یادوں میں کھویا ہوا جب گھر پہنچا تو اس کی کوٹھری اندھیری تھی۔ اس کی آہٹ پاکر سلیم خاں کی بہن سکینہ لالٹین لئے لپکتی ہوئی آئی۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا بھی تھا۔ سلیم خاں کو صحن میں اندھیرا نظر آیا۔ ”سکینہ گھر میں اندھیرا کیوں ہے۔“

”گھر میں مٹی کا تیل نہیں تھا...... تم یہ لالٹین رکھو ادھر کام......“

سلیم خاں نے زبردستی ڈانٹ کر لالٹین واپس کردی۔ کنوئیں پر سے نہا کر جب وہ لوٹا تو اس کو اپنی کوٹھری کے دروازے پر موذن صاحب کا چھوکرا نظر آیا۔ لڑکے نے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پرزہ تھمایا اور رفو چکر ہو گیا۔

سلیم خاں کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی بہن سے لالٹین منگوائی، اور جب وہ اندر چلی گئی تو اس نے کوٹھری کا دروازہ آہستہ سے بند کیا اور وہ پرزہ پڑھنے لگا جو اب تک اس کی نم مٹھی میں مڑا پڑا تھا۔

"پرسوں بڑے پیر کی عرس کی رات ہے۔ کھنڈر کے پچھواڑے میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

اس کی رگوں میں خون جل اٹھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور گنگناتا ہوا گاؤں سے باہر ان کھیتوں کی طرف نکل گیا جہاں پانی میں بھیگی ہوئی مٹی مہک رہی تھی اور جھینگر بول رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ چاندنی کھیتوں پر پھیلی ہوئی تھی اور دور درختوں کے جھنڈ میں ہوا سرسرا رہی تھی۔

کام کے بوجھ تلے چند دن سے اس کے دل میں آگ دب گئی تھی، لیکن جب اس نے شام کے وقت آخری پنیریاں بھی کھیت کو سونپ دیں تو اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل ویران ہے۔ لیکن جب سے اسے قمرن کا پرزہ ملا تھا اس کے دل میں شہنایاں بج رہی تھیں۔

زندگی کیسے کیسے چھب دکھاتی ہے۔ وہ دیر تک پیپل کے پیڑ تلے کھڑا، کھیتوں سے اٹھتی ہوئی مٹی کی سوندھی مہک اور فضا کی نمی کو اپنے دل میں اتارتا رہا۔

ابھی پچھلے برس جب وہ غمزدہ سا، ہارے ہوئے سپاہی کی طرح اپنے گاؤں لوٹا تو تیسرے دن ہی پھر اپنے ہم عمر نوجوانوں میں گھل مل گیا تھا۔ اسکول کے چھوکروں نے اسے خوب خوب قصے سنائے۔ یہ قصے زیادہ تر کھپریل کے متعلق تھے۔ وہ خود جانتا تھا کھپریل اور پٹھان ٹولے کے درمیان صدیوں پرانی ایک دیوار کھڑی ہے۔ یہ دیوار تعصب اور نفرت سے چنی گئی تھی۔ کھپریل میں زیادہ تر گھر کھپراپوش تھے۔ اور پٹھان

ٹولے میں، بھوسن کے مچھیروں کے یہاں کہیں کہیں کھپریل کے چھپر ضرور نظر آتے تھے، لیکن یہ کھپریل کے جلال اور برتری کے خلاف ایک خاموش گستاخی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور کھپریل والے اسے نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کھپریل کے سیّدوں سے سلیم خاں اپنے لڑکپن میں بھی کبھی مرعوب نہیں ہوا تھا۔ جب کبھی موقع ملتا اور خم ٹھوکنے کی نوبت آتی تو وہ سیّد زادوں کے سینے پر چڑھ کر، زبانی طور پر ہی سہی، ان کی بہنوں کی مکھن اور بالائی جیسی سفید اور ملائم عزت دن دھاڑے اتار لیتا۔ حالانکہ اس کے بعد اس کے باپ، رحیم خاں کی طرف سے اس کو بڑی بڑی تکلیف دہ سزائیں ملتی تھیں، جن میں مرغا بننا بھی شامل تھا۔ ہاں اس نے ببول کے کانٹوں پر لوٹنا قبول کیا مگر منہ کا تھوکا کبھی چاٹ کر نہیں دیا۔

گاؤں کے لونڈے اس سے شہر کی لونڈیوں کے قصے سنانے کو کہتے۔ وہ بے چارہ اپنے لمبے بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹک کر کوئی رنگین قصہ سوچتا۔ اس کے تانبے جیسے چہرے پر گھبراہٹ پیدا ہو جاتی اور اس کی چھوٹی اور عقابی آنکھیں چمکنے لگتیں، لیکن اس کی جوانی ایسے خوبصورت پھولوں سے دور دور تک خالی تھی۔ وہاں بھوک پیاس، محرومی اور بیروزگاری کی دھول اڑ رہی تھی۔ آخر اپنے تصور کے بانجھ پن سے تنگ آ کر وہ کوئی فلمی قصہ سنا دیتا۔ اور حیران آنکھوں سے گھورنے والے، اس کے پاس بیٹھے، جنم جنم کے پیاسے دیہاتی لونڈے اپنی سانس قابو میں کرنے کے جتن کرتے۔ وہ اس کو رقابت اور حسرت کی نظر سے دیکھتے اور پھر اپنی من گھڑت کہانیاں سناتے جن کے ڈور کا دوسرا سرا کھپریل کی کسی نہ کسی سیّد زادی تک پہنچتا۔ یہ سیّد زادی عام طور پر پریوں کی طرح نازک اور دلربا ہوتی۔ بات کرتے اس کے منہ سے پھول جھڑتے، چلتی تو نقشِ پا میں پھولوں کے چراغ جل جاتے اور اس کی انگڑائیوں سے آسمان پر پورب پچھم تک دھنک کی رنگین طنابیں لہرانے لگتیں۔ اور جب پھولوں کی جنوں انگیز مہک کا طوفان ان پیاسے نوجوانوں کو مدہوش کرنے لگتا تو اچانک طنابیں ٹوٹ جاتیں پھولوں کی پنکھڑیاں نچے ہوئے پروں کی طرح اڑنے لگتیں......

تب ایسا ہوتا کہ نگاہوں میں بسا ہوا سارا رنگ خوف زرد تتلیوں کی طرح بکھر جاتا۔
"یارو، کبھی شہر جاؤ تو معلوم ہوگا کہ یہ کتنا خوفناک دیو ہے۔" سلیم خاں کی اس بات سے سب سہم جاتے، اور کہتے: "سلیم خاں تو پھر تم آخر بھاگ کر شہر کیوں چلے گئے تھے؟"
"یہی میں خود اپنے آپ سے پوچھتا ہوں؟ پتہ نہیں چلتا کیوں؟"
بڑے پیر کے پچھلے عرس کی رات، حسب دستور پورا گاؤں نئے کپڑوں، رنگا رنگ اوڑھنیوں، لوبان کی خوشبوؤں، کاجل کی لکیروں، دوڑتے ہوئے ہرنوں، منتوں اور مرادوں کی دعاؤں اور قوالیوں اور فاتحہ خوانیوں کی فضا میں گھری ہوئی بڑی پراسرار اور مقدس معلوم ہو رہی تھی۔
سلیم خاں بھی، سفید ململ کے کرتے پر گردن میں ریشمی رومال باندھے ہوئے، بڑے تیکھے انداز میں محفل کے اُس گوشے میں بیٹھا تھا جہاں گاؤں کے، خاص طور پر کھپریل کے نوجوان جمع تھے...... دوسری طرف برائے نام پردوں کے پیچھے گاؤں کی لڑکیاں چہک رہی تھیں۔ جب قوال نے "کالی کملی والے" کی تان اڑائی تو سلیم خان کی آنکھیں اٹھتے ہوئے پردے کے پیچھے قمرن کو دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔
"کھپریل کی سب سے پٹاخہ پری ہے یہ خدا کی قسم" کسی پٹھان چھوکرے نے سلیم خاں کی کمر میں ٹہوکا لگاتے ہوئے کہا۔
"پٹھان ٹولے میں کون سا پٹاخوں کا قحط ہے میری جان!" کسی سیّد زادے کو جوش آگیا۔
"لڑتے کیوں ہو چھوکرو۔ قوالی کا مزا کرکرا ہوا جا رہا ہے۔"
"کالی کملی والے تم پر لاکھوں سلام۔"
قمرن نے ایک شوخ سی لڑکی کے کان میں منہ ڈال کر کچھ کہا، اور سلیم نے دیکھا کہ وہ سب اس کی جانب دیکھ کر دانت نکال رہی ہیں۔ اور اس نے محسوس کیا کہ خود اسی کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ اس نے فوراً غرا کر دیکھا۔ اس پر قمرن نے اپنی سرخ اوڑھنی دانت تلے دباتے ہوئے سر جھکا لیا۔ سلیم خاں کو بڑی گھبراہٹ ہوئی...... کیا میں

اتنا احمق نظر آتا ہوں؟ اس نے رومال گلے سے کھول لیا اور پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگا۔

دوسرے دن صبح اکاش کی نیلاہٹ دھلی دھلائی چمک رہی تھی۔ سلیم خاں کھپریل اور پٹھان ٹولے کے درمیان گلی میں گھستا تھا اور اوپر نیلے آسمان کی ایک ہلالی قاش کو گھورتے ہوئے واپس آجاتا تھا۔

''لیکن میں تو شہر بھاگنے سے پہلے بھی سید رجب علی کے گھر آتا جاتا تھا۔ اس میں دل کے دھڑکنے کی کیا بات ہے؟ ڈرپوک!''

آخر گلی سے گزر کر وہ سید رجب علی کی حویلی کے چھوٹے دروازے پر پہنچ گیا۔

''اجی رحیم خاں مرحوم کا بیٹا سلیم خاں بڑی بیگم کو سلام کرنے آیا ہے۔''

بڑی بیگم کے سامنے سلیم خاں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ بڑی بیگم بڑا سا مراد آبادی پاندان سامنے رکھے سروتے سے چھالیا کتر رہی تھیں۔ ان کے تنگ اور اونچے شلوکے سے میدے کی طرح سفید اور بھر بھراتی ہوئی موٹی تہہ دار توند جھانک رہی تھی۔

''ارے تو تو بڑا سعادت مند ہو گیا ہے۔ رحیم خاں کے اچھے لچھن اپنا لیے تو نے۔ واہ شاباش۔ ورنہ پٹھان ٹولے کے چھوکرے ہائے کاہے کو کھپریل کا رخ کریں۔ وہ تو ہمارا نمک کھائیں اور ہمارے ہی منہ پر تھو تھو کریں۔ اچھا چھوکرے بتا کیا تو اپنا کھیت سنبھال لے گا۔ اور تیری بہنیں بھی تو جوان دھری ہیں۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔ میں تو کہوں زمین کے جنجال سے نکل کر روپیہ سمیٹ اور ان کے ہاتھ پیلے کر اور کسی کے ہاتھ میں دے دے ان کا ہاتھ۔''

بڑی بیگم کی بکواس سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ لیکن چپ چاپ سب کچھ سن رہا تھا اور کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ شاید کہیں وہ اپنے دانتوں تلے اوڑھنی دبائے نظر آجائے۔

چھت پر ننگے پاؤں کسی کے دوڑنے کی آواز آئی۔ قمرن جھانک رہی تھی ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔ بھیگے بالوں میں جھانکتی ہوئی آنکھیں مچھلیوں کی طرح تڑپ رہی تھیں۔

''کون ہے اماں؟'' اس نے آواز لگائی۔ اس کا گندمی مکھڑا اور بھی سنہرا ہو گیا تھا۔

"وہ اپنے رحیم خاں کا بیٹا ہے۔ بڑا بدل گیا ہے۔ اس سے پردہ کیا! آ جاؤ۔ اس دن تھوڑی دیر بیٹھ کر سلیم واپس آ گیا۔ وہ بڑی بیگم کی تمام باتیں بھلا چکا تھا۔ اسے تو بھیگے ہوئے بال اور چمکتی ہوئی آنکھیں بار بار یاد آ رہی تھیں۔

اس دن اس نے پہلی بار گھر میں اپنی بہنوں سے چہک چہک کر بات چیت کی اور ان کو دلاسا دیا۔ "گھبراؤ نہیں میں یوں چٹکیوں میں کھیت کا کام سنبھال لوں گا۔ ہاں اس میں رکھا کیا ہے۔"

سہ پہر کے بعد اس نے نہا کر اپنے ٹین کے بکس کی تلاشی لی اور اس میں سے کلکتے کے وہ تحفے نکالے جو اس کی دولت تھے...... ایک بڑا سا رومال، ایک چھوٹا سا ٹوٹا ہوا آئینہ جس کی پشت پر ایک عورت کی نیلی تصویر تھی، اور فلمی گانوں کے ان گنت کتابچے، ایک خالی شیشی عطر کی اور گھڑی کا فیتہ۔ اس نے ایک کتاب جیب میں رکھی اور گوالوں کے باگے پر چلا گیا۔ وہ شام تک اپنے بیل لے کر واپس آ گیا۔ بیلوں کو کھونٹے سے باندھنے کے بعد اس نے قبرستان کے پاس املی کے درخت پر بیٹھ کر دو تین فلمی گیتوں کی تانیں اڑائیں۔ اور سید رجب علی کی حویلی والی گلی سے کھانستے ہوئے دو تین بار گزرا۔ لیکن وہ چاند کہیں نظر نہ آیا! آخر کھپریل کی ایک سید زادی کے سلونے خواب دیکھتا ہوا وہ اپنی کٹیا میں آ بیٹھا۔

اس کی بہنیں اس کو اس طرح چہکتا دیکھ کر مسکرائیں، اور رات کے وقت بیٹھ کر پہلی بار اس سے کلکتے کی کہانیاں سنانے کے لیے اصرار کرنے لگیں۔ اس نے بات ہی بات میں سید رجب علی کا قصہ چھیڑ دیا۔ سکینہ نے ہنس کر کہا۔ "ان کے ہاں تو ہمارا بہت آنا جانا ہے۔ قمرن بڑی اچھی ہے۔"

"ہوں قمرن بڑی اچھی ہے۔ آخر کھپریل کی ہے۔ ناک تو اس کی بھی ساتویں طبق پر ہو گی۔" سلیم خاں نے کریدنے کے لیے پوچھا۔

"تم سے تو کم ہی اونچی ہے اس کی ناک۔ تم کھپریل والوں سے ملتے ہو۔"

ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر سلیم خاں کو معلوم ہو گیا کہ جو بات اس نے فلمی انداز

یں شروع کی تھی اس کی جڑیں دل میں ذرا گہری اور مضبوط ہو گئی ہیں۔ اس بیچ میں تین چار بار قمرن سے اس کی بات چیت بھی ہو چکی تھی۔ وہ تو اس کے فلمی گانوں کی کتابیں بھی اٹھا لے گئی تھی، اور چھپ چھپ کر سکینہ کے ہاتھ اپنی دو مثنویاں بھی اس کے پڑھنے کو بجھوائی تھیں۔ سلیم خاں کو سحر البیان میں بڑا لطف آیا۔ لیکن زہر عشق کی شکست اور خودکشی کچھ دل کو لگی نہیں۔ اب تو وہ خواب بھی دیکھنے لگا تھا۔ وہ شہزادہ بنا کھلی چھت پر لیٹا ہے۔ قمرن پری سنہرے پروں کو ہوا میں آہستہ آہستہ ہلاتی ہوئی اڑتی ہے، اور اسے اپنے اڑن کھٹولے پر بٹھا کر آسمان کے چمکیلے رنگوں میں کھو جاتی ہے۔ چاند تارے پھول بادل، سب سات رنگوں کے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنا ٹوٹا ہوا آئینہ دیکھتا تو اس کی گھبراہٹ کی کوئی حد نہ رہتی۔ اس کا منہ کتنا اترا اترا نظر آتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے رخساروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں اور آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ''اچھے شہزادے ہو بیٹے۔ کنگال کہیں کے!''

گھر کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ بہنوں کے پاس کپڑوں کی کمی تھی اور بھائی کھلنڈرا ہو گیا تھا۔ سید رجب علی خاں کا قرضہ چکانے کے لیے سلیم خاں کو بہت سی چیزیں بیچنی پڑی تھیں۔ لیکن اس کو یقین تھا کہ آئندہ فصل کے بعد یہ ساری چیزیں مہیا کر لے گا۔

پھر ایک دن اس کے دوست رمضانی نے کہا ''سلیم خاں تو کس چکر میں ہے۔ کھپریل کے چکر کیوں لگاتا ہے۔ تو جانتا ہے کھپریل اور پٹھان ٹولے میں جنم جنم کی دشمنی ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔ لیکن کیا یہ دشمنی دور نہیں ہو سکتی؟''

''سانپ اور نیولے کی دوستی ہوئی ہے کبھی؟''

جب رمضانی چلا گیا تو سلیم خاں کو شام کے سناٹے میں اپنے دل کی آواز سنائی دی...... کل ہی سید رجب علی نے اس سے کہا تھا...... ''سلیم خاں تم پر بڑا بوجھ ہے۔ اکیلے تمہاری زمین تم سے سنبھلے گی نہیں۔ کہو تو میں اس کا انتظام کر دوں۔ اور تم ابھی

کچھ دن یہاں میری کچہری میں کام کرو۔ ذرا ڈھنگ آجائے تو پھر میں تم کو اچھے کام سے لگادوں گا"

تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھ کر وہ وہاں سے موقع پاتے ہی اٹھ کر چلا آیا تھا۔ گھر میں داخل ہونے تک وہ یہی سوچتا رہا کہ سید رجب علی کی نیت بخیر نہیں معلوم ہوتی۔ وہ اس کا گھر جلا کر ہاتھ تاپنا چاہتا ہے۔ ایک زمانے سے اس کا یہی دستور تھا۔ کھپریل کی آن بان اسی کے دم سے تھی۔ لیکن میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں۔ پٹھان ٹولے میں گدھے نہیں بستے۔"

جاتے ہی اس نے بہن کو پکارا "لال ٹین کہاں ہے؟" اس کی آواز میں کچھ جھنجھناہٹ تھی۔

"ابھی لاتی ہوں۔" اس کی چھوٹی بہن سلمٰی...... لالٹین لے کر آئی: "بھیا وہ قمرن باجی آئی ہوئی ہیں...... ذرا اسی لیے لالٹین......"

"اچھا تو لے جاؤ...... میں کہتا ہوں بس لے جاؤ لالٹین" اس کی آواز میں تھرتھراہٹ پیدا ہوگئی تھی۔

اندھیری کھوٹھری سے اس نے جھانک کر دیکھا سلمٰی، سکینہ اور قمرن کسی کتاب پر جھکی ہوئی تھیں۔ جلدی جلدی ورق الٹے جا رہے تھے۔ اور رائے زنی ہو رہی تھی۔ قمرن کے چہرے پر غضب کی سنجیدگی تھی۔

"نہیں بالکل گدھی تھی لڑکی،" قمرن کی آواز ابھری۔ "میں ہوتی اس کی جگہ تو طبیعت ہری کردیتی سب کی۔"

سلیم خاں کا تجسس بڑھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ پلٹن کس پر گرم ہو رہی ہے۔ سلمٰی نے دھیمی آواز میں تقریباً بین کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو کہتی ہوں ٹھیک کیا غریب نے زہر کھالیا۔"

"نہیں غریب وریب کچھ نہیں، میری جوتی۔ دل اٹنا سا گورے کا اور چلی تھیں کسی کے گلے کا ہار بننے۔" قمرن کی آواز میں غصے کی تھرتھراہٹ تھی۔

اب سلیم خاں کی سمجھ میں کچھ کچھ آگیا کہ یہ زہر عشق پر غصہ اتارا جا رہا ہے۔ وہ مسکرایا۔

اچھا بھئی چلی...... ہاں کہاں ہیں تمہارے بھائی صاحب، کلکتیا جوگی! بڑے بدھو دکھتے ہیں۔" سلیم خاں کے کان جل اٹھے۔ ادھر قمرن نکلی اور ادھر دوسری طرف سے وہ لپکا اور گلی میں کدو کی بیلوں تلے جالیا۔ اور وہ کچھ کہتی اس سے پہلے اس کی کلائی دبوچ لی۔

"پھر کبھی بدھو کہا تو منہ نوچ لوں گا۔ ہاں میں کوئی کھپریل کا نتھو خیرا سید نہیں ہوں۔"

"ہاں کیوں نہیں، پٹھان ٹولے کے سورما ہو۔ اندھیری گلی میں یوں کسی لڑکی کو دھمکانے کی ہمت......" سلیم خاں نے ہاتھ چھوڑ دیا اور چلا آیا۔

زندگی میں پہلی بار اس کو اپنی شکست کا احساس ہوا۔ "اس چھوکری نے کتنا ذلیل کیا۔ اچھا" رات بھر اسے نیند نہ آئی۔

لیکن اس کے بعد قمرن اپنی حویلی کی بڑی سی ناک اور کھپریل کے کتنے رنگین مزاج قدرداں سید زادوں کی حسرتوں کا خیال کئے بغیر اکثر موقع نکال کر پٹھان ٹولے کا چکر لگانے لگی۔ بہانہ اچھا تھا۔ "سلمٰی اور سکینہ قرآن حفظ کرانے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔" سلیم خاں جو کلائی گلی میں چھوڑ کر واپس آگیا تھا وہ خود بخود اس کی گرفت میں آگئی اور ہر وقت اس کے دل میں چوڑیوں کی جھنکار گونجنے لگی۔ "میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔ کھپریل والے مجھے کچا چبا جائیں گے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" مذاق خاصا گھاؤ بن گیا تھا۔ "میں مڈل پاس پھٹیچر پٹھان...... وہ کھاتے پیتے گھرانے کی اتنی خوبصورت لڑکی، ٹاٹ اور ریشم کا کیا میل؟ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ اور اسے؟"

رات کے وقت جب قمرن آئی تو سلیم خاں نے چپکے سے اس کو اندھیری کوٹھری میں کھینچ لیا۔ "آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"پھر کسی سید زادے کو چھوڑ کر...... میں ایک پٹھان ہوں اور تم کھپریل کی......"

وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ تھوک اس کے گلے میں پھنس رہا تھا۔

"میں کھپریل کی ہوں تو کیا...... تم کھپریل سے ڈرتے ہو؟"

"نہیں"

"تو پھر ٹھیک ہے" وہ تیزی سے کوٹھری سے نکلی اور اندر آئینے کے پاس چلی گئی اس کے چلے جانے کے بعد دیر تک اسے خیال آتا رہا کہ آخر قمرن اسے سمجھتی کیا ہے۔

"میں کھپریل سے کیا ڈر سکتا ہوں۔"

اس نے بہت غور کیا بہت سوچا، لیکن آگے اسے کوئی راہ سجھائی نہ دی۔ دور سے چوکیدار کی آواز آرہی تھی۔ اس نے لالٹین کی روشنی اور مدھم کردی اور کوٹھری سے باہر چلا آیا۔ کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا وہ کھپریل پہنچا اور پھر اس گلی میں جہاں سے قمرن کا اوپر والا کمرہ نظر آتا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور جھٹ اچھل کر کھنڈر کے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ دیکھتے دیکھتے وہ سید رجب علی کی چھت پر تھا۔ اس نے پلٹ کر اس درخت کو دیکھا جس کی مدد سے وہ اوپر پہنچا تھا اور جس کی شاخیں اب تک ہل رہی تھیں۔ اچانک دو بلیاں بڑی بیگم کے کمرے کے پاس لڑ پڑیں اور سلیم خاں کا دل اچھل گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قمرن کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کی چپلیں ایک دوسرے پر اوندھی پڑی تھیں، اور قمرن کا سر تکیے کے اوپر نہیں بلکہ تکیے کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس نے تکیہ اٹھایا تو قمرن اچھل کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ سے مثنوی زہر عشق کی جلد گر پڑی۔

اس نے سلیم خان کو پہچان لیا، لیکن اس کے ہوش اب بھی اڑے ہوئے تھے۔

"میں یہ بتانے آیا ہوں کہ میں تمہارے کھپریل سے ذرا نہیں ڈرتا اور وقت پڑا تو میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔"

قمرن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اتنے میں بڑی بیگم کے کمرے کے پاس بلیوں کے غرانے کی آواز تھم گئی اور کسی کے تیز تیز چلنے کی آواز آئی۔

سلیم خاں جلدی سے کمرے سے نکلا اور درخت کی شاخ کو پکڑ کر نیچے کود گیا۔

قمرن کچھ دیر چھت کی کڑیوں کو گھورتی رہی اور پھر سو گئی۔ مثنوی زہر عشق زمین پر پڑی تھی اور اس کے ہونٹوں پر ابھرتی ہوئی مسکراہٹ اور پیشانی پر پسینے کے قطرے اس کی نیند کا بھید کھول رہے تھے۔

ایک دن سید رجب علی کی بیگم نے سلیم خاں کو اندر حویلی میں بلوایا۔ اس کی سمجھ

میں کچھ نہ آیا۔ آخر کیا بات ہے لیکن بات کچھ نہ تھی۔ اسے ایک بہت ضروری خط لے کر شہر کے جلیل القدر ڈپٹی صاحب کے پاس جانا تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ بڑی بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر چلا آیا۔

"دھونس نہیں چلے گی۔ میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔"

اس کی باغیانہ بے پروائی نے کھپریل کی نظر میں اس کو خاصا خطرناک بنا دیا تھا۔

"یہ لونڈا پٹھان ٹولے والوں کا مزاج بگاڑ دے گا۔ ذرا دیکھنا برابری کی بات کرتا ہے۔"

اس نے موذن صاحب سے جب یہ بات سنی تو کہہ دیا، "وہ زمانہ لد گیا جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے۔"

سید رجب علی کے حکیم نما بیٹے نے کہا "زمانہ کبھی نہیں لدتا بھئی۔"

"آپ کو کیا معلوم، آپ تو زمانے پر خود لدے ہوئے ہیں!"

اس ایک بات سے پورے گاؤں میں آگ سی لگ گئی۔ اس کا بڑا چرچا ہوا۔

"بھئی اس چھوکرے کو مٹھی میں کرو ورنہ کیا سے کیا ہو جائے گا۔ ہم تو کھپریل کے احسان تلے دبے ہوئے ہیں اور یہ چھوکرا خواہ مخواہ جھگڑا کھڑا کر رہا ہے۔ سیدوں کا سایہ بڑی نعمت ہے۔" مولوی صاحب نے فتویٰ دیا۔

پٹھان ٹولے کے بڑے بوڑھوں نے بھی سِلیم خاں کی طرف سے اپنے دامن کھینچ لیے۔ لیکن وہ اور بھی بے پرواہ اپنی جگہ پر اڑا رہا، اور اس کے فلمی گانوں سے کھپریل کے بزرگوں کے سینے پر سانپ لوٹتے رہے۔

چند دن بعد رات کے وقت سلیم خاں کی کوٹھری کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور قمرن نے آکر اسے سوتے سے جگایا۔ وہ ایک کالی چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔

"غضب کر رہے ہو سلیم خاں!" اس کے ہونٹ تھر تھراتے۔ "تم جھگڑا کیوں کھڑا کر رہے ہو؟"

"کیسا جھگڑا؟"

"ابا تم سے بہت ناراض ہو گئے ہیں۔"

"ہوا کریں۔ پرواہ کس کو ہے۔"

قمرن خاموش کھڑی اسے ملتجی نظروں سے دیکھتی رہی۔

"قمرن تم چاہتی ہو کہ تمہاری شادی کا پیغام لے کر میں ڈپٹی صاحبوں کے یہاں دوڑا کروں؟"

قمرن بڑے عزائم کے ساتھ آئی تھی۔ لیکن سلیم خاں طوفان کی طرح بپھر رہا تھا۔ اس کی زد پر کوئی کمزور چراغ کیا جل سکتا تھا۔

اس کے جانے کے بعد سلیم خاں دیر تک چوکیدار کی پکار سنتا رہا "جاگ کے سو......... ہو ہو ہو!" اٹھ کر اس نے زور سے دروازہ بند کیا۔

"سوؤ یا جاگو، دروازے کھلتے اور بند ہوتے رہیں گے؟"

جیسے جیسے سید رجب علی اور کھپریل کے دوسرے لوگوں سے سلیم خاں کا تناؤ بڑھتا گیا، قمرن کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں مضبوط ہوتا گیا۔ کبھی کبھی سلیم خاں اس کو محض وہم سمجھتا۔ اور ایک دن تو اس نے قمرن کا ہاتھ دبا کر پوچھ ہی لیا تھا۔ "آخر تم اتنے اچھے گھر کی ہو کر، اتنے پڑھے لکھے لوگوں کے ہوتے ہوئے مجھے کیوں چاہتی ہو؟"

"اچھا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے گن گاؤں؟" وہ کھسیانہ سا ہو کر ہنسنے لگا تھا۔

"دیکھو سلیم یہ سب بڑے گندے ہیں۔ یہ لوگ ماماؤں وغیرہ سے تھک جاتے ہیں تو پھر دلہن لا کر گھر میں ڈال لیتے ہیں۔ اور میں گڑیا بننا نہیں چاہتی ہوں۔"

یہ باتیں اس کی سمجھ میں بالکل نہ آتیں لیکن وہ قائل ضرور ہو جاتا۔

سلیم خاں یہ سب باتیں سوچتا تو غرور سے اس کا سینہ دھڑکنے لگتا۔

اور پھر وہ چاندنی رات یاد آئی جب قمرن اس کے لیے کباب لائی تھی......

یہ ساری تصویریں اس کے سامنے سے گزر رہی تھیں اس کی مٹھی میں موذن کے چھوکرے کا دیا ہوا پرزہ اب تک مڑا تڑا پڑا تھا۔ چاندنی کچھ میلی اور دھندلی ہو گئی تھی۔ ہوا البتہ کلف لگے دوپٹے کی طرح تازہ دم پنیریوں اور درختوں میں سرسرا رہی تھی۔ اور

ایک سوندھی اور میٹھی خوشبو کھیتوں سے ابھر کر اسے متوالا بنائے دے رہی تھی۔

جب وہ اپنی کوٹھری میں واپس آیا تو اس کے دل کی دھڑکن کم ہو گئی تھی۔ جذبات کا طوفان گزر چکا تھا۔ قمرن نے اب تک اس کو دل سے نہیں نکالا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات تھی؟

عرس کی رات کے آنے تک وہ کئی بار مایوس ہوا اور کئی بار امیدوں نے اس کے وجود میں پر لگا دیئے۔

سلیم خاں نے کھپریل کی لڑکیوں کی بڑی بڑی رنگین داستانیں سنی تھیں۔ ”گھی اور دودھ پر پلنے والی لڑکیوں کا خون گرم ہوتا ہے۔ وہ تو اپنی پیاس بجھانے کے لیے کوئی نہ کوئی جام اٹھا لیتی ہیں، پھر ایک وقت آتا ہے جب وہ جام سفال پھینک کر سلور کا جام اٹھا لیتی ہیں اور ایک بڑا سا گھونگھٹ نکال کر آرزوؤں اور مرادوں کی اجنبی دنیا میں بھاگتی چلی جاتی ہیں۔ پلٹ کر دیکھتی بھی نہیں، اور سامنے چلے جاؤ تو پہچانتی بھی نہیں۔ ان میں تو زہر عشق کی ہیروئن کی غیرت بھی نہیں کہ کچھ کھا کر سو رہیں...... کمزور اکہرے دھاگے اور وہ بھی ریشمیں بھلا ان سے کوئی کمندیں بنائے گا اور ستاروں تک...... لاحول ولا...... وہ عاجز آ کر اٹھ بیٹھتا اور مچھروں کو مارنے کے بہانے اپنی اچھی خاصی مرمت کر دیتا۔ ”یہ زندگی بھی خوب ہے...... کھپریل...... یہ سفید پوشی آب رواں کی نرمی اور مسکراہٹوں کی جنت، سب ہی کچھ ہے لیکن یہ لڑکیاں...... گھٹن اور دھواں...... قمرن اس گھٹن اور دھوئیں سے نکل بھی سکتی ہے...... یا نہیں۔

یہ تھا وہ شبہہ جو بار بار تلوار کی طرح اٹھتا اور اس کے دل کے ٹکڑے کر دیتا!

اب کے عرس کی تیاریاں بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھیں۔ ہر سال کی طرح اب کے بھی دھان کی بوائی کا کام عرس سے پہلے پہلے نپٹا لیا گیا تھا۔ آسمان پر پھٹے پھٹے بادل تیر رہے تھے۔ پورا گاؤں لوبان اور عطر کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ مٹھائیوں کی دو تین قدیم دوکانیں کھل گئی تھیں اور نذر نیاز کا سلسلہ زوروں پر چل رہا تھا۔ رنگا رنگ اوڑھنیوں کی قوس قزح ہر طرف تنتی بکھرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس شام سلیم خاں کو اپنی پیاری

ماں کی بات یاد آئی جو بستر مرگ پر بھی لوگوں سے یہ کہتی ہوئی پائی گئیں...... "ہمارا سلیم ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک بار اوڑھنی کی ہوا لگی تو سارا ٹیڑھ پن ہوا ہو جائے گا۔"

بڑے پیر کے مزار پر ہجوم تھا۔ کچھ عورتیں منت مان رہی تھیں اور کچھ مرادوں کے بر آنے پر مزار پر سجدے میں گری ہوئی ناک رگڑ رہی تھیں، قوالوں کی بھاری پاٹ دار تانیں اور گنکریاں پوری فضا کو تھر تھرا رہی تھیں...... "حاجت روا محمد، مشکل کشا محمد!" کھپریل کے کچھ دلی نما بزرگوں کو حال آگیا تھا۔ وہ محفل کے بیچ سرخ چادر پر پھڑک رہے تھے، بچوں کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، اور لوگوں کی آنکھوں میں ہیجان بھر گیا تھا...... اب ایسے میں کس کو ہوش تھا کہ قمرن لڑکیوں کے جھرمٹ سے ٹوٹ کر کھنڈر کے پچھواڑے پہنچ چکی تھی۔

"بھاگ چلو!" قمرن نے آہستہ سے کہا "اس وقت زیور روپیہ پیسہ سب ہے میرے پاس! بھاگ چلو۔"

دھندلی دھندلی چاندنی میں سلیم خاں نے اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی تیکھی ناک اور بڑی بڑی آنکھوں کا صرف مبہم سا اندازہ ہوا۔ ایسے میں وہ کیا پڑھ سکتا تھا ان آنکھوں میں۔

"لیکن کھپریل والے...... تم کیا کہہ رہی ہو؟"

تھوڑی دیر سناٹا رہا۔ اچانک قمرن کا سایہ اٹھا اور...... ٹیلے سے دور ایک طرف دیکھنے لگا۔ وہ رو رہی تھی۔ سلیم خاں نے اس کو لپٹانا چاہا۔ لیکن قمرن نے اسے دھکیل دیا۔ "ڈرپوک پٹھان!" وہ اٹھی اور تیز تیز قدموں سے بڑے پیر کے مزار کی طرف چلی گئی۔

عرس کی رات گزر گئی۔ کئی دن تک سلیم خاں کا بدن ٹوٹتا رہا۔ اندر سے اس کا دل گھبراتا رہا۔ کچھ لوگوں کے کانوں کو اس کی بھنک لگ گئی تھی اور وہ پھر بار بار اس پر پھبتیاں کس رہے تھے...... "ایک تھا بندر اس کے جی میں آئی کہ کسی چاند کو چھولے۔ اس نے اٹھا لی ایک سیڑھی اور چلا......"

"اور وہ بندر تمہاری طرح بھینگا تھا۔" وہ آخر جل کر کہتا۔

جب چند دن بیت گئے اور قمرن کا دل موم نہ ہوا تو وہ پھر ایک رات درخت کی مدد سے اوپر چڑھ گیا۔ آہستہ آہستہ چل کر جب قمرن کے کمرے میں پہنچا تو وہ اوندھے منہ لیٹی رو رہی تھی اور اس کا بدن کانپ رہا تھا۔

قمرن میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جلدی سے اس نے اپنے آنسو اوڑھنی سے خشک کئے، اور ڈٹ کر اسے گھورنے لگی جیسے وہ کوئی مجرم ہو۔

"تم یہاں کیوں آئے؟"

وہ اسے دیر تک بتاتی رہی کہ بڑی بیگم اس پر کتنا ظلم کر رہی ہیں، اور کس طرح اسے کسی کے پلے باندھ کر سینے پر سے برف کی سل کھسکانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

وہ رات تک اپنے ناخن کترتا رہا لیکن سمجھ میں کوئی ترکیب نہ آئی۔ "کھپریل کی کسی بٹی نے وہ نہیں کیا تھا جو تم نے کر دکھایا۔ کائی پر چلنے والوں میں کون ہے جس کے پاؤں نہیں پھسلتے۔ لیکن پٹھان ٹولے کا ایک آوارہ چھوکرا اور تم...... بٹی تو اندھی ہو گئی ہے!"

سید رجب علی کو اس کی کیا خبر تھی کہ اندر حویلی میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔

باتوں باتوں میں فجر کی اذان کا وقت آ گیا......

وہ اٹھا اور قمرن کو گلے سے لگا کر واپس آ گیا۔ "اچھا میں سوچوں گا!"

"سوچنے کی ضرورت نہیں۔ بس اڑن کھٹولا لے آؤ...... پھر......" یہ آواز قمرن کے دماغ میں دیر تک گونجتی رہی۔

دوسرے دن سید رجب علی کی حویلی کے پاس والا درخت کٹ گیا اور اس کا جلاون بن گیا۔ شام تک سلیم خاں کو اپنی بہنوں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قمرن کا بستر، بڑا سا آئینہ، کتابیں، کروشیا کا سامان...... ساری چیزیں نیچے منگوالی گئی تھیں اور بڑی بیگم منہ پھلا پھلا کر کسی کے لیے بددعائیں نکال رہی تھیں۔ اللہ کی مار...... اللہ کی مارا۔"

کئی مہینے بیت گئے۔ فصلوں کے کٹنے کا زمانہ آ گیا۔ کھلیان لگ گئے۔ رات رات بھر اناج اتورے جانے لگے...... لوگوں کے چہروں پر رونق بڑھ گئی اور گیتوں کا جنون تیز

ہو گیا۔ لیکن سلیم خاں کے کھیت کے دھان کی سنہری بالیاں یونہی جھوم رہی تھیں۔ اس کے بازو شل تھے اور آنکھیں بے خوابی سے انگاروں کی طرح جل رہی تھیں۔ اس کی دونوں بہنیں بدحواس تھیں۔

"بھیا تم قمرن کو لے کر چلے جاؤ ورنہ وہ مر جائے گی!" سکینہ کہتی ہے۔

"میں تم دونوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

"لیکن ہم اکیلے رہ لیں گے ......"

"پاگل نہ بنو۔ سید رجب علی تمہاری بوٹی بوٹی نوچ لے گا۔ یہ ڈر نہ ہوتا تو ......" اس نے تیزی سے دونوں بہنوں کو گھور کر دیکھا، وہ سہم گئیں۔ "جاؤ!" اس نے لالٹین بجھا دی اور خود اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے اپنے اجلے اور خوبصورت خوابوں کو دہراتا رہا۔

☆☆☆

ایک دن جب اس کو قمرن کی شادی کی افواہ پر یقین آ گیا تو وہ دوڑتا ہوا اپنی بہن سکینہ کے پاس گیا۔

"بھیا، جانتے ہو قمرن کی شادی تو ایک بڈھے سے ہو رہی ہے!"

"بڈھے سے؟"

"میں اس کو لے کر بھاگنے کے لیے تیار ہوں۔"

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو وہ غریب سخت پہرے میں ہے۔"

اس نے ایک ...... ٹھنڈی سانس لی اور گھر سے باہر نکل گیا۔

برات آئی، ہاتھی، ڈھول، شہنائیاں اور آتش بازیاں ...... پورا گاؤں تالیوں پر اڑنے لگا۔ سلیم خاں اپنے گھر سے دور گاؤں کے باہر اپنے کھیت میں تھا۔ دھان کی سنہری بالیاں آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھیں اور وہ آسمان کے اندھیرے میں آتش بازیوں کے پھولوں کو بکھرتے اور پگھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ آتش بازیاں ختم ہو گئیں، حویلی میں گیتوں کی آواز تھک کر کہیں سو رہی۔ ہنڈے کی روشنی زرد پڑنے لگی اور گاؤں کا نشاط بھی بجھ سا گیا۔ لیکن وہ جاڑے کی رات میں وہیں کھیت میں بیٹھا رہا۔ اس

کے بال شبنم میں بھیگ گئے تھے۔ لیکن اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ بار بار اسے لگتا کہ ایک تیر اس کے سینے میں پیوست ہو رہا ہے۔ وہ اس سے جلتے ہوئے تیر کو نوچ کر ایک طرف پھینکنا چاہتا تھا، لیکن اس کی چبھن بڑھتی ہی جاتی تھی۔

ابھی سویرے کی دھند ہلکے ہلکے صاف ہونا شروع ہوئی تھی کہ بیگاروں کا کارواں اسٹیشن کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر خواب کے دیوزادوں کی طرح چلتا ہوا نظر آیا۔ سلیم خاں درخت کے تنے کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور وہ خود اپنے دل کی دھڑکن سن رہا تھا، جیسے دور سے ریل گاڑی کے آنے کی دھمک۔ پھر ایک سرخ شعلہ ابھرا اور یہ سرخ پھول کہاروں کے کندھوں پر پھڑ پھڑاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تتلی کی طرح چھوٹا ہو گیا اور تاڑ اور کھجور کے پیڑ اکیلے رہ گئے۔ ہر چیز بھائیں بھائیں کرنے لگی۔

اچانک سلیم خاں اچھلا اور گاؤں کی طرف لپکا جیسے اسے انگاروں پر دوڑنا پڑ رہا ہو۔ اس نے رسی کا ایک ٹکڑا لیا، اپنی درانتی اٹھائی اور تولیے کو کمر میں باندھتا ہوا اپنے کھیت کی طرف بھاگا۔ اس کے پاس کے سارے کھیت کٹ چکے تھے۔ صرف اس کے کھیت میں دھان لہرا رہے تھے۔ افق پر خون کے پہلے چھینٹے ہی ابھرے تھے کہ اس نے پکے ہوئے دھان کے ڈھیر لگا دیئے۔

اس کے بازوؤں، آنکھوں، اور نتھنوں سے آگ نکل رہی تھی۔

''نہیں بالکل گدھی تھی لڑکی۔'' قمرن کی آواز کہیں دور سے آرہی تھی ''میں ہوتی اس کی جگہ تو طبیعت ہری کر دیتی سب کی!''

اس کے ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگے اور سفید دانت گرد اور گرمی میں درانتی کے دانتوں کی طرح چمکنے لگے۔

وہ برق رفتاری سے سنہری بالیوں کی گردنیں اڑاتا رہا۔

دور گوالوں کی تان اب تک خاموشی اور تھکن کا دل چھید رہی تھی۔

کنکر چن چن محل...............''

OO

سنیچرا

۱۵

"باداں کاٹ کے.......... ہوں۔ ہوں۔ ہوں"

"بھر کدم...... ہاں بھر کدم"

"ہوں۔ ہوں۔ ہوں ہے چڑھیگا...... جراتھام کے"

کہاروں کی دوڑ میں نئی جان آگئی تھی۔ گیارہ کوس کا سفر ختم ہونے والا تھا۔ پوکھر کی چڑھائی کے بعد کئی چھوئی موئی کے کئی پودوں کے پاس گہرے سرخ رنگ کے اوہار سے ڈھکی ہوئی ڈولی تیزی سے گاؤں کی طرف بھاگی جارہی تھی۔ کہاروں کی کالی کالی پنڈلیاں مشین کے پرزوں کی طرح آگے پیچھے ہورہی تھیں۔ ان کے پسینے سے شرابور شانوں اور پیٹھ پر آہنی مچھلیاں چمک رہی تھیں مانو جلتی ہوئی کڑاہی میں سے بھاگنے کے لیے اچھل رہی ہوں۔

سنیچرا بوڑھے چھتنار برگد کے پاس پہنچ کر بے دم ہوگیا۔ وہ ڈولی سے بہت پہلے چلا تھا جب ستاروں کا اڑن کھٹولا چمک رہا تھا اور دور دور اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اور یہاں گاؤں کے پوکھر پر ڈولی نے آلیا تھا اسے اور اس کے دیکھتے دیکھتے وہ منڈیروں پر سے دوڑتی ہوئی گاؤں کی مسجد کے قریب کانٹوں کی جھاڑیوں سے آگے نکل گئی تھی۔

اس نے ایک بے بسی سے ڈولی کے سرخ چراغ کو جھاڑیوں میں پھڑ پھڑاتے ہوئے دیکھا اور اپنے بوجھ کو سر سے نیچے اتار دیا۔ ایک بڑا سا پٹارہ تھا۔ اس کے اندر سے کچھ شوربہ سا ٹپک کر اس کے سر کے گندے کپڑے میں جذب ہو رہا تھا وہ برگد کے

تنے کے پاس ایک موٹی سی جڑ پر بیٹھ گیا جو ایک ایسی لاش معلوم ہوتی تھی جس کا سر زمین میں دفن ہو۔ اس نے اپنے ماتھے سے پسینہ پوچھا اور اسی گندے کپڑے کو اپنی گردن پر سے پھیرتا ہوا کمر تک لے آیا۔

"دھت تیری سسری......"

کھیتوں میں ہل چل رہے تھے۔ سورج تھکا تھکا پہاڑیوں کے پیچھے تیزی سے چھپتا جارہا تھا۔

"دھت تیری سسری......" اس نے دوبارہ تھوکا۔ اس کے منہ کے جھاگ کے ساتھ اس کے دل سے ایک آنچ نکلی اور اس کا سارا بدن کانپ گیا، اُس بیل کے بدن کی طرح، جسے دوسرے ہی لمحہ ہلوائے کے ڈنڈے کا انتظار ہو۔

اس کے جبڑے جکڑتے ہوئے محسوس ہوئے......اور ہاتھ پاؤں کی نسیں کستی اور جھنجھناتی ہوئی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اسے بڑا غصہ آیا۔ پچھلے گاؤں میں اس نے پوری ایک لبنی تاڑی کی چڑھائی تھی۔ لیکن تاڑی کے کھٹے نشے کے بجائے ایک تھکن تھی جو ایک ریچھ کی طرح اس پر سوار ہوتی جارہی تھی اس نے دل ہی دل میں مالی کو گالی دی۔ کتنا برا زمانہ ہے۔ تاڑی بھی لوگ بن ملاوٹ کے نہیں بیچتے۔ اس کی نظر میں تو یہ ایک گناہ تھا جس کی سزا موت ہے۔

اس نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے لڑنے کے لیے کمر کس لی۔ کمر سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور کھینی کی پتیوں کو اپنی ہتھیلی پر ملنے لگا۔ اس نے تمباکو میں تیزی پیدا کرنے کے لیے کھینی اور چونے دونوں کی مقدار ضرورت سے زیادہ بڑھا دی۔ تین چار تالیاں بجا کر چونے اور کھینی کی گرد اڑائی......اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس نے پوری مقدار اپنے نچلے لب اور مسوڑھوں کے درمیان بھر لی۔

سب کچھ ہوا مگر تھکن کا ریچھ اس کے جسم پر سے نہیں اترا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن بوڑھے درخت کی جڑ نے سانپ کی طرح اس کے پاؤں جکڑ لیے۔ سورج چھپ چکا تھا۔ پہاڑی کے اوپر سرخی ایک بڑی سی چھتری کی

طرح کھل رہی تھی۔ بہت سے کمیرے اپنے بیل ہانکتے ہوئے منڈیروں پر سے گزر رہے تھے۔ کچھ پوکھر کے پانی میں ہاتھ منہ دھو رہے تھے۔

چوندھی برگد کے پاس سے گزری تو سنیچرا کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"اموکا کا ہو.......... کا کر رہے ہو۔"

کچھ نہیں چوندھی...... جرا...... "اس کا سر جھک گیا۔ اس کو اپنی آواز بہت دبی دبی اور ٹوٹے ہوئے ڈھول کی سی آواز معلوم ہوئی۔ غصہ سے اس کا منہ سرخ ہو گیا اور اس کی جھریاں اور بھی کالی ہو گئیں۔

ٹھیک اس وقت ہوا سنکنے لگی اور برگد کے اوپر ہریلوں کے جھنڈ پھڑ پھڑانے لگے۔ دور دور تک کھیتوں میں بوائی ہو چکی تھی۔ صرف آسامیوں اور رعیتوں کے کھیت جلدی جلدی جوتے اور بوئے جا رہے تھے

"تو اپنا راستہ لے چھوکری۔"

چوندھی اکڑ گئی...... اور اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے سنیچرا کو گھورنے لگی۔

"سور کی جنی.......... جب ہی تیرا نام چوندھی پڑ گیا۔"

...... کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اپنا ڈنڈا اٹھا کر چوندھی کو جس کی آنکھیں جنم سے چندھیائی ہوئی تھیں اور جو گاؤں بھر میں لوگوں کا منہ چڑاتی اور کدکڑے مارتی پھرتی تھی، مسہر ٹولی تک پہنچا دیتا۔ لیکن اس وقت تھکن نے اس کو بیکار کر دیا تھا۔ چوندھی کے مویشی نئے نویلے کھیتوں میں اتر گئے تھے۔

یہ دیکھتے ہی وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔ اس کے خشک اور جنگلی بال سرخ افق کے آئینے میں اڑتے نظر آتے رہے۔ جب وہ نظر سے اوجھل ہو گئی تو اس کو اپنی سستی کا خیال آیا۔ سارے کہار ڈولی کھول کر جا چکے ہوں گے...... اور وہ ابھی اسی بوڑھے برگد کے نیچے بیٹھا ستا رہا تھا۔

"میرے دادا ہو دادا.......... "اس کے پوتے کارا کی ہانک مسجد کی طرف سے آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے بجلی لگ گئی تھی۔ اس نے پٹارہ اٹھایا اور سر پر رکھ

لیا۔ چند ہی قدم چلا ہوگا کہ پٹارہ اس کے سر پر سے گر گیا۔ ڈھکن کھل گیا۔ اور اس کے اندر سے بہت سی چیزیں چھلانگ لگا کر مٹی پر بکھر گئیں۔ وہ بہت گھبرایا۔ اس نے سب چیزوں کو جلدی جلدی پھر سے سمیٹا اور اسی پٹارے میں بند کر دیا۔ چلتے چلتے اس نے روغن میں بھیگی ہوئی انگلیوں کو چاٹا، گھی، نمک، الائچی، دار چینی، سیاہ مرچ اور ایسے ہی مسالوں کی ملی جلی خوشبو نے اس کی زبان کے ایک ایک مسام میں سو سو پیٹ بنا دیئے۔

وہ ایک منڈیر پر بیٹھ گیا۔ پٹارہ کھول کر اس نے مرغ مسلم نکالا اور افق کی سرخی کی سیاہی میں بدلتے بدلتے اس کے ہاتھ میں بچی ہوئی ہڈیاں رہ گئیں۔ اس کی مونچھیں بھی تر ہو گئیں تھیں، دو تین پراٹھے بھی کھائے، قلچے اور حلوہ بھی۔ وہ تھوڑی دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس کو محسوس ہوا کہ اس کے پیٹ میں مرغا زندہ ہو گیا ہے اور بانگ دے رہا ہے مارے ڈر کے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ کسی نے مرغ کی بانگ سن لی تو؟ اس کے پوتے کی آواز پھر آنے لگی اس نے جلدی جلدی اپنی دھوتی سے منہ صاف کیا اور گاؤں کی طرف چل پڑا...... روشنیوں کے ٹمٹماتے ہوئے داغوں کی طرف۔

حویلی میں گیتوں کی آواز چڑیوں کی چہکار کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ اس نے پٹارہ اندر بھجوا دیا۔ ماما نے پٹارہ لے کر اپنی ناک کو خوشبو میں غرق کرتے ہوئے اور جھٹ پٹ پھرگاتے ہوئے کہا۔

"سنیچرا کہاں مر گیا تھا...... کیوں؟ سمدھیانے سے تر مال لے کر آیا ہے نا؟"

سنیچرا نے زندگی میں پہلی بار اپنا مشینی جواب نہیں دیا: "بھگوان جانے!"

...... وہ ماما کی پھڑکتی ہوئی ناک کو دیکھتا رہ گیا پٹارہ اندر چلا گیا مگر مرغ مسلم کی خوشبو اس کی ناک سے پیٹ تک لذتوں کے جال بنتی رہی...... ان لذتوں کے پنجے بلیوں کے پنجوں کی طرح نرم تھے...... جو گھی اور مسالے میں ڈوبے ہوئے تھے جو دبے پاؤں ناک اور زبان پر سے ہوتے ہوئے پیٹ میں اتر رہے تھے۔

آون گون کا یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہتا اگر اچانک ڈیوڑھی میں کہاروں کی ہنکاروں کی گونج ایک بار پھر دھاوانہ بول دیتی جو آخری کراہ کی طرح ابھری اور دفن ہو گئی۔

ابھی ڈپٹی صاحب ڈولی سے اپنے سیاہ جوتے والے پاؤں باہر نکال ہی رہے تھے کہ منجھلے سرکار، ململ کے سفید براق کرتے میں اندر سے لپکتے ہوئے آئے اور ڈولی کی طرف بڑھے۔ گلابی کمر بند میں ان کی ٹانگیں اُلجھیں اور انہوں نے ڈپٹی صاحب سے ہاتھ ملانے کے لیے جو ہاتھ بڑھایا تھا ان کے جوتے پر جا ٹکا۔ ڈپٹی صاحب کے نقلی دانت چمک اٹھے۔ جناب کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا"۔ ڈپٹی صاحب نے حسب معمولی موقع کا فائدہ اٹھایا اور اس اتفاقیہ قدم بوسی کو کیا سے کیا بنا دیا۔ منجھلے سرکار شرمندہ سے ہو گئے۔

"جی شکریہ شکریہ۔ خدا بڑا کارساز ہے۔" انہوں نے اپنی توند پر اس طرح ہاتھ پھیرا جیسے وہی سب سے بڑی کارساز ہو۔

ڈپٹی صاحب اور منجھلے سرکار کے دالان میں قدم رکھتے رکھتے حویلی کا جھالر والا پردہ اٹھا اور ماما ایک سینی پر شربت کا جگ اور چاندی کی طرح جھلکتے ہوئے گلاس لے کر آئی۔ کہاروں نے اپنی ناک سے غلاظتیں ایک جھٹکے سے باہر نکال دیں تاکہ خوان نعمت سے جھپٹ جھپٹ کر حملہ کرنے والی خوشبوؤں کو لائن کلیر ملے۔

سینچرا پھلواری کے پاس اینٹوں کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کہار جا چکے تھے۔ کلوندے کے پیڑ اور بیل کے پیڑ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے ڈپٹی صاحب اور منجھلے سرکار لالٹین کی روشنی میں جس پر لال سبز کاغذ منڈھ دیئے گئے تھے، ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہے تھے۔

حویلی سے آواز آئی "سکینہ بیٹا ذرا دیکھنا سمدھیانے کی سوغات کا حصہ پاس پڑوس سب کو ملنا چاہئے۔ اس پر سب کا حق ہوتا ہے۔"

"اچھا اماں جی! چھوٹی بٹیا کی آواز بڑی نرم تھی مگر سینچرا کو یہ آواز بڑی کرخت معلوم ہوئی۔ اس کے پیٹ میں مرغا پھر جاگ اٹھا اور ذبح کئے ہوئے مرغے کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔

اسی وقت منجھلے سرکار نے آواز دی "سینچرا۔" ان کی آواز میں ایک خوفزدہ کپکپی تھی۔

"جی سرکار" اس کی جھریاں بھی پھڑکنے لگیں۔

"ڈپٹی صاحب رات کے رات واپس جائیں گے۔ سواری کا انتظام کردو۔"

سینچر اگلیوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ کہیں ڈانٹ بتائی، کہیں لالچ دلایا، کہیں پیٹھ تھپتھپائی تو کہیں چمکارا آخر چھ کہار اکھٹے کر لایا۔ اس وقت برسات کا چاند بادلوں سے بھاگ رہا تھا اور بادل تھے کہ گرجتے امڈتے چاند کو اپنے جبڑوں میں اتارنے کے لیے دیوانہ وار لپک رہے تھے۔

ڈولی اٹھی اور گاؤں کے سناٹے میں کہاروں کے "ہوں ہوں" کے تیر سنناتے ہوئے دور دور نکل گئے اور ایک بار پھر سناٹا ہو گیا۔ سینچر اا اپنا ڈنڈا اٹھا کر چلا ہی تھا کہ ایک بار پھر ایک زور کی گرج ابھری۔

"سینچرا۔" وہ مارے ڈر کے اچھل گیا۔

"سالے آج تو نے تر نوالہ اڑا لیا۔" منجھلے سرکار مسکرا رہے تھے۔ سینچرا کی سانس اندر کی اندر اور باہر کی باہر رہ گئی۔

"آج وہ ہو جائے گا جو کبھی نہیں ہوا تھا۔ آج منجھلے سرکار مجھے روئی کی طرح دھنوا کر رکھ دیں گے...... باپ رے باپ!"

"دیکھ رات کے رات اپنے کیروں اور آسامیوں کا پورا گوہار جتادے...... تڑکے ہمارے آدمی پوربی پوکھر والے کھیت کی جتائی کریں گے۔" "سمجھا؟"

"جی سرکار!"

ترمال کا معاملہ ٹلتے دیکھ کر اس کی رگوں میں خشک ہوتا ہوا خون پھر موجیں مارنے لگا اور ہڈیاں دہک اٹھیں۔

منجھلے سرکار کے ایک جملے نے اس کے دماغ میں لہو کے ہزاروں چراغ جلا دیے۔ سویرا آئے گا تو اپنے ساتھ خون، چیخ، زخم، آنسو، گرد...... اور پتہ نہیں کیا کیا لائے گا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کا دل جلتے ہوئے گھونسلے میں بیٹھی ہوئی چڑیا کی طرح پھڑپھڑ لیا اور خاموش ہو گیا۔

منجھلے سرکار اپنے گلابی کمر بند کو آہستہ آہستہ ٹٹولتے ہوئے پھلواری سے آگے ستاروں کو گھور رہے تھے اور کچھ سوچ رہے تھے۔ گاؤں کے دوسرے سرے پر چوکیدار کی پکار۔ "جاگ کے سو ہو ہو" ابھرتی تو وہ چونک جاتے انہوں نے اپنے تکیے کے نیچے سے کنجیوں کا ایک بڑا سا گچھا اٹھایا اور سنیچرا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

اوپر کی منزل پر جانے کے لیے جو زینہ تھا یا جو کبھی رہا ہو گا اب اس کی حیثیت کھنڈر کی تھی۔ سیڑھی پر چڑھ کر دونوں اوپر گئے۔ سنیچرا کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ کانوں میں لپٹے ہوئے مکڑی کے جالے چھڑا رہا تھا۔

"سالے دیکھ گواہی کے وقت اس کوٹھری کا نام بھی نہ لینا......" کوٹھری کھلی تو اس کے اندر سے گرم ہوا کا جھونکا سا لپکتا ہوا محسوس ہوا۔ لالٹین کی روشنی بہت مدھم ہو گئی اس اندھیرے میں۔

"حرامی بتی تیز کر۔" اس کی آواز اتنی گھٹی ہوئی تھی جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔

بتی کے تیز ہوتے ہی کوٹھری میں کہیں کہیں ابرق کے آئینے چمک اٹھے۔ زنگ کے باوجود کونے میں پڑے ہوئے ہتھیاروں کے پھلوں میں جگہ جگہ چمک باقی تھی۔ چھوٹے چھوٹے دھندلے ستارے جھلملا کر رہ گئے۔

"چل اٹھ نیچے لے چل۔"

گھر کے اور نوکر چاکر بھی بلا لئے گئے اور گنڈاسے، بھالے، تلواریں اور لوہے اور پیتل کے مٹھوں سے جکڑی ہوئی لاٹھیاں نیچے اتاری گئیں اور ان کو صاف کیا گیا۔

بوندا باندی ہوتی رہی۔ کبھی بڑھ جاتی اور کبھی رات کی نم ہوا سیٹی بجانے لگتی۔ چاند تھکا ہوا بادلوں کے چنگل سے نکل کر، مسجد کے دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھوں میں قید ہو چکا تھا جیسے کسی نے ایک حسینہ کا کٹا ہوا سر نیزے پر اٹھا لیا ہو۔

گاؤں کی گلیوں میں خلاف معمول کتے بھونک رہے تھے۔

سنیچرا نے منجھلے سرکار کے تمام کمیروں کو اکٹھا کر لیا تھا اور انہیں بتا دیا تھا کہ سورج نکلنے سے پہلے پہلے کیا ہونے والا ہے۔

چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے انسانی ڈھانچوں کی سیاہ آنکھوں میں روشنی مر گئی...... اچانک رات کی خاموش آندھی نے کتنے دیپ بجھا دیئے تھے۔

مہر ٹولی کے پاس چھوٹی چھوٹی پھوس کے چھپروں سے کبھی کبھی ایک آدھ بوندیں ٹپک جاتی تھیں۔ منجھلے سرکار کے آدمی وہیں بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ انہوں نے ڈنڈوں کو کس کو پکڑ رکھا تھا جیسے یہی ان کی زندگی کا سہارا ہیں۔

بادلوں سے چھنتی ہوئی چاندنی نے فضا کو بہت ہی پراسرار و دھندلا بنادیا تھا۔ کھجور کے درخت یکایک لمبے ہو گئے تھے اور پہریداروں کی طرح پورے گاؤں کا جائزہ لے رہے تھے۔ دو دو تین تین کی ٹولیاں بن گئیں تھیں۔ وہ چلم کے کش لگا رہے تھے۔ ان کے ناریل الگ الگ تھے، لیکن چلم ایک ہی تھی جو مشاعرے کی شمع کی طرح گردش کر رہی تھی۔ یہ کوئی سرکاری دستار تو نہیں تھی جو کسی دوسرے کے سر پر فٹ ہی نہ آئے۔

جب اندھیرے کے چھلکے اترنے لگے تو خاموشی کے تالاب پر پہلا ڈھیلا برسا۔ یہ سنیچرا کی کھانسی تھی۔ اس کے بعد کئی اور دوسروں نے بھی اپنی اپنی کھانسی کے نمونے پیش کئے بغلیں بجائیں اور رانیں تھپتھپائیں۔

ایک کڑیل جوان نے اپنی رانوں کو آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے سنیچرا کے کہنی ماری اور پوچھا: "کیا پھوجداری جرور ہو گی سنیچرا کاکا؟"

سنیچرا نے اس کے جواب میں چلم بغیر ناریل کے ہی اپنے منہ میں لگالیا۔ اس کے ہونٹ سے چلم اس طرح چپکی جیسے گملے سے پھول کا پودا۔ سب کی نظریں سنیچرا کی طرف اٹھ گئیں۔ لیکن وہ مراقبے میں کھوئے فقیر کی طرح ان تمام متجسس نگاہوں کی چبھن سے بے نیاز رہا۔

ایک اور سوال ابھرا، تھرتھراتا ہوا۔ "کیا سورج نکلتے نکلتے صلح صپھائی نئ ہوتے؟"

"پانی سر سے اونچا جارہاہے بیٹے۔" سنیچرا بولا۔

"دیکھا نہیں آج ڈپٹی آیا تھا...... وہ سب طے تمام کر گیا ہے۔" سنیچرا نے زیر لب کہا: "منجھلے سرکار کی انگلیاں گھی میں اور ہمارا سر کڑاہی میں!"

سنیچرا نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے پیچھے ذرا ہٹ کر مہر ٹولی کے بچوں کی فوج جمع تھی۔ صاف دیکھنا تو مشکل تھا مگر حلیے سے وہ سمجھ گیا کہ اس کا پوتا بھی ایک ڈنڈا اٹھائے آگے آگے کھڑا ہے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا "سور کے جنے...... تیرے باپ کا کیا ہے یہاں۔ بھاگ اپنے اپنے ماں میں۔"

ان میں سے کچھ پیچھے ضرور ہٹے لیکن زیادہ تر اسی طرح پر اجمائے ڈٹے رہے۔ ان کے کانوں میں آنے والی صبح کی بھنک پڑ گئی تھی اور وہ اپنے ڈنڈوں کے جوہر دکھانے کے لیے میدان میں اتر آئے تھے اور سب کے جذبات کچھ یوں تھے...... "بڑا مزا آئے گا۔"

سنیچرا تن کر ایک لمحے کو کھڑا ہو گیا اور گاؤں کی جھونپڑیوں کو دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا اس وقت اس کی موٹی تھکن سی بہو اس کے آٹھویں پوتے کو جنم دینے کے لیے تڑپ رہی ہے۔

وہاں سے مڑ کر چلتے ہوئے وہ اتنے زور سے بولا کہ پوکھر کا پانی بھی بول اٹھا۔

"تڑکے سب جم جائیو اپنے اپنے مورچے پر۔ کارا کے گھر میں سب ہتھیار رکھے ہیں۔ اپنے آپ کام کے تیج دھار والے اٹھا لیہو...... پوربی پوکھر والے کھیت......" اس کی آواز پھنس گئی وہ بھی شاید اسی کھیت کی طرح پیاسا تھا۔

بڑے برگد کے پیڑ کے پاس کھڑے ہو کر اس نے دھندلی فضا میں لپٹے ہوئے کھیتوں پر اپنی نگاہیں دوڑائیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ دور پوربی پوکھر والے کھیت بھی خاموش تھے۔ اس نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھ کر وقت کا اندازہ کیا۔ روشنی کی گرد اڑ رہی تھی اور ستارے اونگھ رہے تھے۔

ہوا کے ایک جھونکے نے جھک کر اس کے کان میں کہا "سویرا ہونے دو۔ یہ سناٹا ایک چیخ بن جائے گا۔"

وہ اپنی زندگی میں کئی بار ایسی صبحوں کی چیخ سن چکا تھا۔ اس سے پہلے بھی اس نے منجھلے سرکار کی بند کوٹھریوں سے زنگ آلود ہتھیار نکالے تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی،

پھر بھی اسے یہ تجربہ ہمیشہ اجنبی معلوم ہوتا تھا۔ اب پھر ایک اجنبی ہاتھ اس دھند میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ ہاتھ ایک دوسرے گاؤں کے زمیندار دارو گا سنگھ کا تھا، بھورے بھورے بالوں اور نیلی نیلی نسوں کے جال میں چھپا ہوا...... آنکھیں عقابی اور مونچھیں گنڈاسے کے پھل۔ ابھی چند ہی دن قبل وہ اپنا گھوڑا روک کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا تھا ''سنیچرا تو اپنے پوتے کا بیاہ کیوں نہیں کر دیتا۔''

سنیچرا نے کھٹاک سے جواب دیا: ''پیسہ کہاں ہے سرکار۔''

''ابے میں جو ہوں...... میں بیاہ دوں گا اسے!''

سنیچرا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن اس وقت دارو گا سنگھ کی آواز پھر اس کی طرف جھپٹ رہی تھی، اس نے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑ رکھی تھی...... اور اس کے بھورے روئیں دار ہاتھ کی نسیں جونکوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

''ابے میں جو ہوں...... میں بیاہ دوں گا اسے''

سنیچرا مسہر ذات کا تھا۔ مسہر ذات کے لوگ خانہ بدوش ہی تو ہوتے ہیں۔ جس نے خرید لیا عمر بھر کو اس کے غلام ہو گئے۔ خون پسینہ ایک کرتے رہے اس کے لیے اور مر گئے تو کسی نے آنسو بھی نہ بہائے۔ اب اس مسہر کے بچے کی جس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی ہاں اس کی یہ مجال کہ......

پچاس سال پہلے وہ بھی تو اپنے پوتے کارا ہی کی طرح تھا۔ بھینسیں اور گائیں چراگاہوں کی طرف لے جاتا۔ جنگلی جامن بن پھٹکے توڑ کر...... کھاتا اور دن دن بھر پوکھر میں مچھلی کی طرح تیرا کرتا۔ بھینس کی پیٹھ پر اچھل کر بیٹھ جاتا اور ایسی ایسی تانیں اڑاتا کہ گاؤں کے در و دیوار کا دل دہل جاتا...... اور بڑے بڑے درختوں کے پتے تالیاں بجا کر اس کا دل بڑھاتے۔

وہ شام اسے اچھی طرح یاد تھی جب اس کا باپ غصے میں اسے رپٹاتا ہوا گنے کے کھیت تک لے گیا تھا۔ شام ہو رہی تھی اور سیار ہوا، ہوا کی لے الاپ رہے تھے۔ وہ ڈر گیا تھا اور اپنے بدن کے چیتھڑوں کو چباتا ہوا ٹھنڈی ہواؤں میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے

باپ نے عقاب کی طرح اسے آلیا تھا۔

"حرامی کے بچے .... چلتا ہے یا...... لگاؤں داواں باواں۔ سرکار ڈیوڑھی میں بلاتے ہیں اور تو چملاتا پھر رہا ہے۔"

ڈیوڑھی میں اس نے ہاتھ جوڑ کر دیو ہیکل سرکار کو سلام کیا۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کو تولا جیسے وہ بکری ہو اور خریدنے سے پہلے اس کے گوشت کا اندازہ کیا جا رہا ہو۔

اگلے جیٹھ میں اسے بیاہ دیا گیا۔ ایک کالی کلوٹی، ناک بہتی ہوئی، لکڑی کی طرح سوکھی ہوئی لڑکی پیلی ساری پہن کر آئی اور اس وقت تک اس جھونپڑی سے نہ نکلی جب تک کہ وہ بچہ جننے کے بعد کراہ کراہ کر مر نہ گئی۔ اس وقت سنیچرا جوان تھا۔ یہی اٹھارہ انیس برس کا تگڑا مسہر۔ ڈولی کندھے پر اٹھا کر ہوا سے باتیں کرتا تھا۔ اس کا جوڑی دار اس کا بڑا یار تھا۔ پر یگوا اور وہ سرکاری پالکی اٹھا کر کہاں کہاں نکل جاتے۔ دم نہ مارتے۔ خوب تاڑی پیتے اور اپنے گاؤں کی دنیا پر خوب خوب تبصرے کرتے کسی کا مذاق اڑاتے اور کسی غم کو اپنے دل کی رانی بنا لیتے۔

جب اس کا جوڑی دار ایک سانپ کے کاٹنے کی وجہ سے مر گیا تو اس نے کہاری کا کام بالکل چھوڑ دیا۔ اس کی عورت مر چکی تھی اس کا بیٹا سکرا لنگڑا تھا۔ اسے سرکاری بھینسے نے اپنے سینگ پر اٹھا کر پٹک دیا تھا۔ وہ کہاری کے کام کا نہیں رہا تھا۔ اس لیے غم اٹھاتا اور باپ بیٹے دونوں ہی صرف بیگاری کیا کرتے۔

بوڑھے سرکار مر چکے تھے اور اب منجھلے سرکار کا دور دورہ تھا منجھلے سرکار کو رنڈیاں بلا کر نچانے اور رات رات بھر گاؤں کی روشنی اور آواز کے پروں پر اڑائے اڑائے لیے پھرنے کا بڑا شوق تھا۔ ساتھ ہی ان کو زمین خریدنے کا بھی بڑا چاؤ تھا۔ وہ جائیداد جو ان کو اپنے باپ سے ملی تھی اس کی سرحدیں پھیل رہی تھیں۔ وہ ضرورت مندوں کو دل کھول کر قرض دیتے۔ لیکن ان کا دیا ہوا قرض سانپ کے منہ میں چھچھوندر کی طرح پھنس جاتا، نہ اگلا جاتا نہ نگلے بن پڑتا وہ بڑے صبر سے یہ تماشہ دیکھتے آخر ایک دن اس

نیک آدمی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا۔ اور وہ ایک ماہر فن کی طرح کچھ ایسی ترکیب کرتا کہ آنا فاناً قرض لینے والے کا کھیت نیلام ہو جاتا اور اس طرح دوسروں کے چیتھڑے اس کی اچکن میں گویا تکموں کی طرح ٹکتے چلے جاتے۔ ہلدی لگتی نہ پھٹکری رنگ چوکھا آتا۔

اس رنگ میں اس کا کتنا خون، کتنا پسینہ ملا ہوا تھا، اس کو بالکل اندازہ نہ تھا۔ وہ تو صرف اتنا جانتا تھا کہ دنیا بہت پرانی ہے، اور جب سے دنیا بنی ہے اس کا گاؤں قائم ہے اور اس گاؤں میں ہمیشہ سے ایک دو خاندان حکمران رہے ہیں۔ باقی لوگ کیڑے مکوڑے ہیں۔ ان کی حیثیت خچروں اور گھوڑوں کی ہے۔ ان کی لگام زمیندار کے ہاتھ میں ہے۔ وہ لگام کو جس طرف جھٹکا دیتا ہے...... گھوڑے اور خچر لڑ جاتے ہیں۔ یہی گھوڑے اور خچر کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں، گیلی مٹی کے سینے میں فصلیں بوتے ہیں۔ جب کھیتوں پر جوانی آتی ہے اور بہار کی سنہری لہریں درانتی کی دھار کو چومتی ہوئی ڈھیر ہو جاتی ہیں تو مٹی کی بنی ہوئی درخت جیسی اونچی، گول گول کوٹھیاں انہیں ہضم کر لیتی ہیں...... اور خچروں اور گھوڑوں کو منڈوا اور چنے کا چارہ دے دیا جاتا ہے۔

اس کے ان ہی عقیدوں نے اسے سب سے زیادہ تگڑا اور تندہی سے کام کرنے والا خچر بنا دیا تھا۔ جو خچر سب سے زیادہ کام کرتا تھا اور زمیندار کی چھتر چھایا میں دوسرے خچروں کو اپنے نقش قدم پر چلانے کی صلاحیت رکھتا تھا اسے گڑیت کا رتبہ عطا کر دیا جاتا تھا۔

سنیچرا کو ابھی اپنی بے زبان خدمات کے انعام میں گڑیت کا رتبہ ملا ہوا تھا۔ جس کا مطلب تھا سب سے زیادہ گالی اور سب سے زیادہ خطرہ۔

وہ منجھلے سرکار کے ایک ایک اشارے پر دوڑتا تھا۔ برسات کی کالی ڈستی ہوئی رات ہو یا جیٹھ کی چلچلاتی ہوئی دوپہر...... وہ ہوا سے باتیں کرتا ہوا کوسوں دور تھانے کی طرف بھاگتا، تھانیدار کی گالیاں اور دھتکار سنتا، لیکن کبھی دل میلا نہ کرتا۔ وہ مرغیوں، انڈوں، رسادل، حلووں وغیرہ کے تحفے لے کر شہر بھی جاتا۔ اس دن وہ دارو بھی پیتا۔ دارو اس کی من بھاتی چیز نہ تھی۔ وہ تو تاڑی پر جان دیتا تھا۔ اس کو کبھی لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا گیا۔ حالانکہ اس کی مسہر ٹولی میں بات بات پر جھگڑا ہوتا تھا۔ جو جھگڑا بچوں

اور عورتوں سے شروع ہوتا تھا وہ بھی بڑھ کر مردوں تک پہنچ جاتا تھا۔ کئی مرتبہ اجتماعی کشتی ہو جاتی تھی۔ ڈنڈے نکل آتے تھے اور کچھ لوگوں کے سر پھٹ جاتے تھے اور تھوڑا بہت خون بہہ جاتا تھا۔

وہ ایسے موقعوں پر خاموش رہتا تھا یا بیچ بچاؤ کر کے دو چار بھاری بھاری گالیاں بک کر معاملہ دبا دیتا تھا۔ اور کبھی وہ اپنا ڈنڈا اٹھا کر گاؤں کے باہر بانس کے جنگل کی طرف چل دیتا تھا...... وہ صرف اتنا کہتا۔

"بدن میں کھون سر سرائے تو سر ون اور لڑیں کا۔"

صرف ایسے وقت میں اس کے اندر ایک زبردست بیزاری پیدا ہو جاتی اور وہ گھبرا اٹھتا تھا۔ بانس کے جنگل کے پاس بیٹھ کر وہ دیر تک پوکھر کے، ریڑھ کی ہڈی کی طرح اٹھے ہوئے، کناروں پر رات کے سناٹے میں آکاش کو چھوتے ہوئے تاروں کو گھورتا رہتا۔ اگر اتفاق سے وہ چاندرات ہوتی تو وہ ایک نادان بچے کی طرح چاند کو دیکھتا رہتا۔ اس کے دماغ میں کوئی حسین خیال انگڑائی نہ لیتا۔ اسے تو چاند اور چکور کی کہانی بھی معلوم نہیں تھی۔ وہ اس وقت اسی طرح بے نام سی سنسناہٹ محسوس کرتا جیسی نئے نئے جتے ہوئے کھیت کی مٹی کی خوشبو سونگھ کر محسوس کرتا تھا۔ فرق بس اتنا تھا کہ اس وقت اس کے نتھنے پھولنے لگتے تھے اور چاند کو دیکھتے وقت اس کا دل بھر آتا اور ایسا لگتا تھا کہ اس کے اندر کوئی گھاؤ دہک رہا ہے اور پھٹ پڑنے کو بے قرار ہے۔

اسے کتنی بار فوجداری میں زخمی کیا گیا تھا۔ کتنی بار اسے سانپ نے ڈسا تھا۔ کتنی بار اس کو قیمتی سرکاری مال لے جاتے ہوئے ڈاکوؤں نے گھیرا تھا۔ کتنی بار دو ذاتوں کی لڑائی میں اس کا سر پھٹا تھا۔ کتنی بار منجھلے سرکار نے اپنی بیوی کا غصہ اس پر اتارا تھا۔ لیکن وہ ان سب باتوں سے بے نیاز زندگی کا سارا بوجھ اٹھائے ہوئے گاؤں کی پگڈنڈیوں پر چلتا رہا تھا، کھیتوں میں دوڑتا رہا تھا۔ اور سرکاری خاندان کے ایک ایک فرد کے لیے خوشیاں بٹورتا رہا تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا، ایک بہو سات پوتے پوتیاں۔ وہ گھر میں بہت کم آتا تھا۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوتا ہو کہ ڈیوڑھی پر اس کی ضرورت نہ ہو یا اسے سرکاری کام

پر کہیں باہر نہ بھیجا گیا ہو...... اور کچھ نہیں تو سرکاری بچوں کو محرم یا میلے ٹھیلے کا تماشا دکھانے کے لیے لے جاتا۔ اس کی زندگی میں دو بار زلزلہ آیا تھا اور اس نے اپنے سے چھوٹوں کو سمجھا دیا تھا کہ دھرتی گائے کے سینگ پر ٹکی ہوئی ہے۔ جب گائے تھک جاتی ہے تو اپنا سینگ بدلتی ہے اور دھرتی ڈول جاتی ہے۔

جوانی میں اسے سب سے زیادہ اس وقت لطف آتا تھا جب چوہوں کا تہوار منایا جاتا یا کوئی سور بھون کر کھایا جاتا۔ ایسا موقع پوری مسہر ٹولی کے جشن کا موقع ہوتا۔ ایسا فصل کٹنے کے بعد جاڑے میں ہوتا تھا...... رات بھر بڑے جھنا کے کے ساتھ ڈھول بجتے، لونڈے لال پیلے لہنگے پہنتے اور ناچتے اور مرد تاڑی کے نشے میں دھت ناچتے اور کودتے اور جلتے ہوئے الاؤ میں زندہ سور کو بھونتے...... سور چیختا، اتنا چیختا کہ گاؤں بھر کی نیند اڑ جاتی۔ ایسی ہی ایک رات کو جب ڈپٹی صاحب منجھلے سرکار کے مہمان تھے، سنیچرا کو اس جشن سے بلایا گیا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ آیا لیکن منجھلے سرکار کے کہنے پر کہ ڈپٹی صاحب کی نیند شور وغل سے خراب ہو رہی ہے اس نے کچھ الٹا سلٹا جواب دے دیا تھا۔ اس رات منجھلے سرکار اسے پکڑ کر اپنے ہاتھ سے جوتے برساتے رہے، یہاں تک کہ جوتا ٹوٹ گیا۔ اس کا نشہ اڑ گیا۔ وہ پھر مسہر ٹولی کے جشن میں واپس نہیں گیا۔ اس دن کے بعد پھر کبھی بھی وہ ایسے جشن میں شریک نہیں ہوا۔ لیکن جب کبھی ایسی رات آتی وہ بانس کے جنگل کے پاس کسی کیاری پر بیٹھ کر اندھیری رات کا دل ٹٹولتا یا چاند کو گھورتا رہتا۔

جب بوڑھا ہوا تو اس کو ہمیشہ یہی خیال رہنے لگا کہ وہ ایک پکا ہوا آم ہے۔ جانے کب ٹپک پڑے۔ ہر سال گرمیوں کے زمانے میں زمیندار گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بیاہ کر ان کو جنم جنم کے لیے اپنا غلام بنا لیتے...... اس وقت اس کا دل بہت کڑھتا۔ اس کی سمجھ میں اور کچھ نہ آتا۔ بس جی چاہتا کہ ایسا نہ ہو۔ دھیرے دھیرے وہ ہوا کو بدلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ خود اس ہوا سے بے نیاز ایک تناور درخت کی طرح کھڑا تھا۔ لیکن چاہتا تھا دوسرے ویسے نہ ہوں جیسا وہ ہے۔ لیکن وہ کیسے ہوں۔

یہ اسے معلوم نہ تھا۔ وہ اتنا جانتا تھا کہ ہر پیپل کے پیڑ میں بھگوان ہے اور گاؤں گاؤں میں جہاں بڑے بڑے مندر بنوانے والے لوگ ہیں بھگوان بس دو اینٹوں کے اندر رہتا ہے۔ اور بھگوان کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنا اس کا فرض ہے ورنہ مرنے کے بعد چتا کی لکڑی پوری طرح آگ نہیں پکڑے گی۔

وہ صدیوں کے اوہام میں شہد میں پھنسی ہوئی مکھی کی طرح جکڑا ہوا تھا۔ لیکن اوہام کے درمیان اس کا دل اپنے گاؤں، گاؤں کے بچوں درختوں اور کھیتوں کی محبت سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک غلام تھا جس کی اپنی کوئی زمین نہ تھی۔ اسی کی طرح اس کا بیٹا اور بہو تھے۔ وہ سب غلام تھے۔ وہ سب منجھلے سرکار کی ڈیوڑھی پر نیم برہنہ اور بھوکے پیٹ جاتے تھے اور زمین کو چھو کر سلام کرتے تھے۔ وہ سب ہل چلاتے تھے اور کھیت جوتتے تھے۔ فصلیں کاٹتے تھے اور منجھلے سرکار کے کھیتوں کا سینہ چوڑا اور چوڑا کرنے کے لیے اپنا سر کٹاتے تھے اور تاڑی پی کر جھوٹی گواہی دیتے تھے، اپنی عورتوں کو پیٹتے تھے جو سرکاری ڈیوڑھی کی دیواروں کو گری مٹی سے لیپتی تھیں، گوبر اٹھاتی تھیں، چکیوں میں گندم پیستی تھیں۔ اور اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر حویلی کے اندر بچوں کی ٹانگوں پر سرسوں کا تیل ملتی تھیں اور رات کے وقت جب سور بھونا جاتا تھا تو لہک لہک کر اور اپنے آنچلوں میں منہ چھپا کر ایک غمگین گیت گاتی تھیں۔

"بلما مورا کڑیل جوان!...... مہوے کے پیڑ سوں مہکے ہے...... ہم پر دارو کا نسہ چھا جاوے ہے۔ اس کا پسینہ چمکت ہے جیسے سرسوں کا تیل۔ بلما مورا کولھو میں جتا رہوے ہے اور ہم کولھو میں سرسوں سوں پست رہین ہیں...... یہ دنیا کتنی بے درد ہے۔ ہم روت رہیں اور ہمرے آنسو تیل کی مقدار بڑھات رہین۔"

گیت کے بول ابھی اس کے دل میں صبح کے الاؤ کی طرح گرم تھے کہ اسے دور چھٹتے ہوئے دھندلکے میں، دارو گا سنگھ کے آدمی کھیت میں جمع ہوتے ہوئے نظر آئے۔ وہ دوڑا جیسے بھیانک خواب دیکھ کر بھاگ رہا ہو۔

منجھلے سرکار بندوق لیے کھڑے تھے اور ان کے سامنے ٹھنڈے شربت کا نارنجی

گلاس رکھا تھا۔

انہوں نے سنیچرا کی خبر سن کر کہا کہ اب آدمیوں کو کہو کہ چل کر دھاوا بول دیں۔

''حرامزادوں کی بوٹی بوٹی کر کے رکھ دو۔''

انہوں نے اس کو بتایا کہ ہمیشہ کی طرح فوجداری کے ختم ہونے سے پہلے ہی اسے بھاگ کر جانا ہوگا اور تھانے میں رپورٹ لکھانی ہوگی۔ ''پولیس کے آدمی تیار ملیں گے ان کو لے کر سیدھے چلے آنا سالے سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اسے سب معلوم تھا۔

ابھی سورج نہیں نکلا تھا اور پوربی پوکھر والے کھیت میں دونوں طرف کے آدمی بپھرے ہوئے سانڈوں کی طرح ٹکرا رہے تھے۔ ڈنڈے بج رہے تھے، گالیاں اور للکاریں ابھر رہی تھیں۔ گرد اڑ رہی تھی۔ شیر دہاڑ رہے تھے۔

جب داروگا سنگھ کے آدمی پسپا ہو کر پیچھے ہٹنے لگے تو منجھلے سرکار کے کمیرے بیلوں کو ہانک کر کھیت میں اتر گئے اور ہل چلانا شروع کر دیا۔ تین سال کے پیاسے کھیت نے خون چاٹنے کے لیے اپنے ہونٹ کھول دیئے۔

سنیچرا تیزی سے پلٹا اور اپنے سر کو گمچھے سے لپیٹ کر تھانے میں خبر کرنے کے لیے بھاگا۔

برگد کے پیڑ کے پاس داروگا سنگھ کے آدمیوں نے اسے آلیا اور اس پر ڈنڈے برسنے لگے۔ جیسے دھوبی کے پاٹ پر کپڑے پٹکے جا رہے ہوں۔ وہ ڈھیتی ہوئی دیوار کی طرح سلسلا کر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ لڑھکا اور پانی سے بھرے کھیت میں سر کے بل دھنس گیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں ہوا میں معلق تھیں اور اس کا سر نرم مٹی میں پیوست تھا۔

وہیں پر مرغ مسلم کا خشک ڈھانچہ پڑا تھا جس کا مزا سنیچرا نے پہلی بار زندگی میں پچھلی رات چکھا تھا۔

پلک جھپکتے میں اس کا پوتا کارا جو وہاں سے کھیت میں فوجداری کا تماشہ دیکھ رہا

تھا۔ وہ کھیت میں جھک گیا۔ اس نے اپنے دادا کو ٹانگوں کی کالی کالی رسی کی طرح بل کھاتی ہوئی نسوں سے پہچان لیا۔

"دادا، امو دادا۔"

وہ جھکا سورج کی پہلی کرن دھان کے نرم پودوں پر سے ہوتی ہوئی گدلے پانی میں ملتے ہوئے خون میں جذب ہو گئی۔ کارا چیخ کر اٹھا اور گاؤں کی طرف بھاگا۔

"دادا ٹھیک کہتا تھا وہ تو پکا ہوا آم ہے۔ جانے کب ٹپک جائے۔"

بیوقوف۔ اسے اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کا دادا ٹپکا نہیں تھا قتل کیا گیا تھا......
اور اب اس کا بیاہ ہو جائے گا اور وہ بھی بڑا ہو کر جب سرکاری کولہو کا تگڑا بیل بنے گا تو ایک دن بے زبان جانور ہونے کے صلے میں گڑیت یعنی غلاموں کا سردار بنا دیا جائے گا۔ لیکن کون جانے وہ اتنا بے زبان جانور نہ بنے۔

پوربی پوکھر والے کھیت سے شور اٹھ رہا تھا اور گاؤں خاموش تھا۔ صرف منجھلے سرکار گھوڑے پر سوار بندوق سے مسلح پوکھر کی دیوار پر ایک اجیت سورما کی طرح کھڑے ہوئے تمتماتے ہوئے سورج کی چمک سے بچنے کے لیے اپنا ہاتھ کو پیشانی پر رکھ کر دور اس راستے کی طرف گھور رہے تھے جدھر سے تھانیدار اور پولیس کے آنے کا انتظار تھا۔

○○

لیکن

(۱۶)

ہو سکتا ہے ایسا ہوا ہو، لیکن......

لیکن ویکن کچھ نہیں۔ زیادتی تمہاری ہے۔ آخر کبھی دوسروں کی بھی تو سنو۔ ہو سکتا ہے تمہارے تجربے الگ الگ ہوں۔ الگ الگ سے کیا مراد ہے تمہاری؟ ایک ہی چیز کے بارے میں تجربے الگ الگ۔ اگر کسی پھول کا رنگ کاسنی ہے تو کاسنی ہے۔ شیڈ میں فرق ہو سکتا ہے۔ کاسنی، سفید یا ہرا تو نہیں ہو سکتا۔ دیکھو ان باتوں میں اس طرح کی لاجک کام نہیں کرتی۔ ویسے اگر کاسنی پھول کو تم الگ الگ جگہ سے دیکھو، یا روشنی الگ الگ ہو یا روشنی مدھم ہو، یا روشنی بالکل نہ ہو تو کاسنی کالا یا نیلا بھی لگ سکتا ہے۔ ہاں کیوں نہیں۔ کلر بلائنڈ ہو دیکھنے والا تو کیوں نہیں؟

اٹھیں یار چلیں۔ کٹھ حجتی بہت ہو لی۔ بائی بائی ٹاٹا۔

تو پھر جاؤ۔ جاتے کیوں نہیں؟

چلا جاؤں گا۔ چلا جاؤں گا۔ جانتا ہوں۔ میں کھونٹے سے بندھا ہوا نہیں ہوں۔ جب چاہوں اٹھ کر جا سکتا ہوں۔ تو پھر جاؤ۔ دفان ہو جاؤ۔ تم نہیں جاؤ گے۔ تم اپنی باتوں کو چباتے رہو گے۔ بھڑتے رہو گے۔ اور زہر اگلتے رہو گے۔ اور تمہاری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئے گی کہ جو زہر تم اگل رہے ہو وہ تمہارے اندر ہے اور تمہیں یہ جاننا چاہئے کہ جو زہر تم اگل رہے ہو، وہ تمہارے اندر کیوں ہے۔

اور پھر تمہارا اپنا زہر تو نہیں ہے۔ پھر دنیا پر کیوں برسو۔

بکواس۔ آخر میں کہاں ہوں۔ دنیاہی میں تو ہوں۔ جو چیز میرے اندر ہے وہ میں نے دنیاہی سے تو پائی ہے۔

چھوڑو ہم ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکیں گے۔ ویو لنکتھ ہی ایک نہیں ہے۔

خاموشی۔ ہوا کی سر سراہٹ۔ اکا دکا پتوں کے جھڑنے کی آواز۔ ننگے آسمان سے دھوپ کی بارش۔ چڑیوں کی بے صدا پرواز۔ گھاس کے ڈھکے ہوئے ٹیلے سے زرد زرد موجیں اٹھتی ہوئی۔ چیل آسمان میں تل کی طرح۔ شکار کہاں ہے؟ شکار کہاں ہے؟ یہ ہزار رنگوں میں کھویا ہوا کرہ بہت بڑا ہے، بہت رواں، اور پونچ بہت چھوٹی ہے، بہت کمزور ہے!

ایسے میں اس نے کوٹ کے اوپر والی جیب سے ایک سگار نکالا، ہونٹ ٹیڑھے کیے اور سگار جلایا، اور ایک بڑا سا کش اگل کر قہر بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اٹھا اور جینز کی گرد جھاڑے بنا لاابالی پن کے ساتھ میرے چاروں طرف چکر کھانے لگا۔ نہیں تم کہانی نہیں سنا سکتے۔ شاید سنا سکتے ہو۔ مگر کہانی کے تانے بانے نہیں بن سکتے۔ کیوں؟ یہ بھی بتانا پڑے گا؟ تمہارا مشاہدہ غلط ہے۔ میرا مطلب ہے الٹا ہے۔ جس طرح تم الٹے گلاس سے پانی نہیں پی سکتے۔ اسی طرح تم الٹے سانچے میں کہانی نہیں ڈھال سکتے۔ سمجھا نہیں میں۔ ابھی سمجھ جاؤ گے۔ سب سے بڑی الٹی بات یہ ہے کہ جو جینز پہنے گا وہ ایسا کوٹ نہیں پہنے گا جس کی اوپر والی جیب میں سگار ہو۔ یہ بڑا بورژوا تصور ہے، چکنا یا سپاٹ؟ یا سانچا کہہ لو، ایسے لاابالی کردار کا۔ مٹی ہی نہ ہو تو پیالہ کیسے بناؤ گے بھائی۔ بکواس! اگر میں نے ایسا آدمی دیکھا ہے جو جینز پر اسی قسم کا کوٹ پہنتا ہے۔ ہونٹ ٹیڑھے کرتا ہے، بلکہ آنکھیں بھی، اور سگار پیتا ہے تو؟

I find it very stupid

یہی بات تم اردو میں کہہ سکتے تھے مگر مرعوب کرنے کے لیے انگریزی میں کہہ رہے ہو۔ حالانکہ میں اردو سمجھتا ہوں۔

لیکن وہ آدمی جس کی کہانی میں سنا رہا ہوں وہ اسی طرح بولتا ہے۔ اور میں اپنی

زبان یا اپنا لہجہ اس پر تھوپنے کو تیار نہیں ہوں۔ تو بس ہو لی کہانی۔ ذرا لہجے میں ہلکا پن پیدا کرو۔ پھواروں کی طرح کہانی کو برسنے دو۔ وہ پھر میرے گرد ٹہل رہا ہے۔ اور اب اس نے اتنی دیر میں، جتنی دیر میں تم سے کٹھ حجتی کر رہا تھا، سگار کے ساتھ ساتھ سگریٹ بھی نکال لی ہے۔ دوسری جیب سے۔ اب وہ ایک ہاتھ سے سگار پیتا ہے اور دانتوں میں سگار کو دبالیتا ہے۔ مگر دوسرے ہاتھ سے وہ سگریٹ کے بہت ہی نازک قسم کے کش اڑا رہا ہے۔

Now there is no unity of impression in your story!

پھر وہی ملاوٹ۔ کہانی کی زبان ایسی ہوتی ہے، جیسی زندگی میں، کہانی کے کرداروں کی ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم نے ان کرداروں کی دنیا کو حقِ خود اختیاری دے دیا ہے۔ اور اب ان کرداروں کے پرزے نکل آئے ہیں۔ اور میں ان کے پرُزے نہیں چھین سکتا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا وہ میرے گرد چکر لگا رہا تھا۔

"کیا تمہارے پاؤں ابھی تھکے نہیں ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا اور دبے پاؤں آگے نکل گیا۔ اس نے میری بات ہنس کر ٹال دی۔

وہ یکایک کھڑا ہو گیا ٹیلے پر، میرے سامنے۔ اس کی آنکھیں مچی ہوئی تھیں جن سے کثافت نچڑ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے جو نیلے پڑتے جا رہے تھے۔ کبھی اس کی مٹھیاں کھل جاتی تھیں۔ کبھی بند ہو جاتی تھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ اس بلندی سے میں اس کو کیڑا نظر آ رہا ہوں گا۔ کیڑا۔

جانتے ہو تم، زندگی بھر میں کیا کرتا رہا ہوں۔ خون کے گھونٹ پیتا رہا ہوں۔ جب انسان بے بس ہو جاتا ہے تو وہ خون کے گھونٹ پیتا ہے۔ اپنے آپ پر رحم کھانے کا اس سے بہتر طریقہ ایجاد نہیں ہوا، خون کے گھونٹ الفاظ ہی تو ہیں۔ پیو اپنے الفاظ۔ چاہو ان کو چائے کی پیالی میں گھول لو۔ چاہو اپنے خون میں۔ اور اپنا خون پیو۔ اچھا شغل ہے۔

مجھے تمہارے اس مشورے سے گھن آتی ہے۔ تم بہت بڑا ہو کس ہو۔

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ چقندر! آہستہ آہستہ اس کے چہرے کا رنگ نچڑ گیا۔ پہلے دھندلا ہوا، پھر بھورا ہوا، پھر پھیکا، پھر ویران، راکھ کی طرح، ہلکا سرمئی۔

میرے سینے پر خوف نے چنگل گاڑ دی۔ یہ بات سچی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ یہ بات سچی ہے۔

کون سی بات؟

میں بغلیں جھانکنے لگا۔

رکو میں بتاتا ہوں۔ بہت پرانی بات ہے۔ تب میں چھوٹا تھا۔ تب میں گاؤں کے باہر پل کے نیچے چپ چاپ ایک لوہار کو کام کرتے دیکھتا تھا۔ میرے ہی جتنا بڑا ایک اور لڑکا تھا۔ وہ لوہار کی دھونکنی چلاتا تھا۔ اس کے چہرے پر مکھیاں بھنبھنایا کرتی تھیں۔ پر وہ سوتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کی آنکھیں کھلتی تھیں تو ان میں کیچ چمکتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ کچھ سفید، کچھ پیلی۔ پھر دو تین بار آنکھیں جھپکا کر سوتا بن جاتا تھا۔ لیکن اس کا ہاتھ دھونکنی چلاتا رہتا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اسی طرح میری سمجھ میں اور بہت سی باتیں نہیں آتی تھیں۔ یہی دیکھو۔ دھونکنی چل رہی ہے اور لگتا ہے کوئی بہت بڑا ریچھ پھونک مار رہا ہے۔ انگارے چمک رہے ہیں۔ اور لوہار جس کے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ رہی ہیں، لوہے کی ایک ڈلی کو انگاروں میں چھپا دیتا ہے۔ پھر دور کھیتوں کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ جیسے اسے انگاروں اور ان کے نیچے دبے ہوئے لوہے سے کوئی مطلب نہ ہو۔ اس کے چہرے پر پسینہ دوڑ رہا ہے۔ تھوڑی داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔ لگتا ہے چہرے پر سفید سفید پروں والی چیونٹیاں دوڑ رہی ہیں۔ دھونکنی چل رہی ہے اور درختوں پر کوے کائیں کائیں کر رہے ہیں۔ مگر لوہار دور دیکھ رہا ہے۔ اس کو کوؤں کی فکر نہیں ہے۔ وہ مجھے کبھی نہیں دیکھتا۔ کھیتوں میں کھڑی فصل پیلی پڑ رہی ہے۔ اور گاؤں کی عورتیں تلیا پار کھجوروں کے پاس گھاس پر بھیگے کپڑے پھیلا رہی ہیں۔ لوہار ان کو بھی نہیں دیکھ رہا ہے۔ یکایک اس کا سویا ہوا کتا غراتا ہے اور اس کی آنکھیں انگاروں پر واپس آجاتی ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر پیلی پپڑیاں پھیل جاتی

ہیں۔ اور وہ بڑے سے چمٹے سے لوہے کی ڈلی کو باہر نکال لیتا ہے اور نہائی پر رکھتا ہے۔ لڑکا اٹھتا ہے اور چندھیائی آنکھوں سے ہتھوڑے کو دیکھتا ہے اور انگارے کی طرح دہکتے لوہے پر ہتھوڑا برسانے لگتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے چوٹوں سے لوہے کا حلیہ بدل جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں لوہا چپٹا ہو جاتا ہے۔ جب اس کا ایک سرا چاقو کی طرح باریک ہو جاتا ہے تو وہ اس کو مٹنے سے کنویں میں ڈال دیتا ہے۔ چھنچھناہٹ سی پھیل جاتی ہے ہوامیں۔ دھواں اٹھتا ہے پانی سے۔ پھر کوئی کندھے پر ہل لادے ہوئے آتا ہے اور لوہار سے لوہا خرید کر چلا جاتا ہے۔ لوہار اب دوسرا لوہا اٹھاتا ہے اور اس کو انگاروں میں دبا دیتا ہے۔ اس کی آنکھیں پھر کھیتوں سے آگے کسی چیز پر جم جاتی ہیں۔ شاید وہ لوہے کے تپنے کا انتظار کر رہا ہے۔

وہ سانس لینے کے لیے رکا۔

پھر؟ پھر کچھ نہیں! میں کچھ نہیں سمجھا! نہیں۔ میں جانتا تھا۔ تم کچھ نہیں سمجھو گے۔ جب میں چھوٹا تھا، وہ لمحہ گزر چکا ہے۔ وہ وقت کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ انگاروں میں دبا ہوا وہ وقت گزر چکا ہے۔ انگارے بجھ چکے ہیں۔ لیکن میں نہیں بجھا۔ میں سمجھا نہیں۔ میں جانتا تھا تم کچھ نہیں سمجھو گے۔ لیکن کسی کے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ وقت گزر جاتا ہے۔ دھونکنی تھم جاتی ہے۔ لوہار دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن کچھ تو ہے جو باقی رہ جاتا ہے۔ تمہارے خیال میں کیا باقی رہ گیا؟ کیوں، میں! ہاں، میں، میں، میں! آخر میں یہی باقی رہ جاتا ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہاں، یہ بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ یہ زندگی ہے اور زندگی کس کی سمجھ میں آتی ہے!

وہ ٹیلے سے اترتا ہے اور مجھ سے دور دور قبرستان کی طرف چلنے لگتا ہے، جہاں درختوں پر شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ پھر پھیلا رہا ہے، مرغابیاں تالاب میں تیر رہی ہیں۔ کیا ان کا رین بسیرا یہیں ہوگا۔ پانی پر؟ وہ میری بات کا جواب نہیں دیتا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر کچھ بڑبڑاتا ہے۔ زندگی میں تو یہ لوگ جیتے نہیں، نہ جانے کہاں جیتے ہیں۔ وہ مجھ سے بہت آگے نکل گیا ہے؟ اب میں اس کی گرد بھی نہیں پا سکتا۔ لیکن وہ لوہار والی

کہانی؟ کہانی تو وہ یہیں چھوڑ گیا۔ یہ کہانی ہے یا گیت۔ جانے کیا۔ کوئی اس کو گنگنا رہا ہے۔ کبھی دن، کبھی رات، کبھی لوہار سو جاتا ہے۔ کبھی جاگتا ہے۔ کبھی وہ کہانی سناتا ہے۔ لیکن جب تک لوہا انگاروں میں تپتا رہتا ہے، وہ دور دیکھتا رہتا ہے۔ کھیتوں میں کھڑی فصل کی موجوں سے آگے۔

اتنے میں اس کا ہیولا قبرستان کے درختوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔ لیکن وہ جو غائب نہیں ہوا وہ کیا کرے؟ بھاگ جائے۔ نہیں دفن ہو جائے۔ ○○

گٹر پائپ سے ذرا ہٹ کر

۱۷

میں یہاں پڑا پڑا صاف دیکھتا ہوں گٹر پائپ کے آخر میں بیڈ منٹن کورٹ کے اوپر ایک بنگلہ ہے جس کی بالکنی کے پیچھے جالی کا پردہ پڑا ہوا ہے، اور وہ کھانے کی میز کے سرے پر بیٹھا کارن فلیکس کھا رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چمچہ دودھ میں ڈبوتا ہے اور چمچے کی ہتھیلی میں بڑھیا چیز بھر کر منہ تک لے جاتا ہے۔ وہ نوالے کو گلے سے اتارنے سے پہلے اخبار کی سرخیوں پر ایک بار پھر نظر دوڑاتا ہے، اور دانت پیس کر کہتا ہے "باسٹرڈ!" ڈریسنگ گاؤن کی جیب سے رومال نکالتا ہے اور ناک صاف کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی لال ناک اور زیادہ لال ہو جاتی ہے۔ وہ پھر اخبار کی سرخیاں پڑھتا ہے، اور چمچے کو دودھ میں گھماتا ہے۔ اس کے جبڑے کی ہڈیاں اور ابھر آتی ہیں۔

گٹر پائپ کی گولائی نے اس مکان کو کاٹ کر گول بنا دیا ہے۔ جہاں برسوں پہلے میں بھی رہتا تھا۔ جہاں میں برسوں رہا تھا، اور جہاں میں نے ہر صبح صاحب کو اسی طرح ڈریسنگ گاؤن سے رومال نکال کر ناک پونچھتے اور کارن فلیکس کھاتے دیکھا تھا۔ اور اس وقت بھی، جب میں جالی کے پیچھے کچھ نہیں دیکھ رہا ہوں، مجھے اپنا صاحب نظر آ رہا ہے۔ گٹر پائپ کے پیٹ میں ٹھنڈی ہوا زناٹے سے آ رہی ہے اور میں ٹھٹھر رہا ہوں۔ دھوپ بہت آہستہ آہستہ، بڑی نرمی سے، ہوا کو چھو رہی ہے۔ اس طرح چھونے سے ہوا گرم ہونے سے رہی۔ وہاں جالی کے پیچھے ہیٹر جل رہا ہے جس کی وجہ سے گٹر پائپ کے اندر

سردی اور بڑھ گئی ہے۔ کانٹے چبھ رہے ہیں ایک ایک سانس میں۔

اب وہ توس پر مکھن لگا رہا ہے اور اپنے آپ سے کہہ رہا ہے۔ وہ بڈھا تھا تو توس کتنے کر کرے ہوتے تھے اور دونوں طرف سرخ سنکے ہوئے، جدھر چاہو مکھن لگالو۔ اور اب ٹوسٹر وہی ہے مگر توسوں میں وہ بات نہیں۔ میں جانتا ہوں وہ وہاں گٹر پائپ میں پڑا ہے۔ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا۔ جلی ہوئی رسی۔ مگر اینٹھن نہیں گئی ہے۔ اور دیکھ لیجئے، سال بھر ہو گیا ہے، یہ گٹر پائپ کھدے ہوئے نالے میں نہیں اتارے جا سکے۔ پھنس گئے ہوں گے کہیں کاغذات، اور ٹھیکیدار کسی اور ٹینڈر کے چکر میں پڑ گیا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کس طرح چلتا ہے یہ سارا کاروبار۔ Speculation! شروع سے آخر تک ہیرا پھیری۔ ہونہہ I have/a conscience,man, and it pays!!

لیکن اس بڈھے کے بارے میں کیا کہتے ہو بھائی جس کو تم نے نکال دیا۔ آخر وہ آدمی ہے۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟ اس طرح مجھ سے سوال کرنے کی تمہیں ہمت کیسے ہوئی! ہا!" آخر وہ آدمی ہے۔" اور میں کیا ہوں کتا جو چھوڑی ہوئی ہڈی کو بھی چاٹتا رہتا ہے۔ وہ بالکل سٹھیا چکا تھا۔ سو میں نے اس سے کہا، بھئی یہیں رہو جتنا کام ہو سکے کرو۔ اور مجھ سے جتنا ہو سکے گا تمہارے لیے کروں گا۔ بس آگ بگولہ ہو گیا۔ بولا "سمجھ گیا۔ اب میں آپ کے کام کا نہیں رہا؟ بوڑھا گھوڑا اصطبل میں نہیں رکھا جاتا!" جیسا تھا ویسا ہی اٹھ کر چلا گیا۔ میں تو زینے سے اترتے قدموں کی چاپ سنتا رہ گیا۔ اور صرف میرا منہ چڑانے کے لیے سامنے پڑے ہوئے گٹر پائپ میں رہنے لگا۔ پاس پڑوس میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا میں۔ اس کو میرے باپ نے، may he rest in peace in heaven کوڑے کے ڈھیر سے اٹھایا تھا۔ وہ چینٹیوں کو چینی چٹا رہے تھے کہ کہیں سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اور وہ اسے گھر اٹھا لائے۔ تب میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ جیوتشی نے بتایا تھا کہ میرے پیدا ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ لیکن ایسا ہوا کہ میں پیدا ہو گیا۔ بے چارا جیوتشی کیا کرتا۔ اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی ہے جس کے سر پر کپڑے کی کشتی اوندھی پڑی ہے اور وہ ایک

دروازے سے اندر آتا ہے اور دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے چار ٹانگوں والا ایک جھبرا جانور دوڑا کرتا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ دونوں چوکیدار تھے۔ ایک پان چباتا تھا، دوسرا بھونکتا تھا۔ جب میں بڑا ہوا تو بھونکنے والا مر گیا۔ کہتے ہیں کسی چور نے اس کو راستے کا کانٹا سمجھ کر راستے سے ہٹا دیا۔ لیکن دوسرا پان کھاتا رہا اور بوڑھا ہوتا رہا۔ اور اب ذرا سی بات پر اٹھا اور چل دیا۔ میں نے سوچا تھا جب پارہ اترے گا تو واپس آجائے گا۔ ایک دن میں اس کے پاس گیا بھی۔

You know, everybody knows, I do not belive in hiegh and low.

مگر وہ اڑ گیا۔ میں نے کہا اچھا تو اپنی آخری تنخواہ تو لے لے بھائی۔ بپھر گیا: "جائیے جائیے کسی کو دان دے دیجئے گا۔ آشیر واد دے گا۔ میں نے کہا یہ کیا بات ہوئی۔ کیا میں آشیر واد خریدتا پھرتا ہوں؟" "پھرتے ہوں گے، مجھے کیا معلوم۔" اور اچھل کر بیٹھ گیا ایک پائپ پر۔ thought it was the height of discourtsey! بد تمیز۔ بس بس، قصہ ختم۔

ہونہہ، میں لیتا بڈھے کے پیسے۔ سمجھتا ہوگا، میں سارا کا سارا پیسے سے خریدا جا سکتا ہوں۔ یہی اس کی بھول تھی۔ ہے کوئی بات مجھ میں جو خریدی نہیں جا سکتی۔ اور وہ سب کچھ جو خریدا جاتا ہے، میں نہیں ہوں۔

کون زیادہ اکیلا ہے۔ میں یا وہ......وہ جو جالی کے پردے کے پیچھے کارن فلیکس کھا رہا ہے؟ کوئی دم میں سورج نکلے تو میں یہاں سے نکلوں۔ جنے مجھے آج کام ملے گا یا نہیں۔ مل جائے تو مزا آجائے۔ وہ بھی بوڑھا ہے۔ میں بھی بوڑھا ہوں۔ مگر دیکھو کیا سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ جیسے کمر میں لوہے کی کمانی لگی ہو۔ ایک میں ہوں کے جھکا جا رہا ہوں۔ کمر جھک جائے تو پھر کام کون دے۔ اور کام نہ ہو تو جینے کا مزہ کیا۔ آج جنے کیوں منہ کا مزا پھیکا پھیکا ہو رہا ہے۔

اس دن آیا وہ میری اس گول گول دنیا میں تو کتنا سہما ہوا تھا۔ ڈر رہا ہوگا۔ کہیں کھا نہ جاؤں کچا۔ میں لیٹا ہوا تھا اور وہ مرے سر کے اوپر کھڑا تھا۔ اور مجھے جانچ رہا تھا۔ اس کی

سمجھ میں نہیں آرہا تھا میں جاگ رہا ہوں یا سو رہا ہوں۔ میں آنکھیں اس لیے بند کئے
ہوئے تھا کہ کون جانے وہ کوئی ایسی بات کہہ دے کہ میرا دل پسیج جائے اور میں پھر
چل پڑوں اس کی لوٹھی کی طرف۔ اور جو ایسا ہوتا تو میں اپنی نظر میں گر جاتا۔ لیکن اس
نے ایسی بات کہہ دی کہ میری آنکھیں کھل گئیں۔ وہ تنخواہ کی بات کرنے لگا۔ مری جو
آنکھیں کھلیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کی بھنویں جڑی ہوئی ہیں اور ہونٹ کپکپا رہے
ہیں۔ اور تب یکایک مجھے لگا کہ میں اس آدمی کو نہیں پہچانتا۔ پھر اس کا چہرہ صابن کے
بلبلے کی طرح اڑنے لگا اور درختوں میں کہیں تتلی کی طرح کھو گیا۔

میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں لوٹ آئے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں اس کے بنا جی نہیں
سکتا۔ سب ویسا ہی ہے۔ گاڑی پٹری پر چل رہی ہے۔ صبح ہوتی ہے تو میز لگی ہوتی ہے۔
چائے بھی ہوتی ہے، کافی بھی۔ میں کافی سے زیادہ وہ بھاپ انجوائے کرتا ہوں جو آہستہ
آہستہ باریک تاروں کی طرح پیالی سے اٹھتی ہے اور ہوا میں پگھل جاتی ہے۔ ہوا کا
سوندھا پن جس میں میرے شکار کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ بھرے گھر میں سرسراتا ہوا
سناٹا، اور کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ ایک منٹ کو رکے اور کار میں بیٹھنے سے پہلے مجھ
سے کہے: "ہلو! آپ کیسے ہیں؟ رات نیند تو اچھی طرح آئی نا؟" نہیں، کسی کے پاس
وقت نہیں۔ میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ میں صرف دور سے، پورٹیکو سے آتی
ہوئی آواز سنتا رہتا ہوں: بائی! سی یو۔ سب گئے۔ اب یہ لوگ چینی لنچ کھانے کے بعد ہی
لوٹیں گے۔ تھوڑی دیر سوئیں گے پھر اٹھیں گے اور شام کے پروگرام پر نکل جائیں
گے۔ پھر رات ہو جائے گی اور میں یہاں بالکنی پر رات کے قدموں کی آہٹ سنتا
رہوں گا اور تھوڑی تھوڑی دیر پر کاروں کے دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی گونج۔

"سی یو ایٹ دی کاک ٹیل!"

cock-tail, my foot!

There's niether the cock, nor its tail! ہا ہا ہا! ہا ہا ہا!

مجھے اس کی ضرورت ہے۔ ایک بوڑھے کو دوسرے بوڑھے کی ضرورت ہے۔

بوڑھا بڑا کائیاں ہے۔ چلو، لوٹ چلو۔ آخر وہ تمہارا گھر ہے۔ چاپلوس کہیں کا۔
صاحب میں نے آپ کا نمک کھایا ہے اور اب قسم کھاتا ہوں کہ لوٹ کر اس گھر میں نہیں جاؤں گا۔ کیوں، آخر وہ تمہارا گھر ہے، تم نے اپنا بچپن، جوانی، وہیں کاٹی ہے۔ صاحب کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ جو لوگ کوڑے کے ڈھیر پر اٹھا کر پھینک دیئے جاتے ہیں، ان کے ماں باپ نہیں ہوتے، ان کا کوئی گھر نہیں ہوتا، نہ بچپن، نہ جوانی۔ بس بڑھاپا ہوتا ہے۔ وہ آپ کے گھر میں چند دن کا مہمان ہے، اور اس گٹر پائپ میں بھی۔ پھر میں آپ کے بنگلے میں کیوں جاؤں۔ آخر آپ مجھے اٹھا کر اسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیں گے نا!

میں اب گٹر پائپ میں پڑا ہوا ہوں اور کوڑے کے ڈھیر کی خوشبو سونگھ رہا ہوں۔ سڑے ہوئے سنترے، گندے انڈے، میلے کپڑے، سلساتے ہوئے چھلکے، پھلوں کے اور ترکاریوں کے بھی۔ اور میں خوش ہوں۔ مجھے اپنا وہ بچپن یاد آ رہا ہے جو کوڑے کے ڈھیر کی خوشبو میں چھپا ہوا ہے۔ ○○

مونِس و دمساز

لِکھو !
اور
اپنے عِلم کو اپنے دوستوں کے درمیان پھیلاؤ
اور
جب وقتِ مرگ آئے تو اپنے
بچّوں کو
بطور میراث سپرد کرو
کیونکہ
جب فِتنہ و آشوب کا زمانہ آتا ھے
تو بجُز کتاب
کوئی اور مونِس و دمساز نہیں ھوتا.

امام جَعفَر صَادِقؓ

عِلم اور عمَل

یا د رکھو کہ

عِلم کے ساتھ عمَل ضروری ہے

نہ عمَل کے بغیر عِلم نافع ہے اور نہ عِلم کے بغیر عمَل نفع بخش ہے

جس عِلم کی پشت پر عمَل موجود نہ ہو

وہ عِلم جہل ہی کے زمرے میں شامل ہے

—— حضرت داتا گنج بخشؒ

کشُف المحَجوب سے

جو شخص
علم کی تلاش میں نکلے
وہ اس وقت تک
خدا کی راہ میں ہے
جب تک کہ
واپس نہ آجائے
OO

(ترمذی من انسؓ)

انور عظیم بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں صوبہ بہار کے ضلع نوادہ کے ایک دور دراز گاؤں پوکسی میں ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم۔اے کرنے کے بعد پانچویں دہائی کے آخری برسوں (۵۰-۱۹۴۸ء) کے پر آشوب دور میں کلکتہ کے روزنامے **استقلال** کی ادارت کی ذمہ داری سنبھال کر موصوف نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ لیکن جلد ہی مکتبہ جامعہ کی کشش انہیں دہلی لے آئی۔ ۶۰-۱۹۵۶ء کے دوران غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر ماسکو میں اے گریڈ مترجم کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد بمبئی سے جاری ہونے والے ہفتہ وار اردو **بلٹز** کے پہلے مدیر کے طور پر ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۷ء تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد ۱۹۹۰ء تک **سویت لینڈ** کے ایڈیٹر انچارج کے بطور صحافتی خدمت انجام دیتے رہے۔

انور عظیم کی پہلی کہانی **چکراتے ہوئے** ۱۹۴۶ء میں ماہنامہ **افکار** میں شائع ہوئی، اس کے بعد سے وہ لگ بھگ ڈھائی سو کہانیاں لکھ چکے ہیں۔ انور عظیم کے متعدد افسانے اردو افسانوں کے مختلف انتخابات میں شامل ہو چکے ہیں۔ تین ناولوں اور افسانوں کے چھ مجموعوں کے علاوہ، موصوف نے متعدد ڈرامے بھی لکھے ہیں، جنہیں ہندوستان کے مختلف ڈراما گروپس نے اسٹیج کیا ہے۔ دہلی ٹی وی کی پیش کردہ پہلی ٹیلی فلم **فخرو میاں** بھی انور عظیم کے قلم کی دین ہے۔ کئی غیر ملکی ڈراموں کے علاوہ **برتولت بریخت** کے سب سے اہم اینٹی فاشسٹ ڈرامے **آرتورو اُوئی** کو **زوال کا عروج** کے نام سے انہوں نے اردو کے قالب میں ڈھالا، جسے نیشنل اسکول آف ڈراما اور دوسرے ڈراما گروپس نے اسٹیج کیا۔

۱۹۶۹ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، جیسے اہم اعزاز سے ان کو نوازا گیا۔ ان کا ہشت پہلو قلم ادب اور صحافت کے میدانِ کارزار میں آج بھی رواں ہے۔ فکشن ان کا خاص میدان ہے اور جمالیات کا طلسم ان کی حسیت کی اساس!

——— انیس امروہوی

زیر اہتمام

تخلیق کار پبلشرز

104/B۔ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲